ورثہ

(نصیریات)

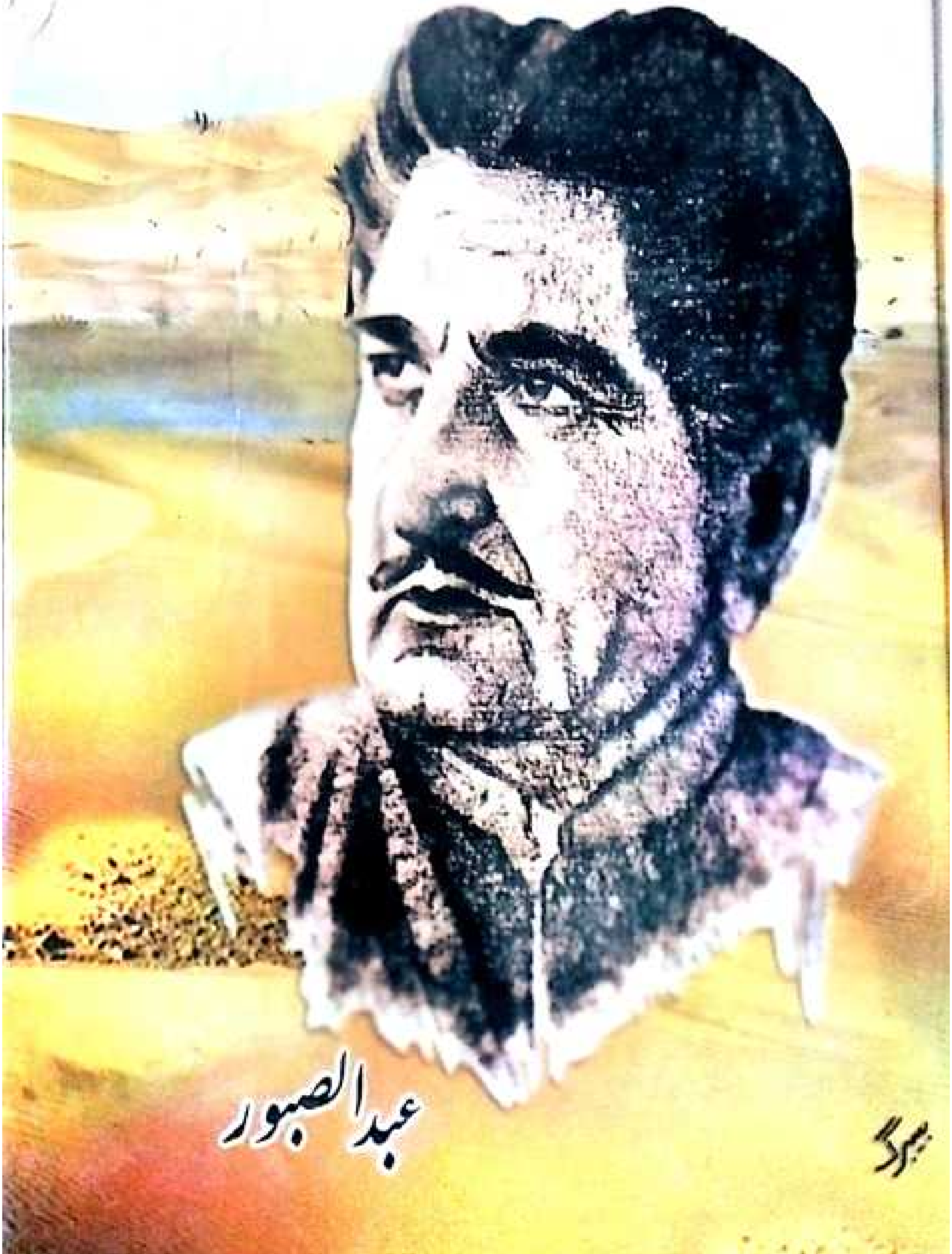

عبدالصبور

عبدالصبور بلوچ 15 دسمبر 1967 میں تربت (کیچ) کے موضع آبسر میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم کیچ میں حاصل کرنے کے بعد جامعہ بلوچستان سے بلوچی زبان و ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ بلوچستان کے شعبہ بلوچی سے پچھلے دس سال سے وابستہ ہیں اور بطور اسسٹنٹ پروفیسر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جزوقتی استاد کے طور پر بلوچستان اسٹڈی سنٹر سے بھی وابستہ ہیں۔

اپنی ایم فل کی ڈگری کی تکمیل کے بعد بلوچی فکشن پر اپنے پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کررہے ہیں۔ اپنی علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ وہ جامعہ بلوچستان کے سنڈیکیٹ کے رکن اور سینٹ کے ممبر بھی ہیں۔

عبدالصبور بلوچی اکیڈمی کے ایگزیکٹو باڈی کے رکن ہیں اور بلوچی اکیڈمی کی طرف سے تشکیل کردہ "قاعدہ کمیٹی" کے چیئرمین، بلوچی املا کیلئے بنائی گئی کمیٹی کے رکن اور بلوچی ڈکشنری کیلئے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر بھی ہیں۔

ورشان کی دوسری تصنیف ہے جو بلوچی اکیڈمی کی طرف سے زیورِ طبع سے آراستہ ہورہی ہے۔ اس سے پہلے انھوں نے بلوچوں کے توہمات اور عقائد پر مشتمل "شرک ءُ پال" کے عنوان سے ایک تحقیقی کتاب تحریر کی تھی۔ یونیسیف اور حکومت بلوچستان کی جانب سے "بلوچ عورت" کے نام پر اپنا ایک پروجیکٹ مکمل کرچکے ہیں۔ "مست توکلی کی صوفیانہ شاعری" پر بلوچستان اسٹڈی سنٹر کی جانب سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ ان کی آنے والی تصانیف میں:

1۔ نمل ذیہہ ءِ مہر

2۔ انگگاں ترندیں درد رگامانی

3۔ بلوچی لبزانک

شامل ہیں۔

ورثہ

(نصیریات)

عبدالصبور

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

© بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ

نام کتاب	:	ورنہ (نصیریات)
محقق	:	عبدالصبور
ناشر	:	بلوچی اکیڈمی
کمپیوٹر کمپوزر	:	الیاس بلوچ
ٹائیٹل	:	اکرم دوست
بیک گراونڈ ڈیزائن	:	ہیرگ بلوچ
چاپ جاہ	:	یونائیٹڈ پرنٹرز کوئٹہ
سال اشاعت	:	2005
تعداد	:	500
قیمت	:	270

انتساب

☆ ۔بلوچی کے لیے کارِ ینا جہانی کی

کاوشوں کے نام

☆ ۔میر گل خان نصیؔر کی ان توقعات کے نام

جو انھوں نے اپنے نواسے میر و خان سے

وابستہ کر رکھے تھے۔

ہم اس دُکھ کی اس درد کی قیمت نہیں مانگتے اور ہم کوئی بدلہ، صلہ یا شہرت نہیں مانگتے اور ہم نہ کلینڈر کی تصویر بننا چاہتے ہیں جو ہمارے بعد آئیں گے، ان کو یہ بتا دینا کہ ہم ایک زندگی، ایک خواب، ایک بُت گھڑتے رہے اور روشنی کو پانے کے لئے، اندھیروں میں لڑتے رہے۔

(نکولا واپتاروف۔ بلغاریہ)

فہرست

عنوان — **صفحہ نمبر**

☆۔پیش لفظ........................ 6
☆اظہارِ تشکر........................ 10
باب اول:۔حالاتِ زندگی........................ 13
باب دوئم:۔ادیب اور شاعر........................ 76
باب سوئم:۔ محقق........................ 248
باب چہارم:۔صحافی........................ 282
باب پنجم:۔مورخ........................ 311
باب ششم:۔سیاستدان........................ 342
☆: مختصر تعارف........................ 419
☆: کتابیات........................ 439

پیش لفظ

مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ ملک الشعراء میر گل خان نصیر ی ہمہ جہت شخصیت کا ایک کتاب میں احاطہ کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ان کی شخصیت کا ہر پہلو ایک علیحدہ تحقیق اور کتاب کا تقاضا کرتا ہے لیکن تب بھی میں نے ایک کوشش کی ہے، میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں اس کا فیصلہ پڑھنے والے ہی کریں گے۔اس کتاب میں جہاں کہیں کوئی کمی یا خامی محسوس ہو وہ میرے حصے میں ہی شمار کئے جائیں اور مجھے بہت خوشی ہوگی اگر کہیں سے میری رہنمائی فرمائی جائے۔

ایک اور بات کا میں اعتراف کروں کہ اس کتاب میں پڑھنے والوں کو میری اُردو میں گرائمر کے حساب سے کچھ یا بہت سی خامیاں یقیناً نظر آئیں گی، اس کا مجھے افسوس تو ہے مگر پچھتاوا نہیں کیونکہ اُردو میری مادری زبان نہیں ہے، میں اپنا یہ تحقیقی مقالہ بھی بلوچی ہی میں ضبطِ تحریر میں لاتا اگر اس وقت کچھ اکیڈمک مجبوریاں آڑے نہیں آتیں۔

میں نے جب میر گل خان نصیر کی شخصیت اور خصوصاً ان کی شخصیت کے ادبی پہلو کو دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی تو اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میری نظریں تحریری مواد کے ساتھ ساتھ کچھ شخصیات پر بھی مرکوز تھیں جو مجھے اس تحقیقی کام کے سلسلے میں کافی مدد دے سکتے تھے۔

میر عاقل خان مینگل (مرحوم) تو پہلے ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے مگر دوران تحقیق میر گل خان نصیر کی بڑی صاحبزادی اور نامور افسانہ نگار بانک گوھر ملک بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ یہ دونوں شخصیات میر گل خان نصیر کی فن اور شخصیت کے متعلق کافی معلومات رکھتی تھیں بحرحال اس کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کے لیے مختلف رسائل و جرائد میں چھپے ہوئے ان کے مضامین میرے اچھے خاصے کام آئے جس کا اندازہ حواشیوں اور حوالہ جات سے لگایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً وہ غیر مطبوعہ خطوط جو میر گل خان نصیر نے اپنی صاحبزادی گوھر ملک کو لکھے تھے ان سے بھی میں نے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

میر عبداللہ جان جمالدینی صاحب بھی میر گل خان نصیر کے متعلق ایک مستند حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں مگر ناسازی طبع کی بناء پر میں ان سے

پوری طرح مستفید نہیں ہو سکا لیکن ان کی شفقت ہر قدم پر میرے ساتھ رہی اور میرا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ ان کے وہ مضامین بھی میرے لئے بہت اہم ثابت ہوئے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔

اسی طرح میر گل خان نصیر کے خاندان میں جناب امیر الملک مینگل کا بھی ان کے ادبی وارثوں میں شمار ہوتا ہے مگر جس وقت میں اس تحقیقی کام میں مصروف تھا مینگل صاحب بہت زیادہ ''مصروف'' تھے کیونکہ وہ بلوچستان کے گورنر کے منصب پر فائز تھے ان کی ''بے پایاں سرکاری مصروفیات'' کی وجہ سے ان سے وقت لینا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا حالانکہ میں ان کی مدد سے کچھ نئی باتیں اپنی اس تحقیق میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ خصوصاً وہ باتیں جن کا اظہار انھوں نے غالباً چیف جسٹس کی حیثیت سے 1996 میں آرٹس کونسل میں میر گل خان نصیر کی یاد میں منعقدہ ایک تقریب میں کیئے تھے۔ گل خان نصیر جیسی نابغہ روزگار شخصیت پر ابھی بہت کام ہونا باقی ہے۔ آج اگر گل خان نصیر پر ایم۔ اے (بلوچی) کی سطح پر ایک پرچہ خصوصی مطالعے کے طور پر پڑھائی جاتی ہے تو آنے والے دنوں میں یقیناً اس میں وسعت

آ سکتی ہے۔ گل خان چیئر بن سکتا ہے یا پھر گل خان کارنر وجود میں آ سکتا ہے جیسا کہ دوسرے ممالک میں یا ہمارے ہی دوسرے صوبوں کے یونیورسٹیز میں اپنے اکابرین کی خدمات کے اعتراف میں کارنرز ار چیئرز بنائے گئے ہیں۔

ایک بات طے ہے کہ میرا یہ تحقیقی کام گل خان شناسی کی انتہا تو بے شک نہیں مگر ایک ابتداء ضرور ہے شاید اس موضوع کو آگے بڑھانے اور وسعت دینے میں میری یہ حقیری کوشش آنے والے محققین کے لیے کارآمد ثابت ہو سکے۔

عبدالصبور

۳۰۔اگست ۲۰۰۴۔شال

اظہارِ تشکر

میں اپنے ان تمام محسنوں اور احباب کا ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق میری رہنمائی فرمائی یا مجھے مفید مشوروں سے نوازا یا پھر انھوں نے میر گل خان نصیر پر اپنے نادر مواد مجھے عطا کیے جن کی وجہ سے میرا یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچ سکا۔

میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق صابر، ڈاکٹر فضل خالق، پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید شاہوانی، آغا نصیر خان احمد زئی، پروفیسر حامد حسن خان، پروفیسر ڈاکٹر یحییٰ نغمانہ ظاہر، جناب بی ایم کٹی، جناب لال بخش رند، یوسف عزیز مگسی، ایم جیلس، غوث بخش صابر، پروفیسر صبا دشتیاری، پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد، پروفیسر آغا محمد ناصر، پروفیسر زینت ثنا، پروفیسر نسرین بلوچ، پروفیسر شرافت عباس، منیر احمد منیر، گل خان نصیر (ثانی)، شہناز بلوچ۔

ان کے علاوہ میں گل خان نصیر کی صاحبزادی بی بی گل بانو، نواسے میرو خان اور محراب خان، گل خان نصیر کے چھوٹے بھائی کرنل ریٹائرڈ سلطان محمد خان مینگل، ان کے قریبی عزیز و اقارب میں جناب پروفیسر عبداللہ خان مینگل اور پروفیسر صبیحہ مینگل کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میرے کام کو آسان بنانے میں میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

عبدالصبور

باب اول

حالاتِ زندگی

1۔خاندانی پس منظر

2۔پیدائش اور تعلیم وتربیت

3۔ عملی زندگی کا آغاز

3.1۔ شادی

3.2۔ شخصی خاکہ

3.3۔ تعلقات اور رشتے

3.4۔ ملازمت

4۔سماجی سرگرمیاں اور کارنامے

4.1۔ کھیلوں میں دلچسپی

4.2۔ فلم بینی کا شوق

4.3۔ شکار کا شوق

4.4۔ تنازعات اور فیصلے

4.5۔ قومی ترقی، تعلیم اور میر گل خان نصیر

5۔ وفات

خاندانی پسِ منظر

بلوچستان کے معروف بلوچ قبیلوں میں ایک مینگل قبیلہ بھی ہے، جو اپنی سماجی پس منظر میں بلوچستان پر تاریخی اور سیاسی حوالوں سے اثر انداز ہوتا ہوا آ رہا ہے۔ اِسی قبیلے کی ایک مشہور طائفہ ''ذگر مینگل'' بھی ہے۔ اس طائفے کے لوگ نوشکی ضلع چاگئے (چاغی) کے طول و عرض میں سکونت پذیر ہیں۔ اس قبیلے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ خانِ قلات کے خصوصی گارڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔ (۱)

میر گل خان نصیر کا تعلق اسی طائفے کے پاندزئی شاخ سے تھا۔ مشہور مورخ اور محقق آغا میر نصیر خان احمدزئی میر گل خان نصیر کا شجرہِ نسب اسطرح بیان کرتے ہیں۔

میر قمبر خان

میر زارد خان

میر ذگر خان

میر ابراہیم خان

میر مینگل

میر ذگر (نوشکی) (2)

''ذگر خان'' مینگل قبیلے کی اس شاخ کے جد امجد تھے جو سات پشت قبل میر قمبر خان سے جاملتی ہے جو وڈھ اور نوشکی کے مینگلوں کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ (3)

یہاں ہم وہ شجرہ نسب بھی دے رہے ہیں جسے میر گل خان نصیر نے بقلم خود 26 جون 1963ء میں بمقام نوشکی تحریر فرمایا تھا۔ (بہ تعاون یوسف عزیز مگسی)۔

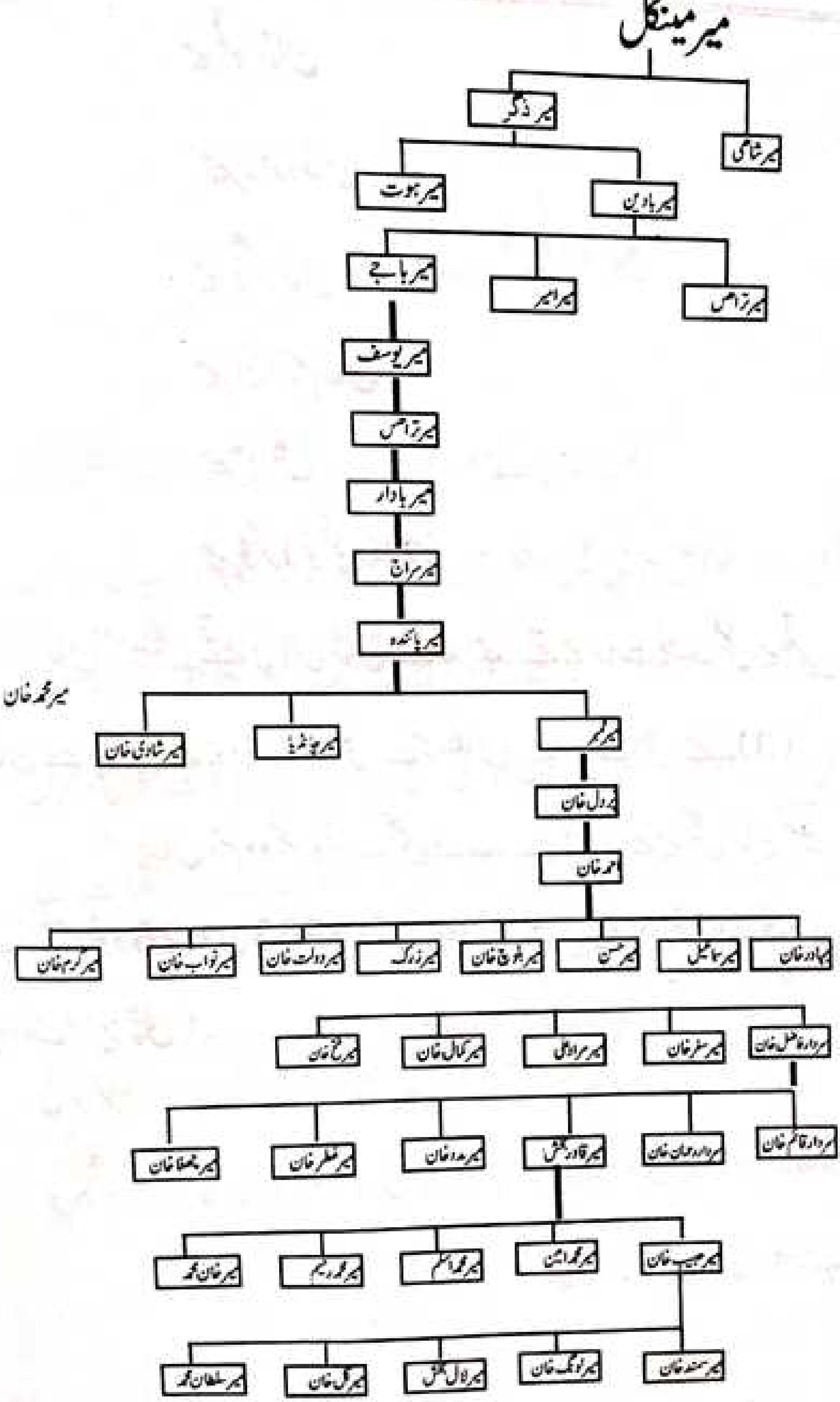
میر مینگل
میر ذگر
میر شاہی
میر حوت
میر بادین
میر باجے
میر یوسف
میر بادار
میر پائندہ
میر محمد خان
میر شادی خان
میر دل خان
محمد خان
بہادر خان
میر حسن
میر دولت خان
میر نواب خان
میر کرم خان
میر کمال خان
میر فتح خان
سردار قاسم خان
میر قادر بخش
میر مراد خان
میر مظفر خان
میر حبیب خان
میر محمد اسلم
میر خان محمد
میر سمند خان
میر لونگ خان
میر لال بخش
میر گل خان
میر سلطان محمد

میر گل خان نصیرؔ کے والد کا نام میر حبیب خان تھا۔ اور والدہ کا نام بی بی حوراں تھی جو رخشانی بلوچ بادینی قبیلے کی شاخ سے تعلق رکھتی تھیں۔(4) میر حبیب خان کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ میر گل خان نصیرؔ آٹھ بچوں میں ساتویں نمبر پر جبکہ اپنے بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے۔ یعنی میر سمند خان، میر لونگ خان، میر لال بخش خان، میر گل خان اور کرنل سلطان محمد خان۔(5)

نصیرؔ کے آباؤ اجداد کا شمار نوشکی کے علاقے میں وطن دوست اور قوم دوست لوگوں میں ہوتا تھا۔ جب ۱۸۳۹ میں بلوچوں کے خان میر محراب خان انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تو اُن کے بہادر بیٹے نصیر خان (دوئم) نے سب سے پہلے نوشکی کے انہی لوگوں کی طرف امداد کیلئے ہاتھ بڑھایا۔(6)

میر گل خان نصیرؔ کے آباواجداد بیرونی حملہ آوروں اور قابضوں سے ہمیشہ لڑتے رہے۔ انگریز حکمرانوں سے لڑنے میں اُن کے آباواجداد کو کافی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، بہت ساری مصیبتیں بھی جھیلنی پڑیں لیکن اُنھوں نے کبھی بھی حکمرانوں کے جوتے سیدھے نہیں کیے اور نہ اُن سے کبھی کسی طرح کا سمجھوتہ کرنے کیلئے آمادہ

ہوئے۔ اسی خاندانی پس منظر میں میر گل خان نصیرؔ کی تربیت ہوئی جس کا اسکی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر چھاپ آخر تک برقرار رہا۔

پیدائش اور تعلیم و تربیت:

میر گل خان نصیرؔ ۱۴ مئی ۱۹۱۴ کو نوشکی کے ''کلی مینگل'' میں پیدا ہوئے۔ والدین نے نام گل خان رکھا اور جب شاعری شروع کی تو نصیرؔ تخلص اپنایا۔(7)

آغا نصیر خان احمد زئی اپنے ایک مضمون 'ملک الشعراء۔ میر گل خان نصیرؔ' میں میر گل خان نصیرؔ کی تخلص کی نسبت کے متعلق رقمطراز ہیں۔

''خوانینِ بلوچ میں میر نصیر خان نوری کا بلوچستان کی تاریخ میں بہت بلند مرتبہ ہے۔ وہ پہلے بلوچ بادشاہ ہیں جنھوں نے بلوچوں کی پہلی اور باقاعدہ حکومت قائم کی اور بلوچستان کی سرحدیں بندر عباس سے ملتان تک پھیلا دیں۔ سندھ کے شہر کراچی اور جیکب آباد اُن کی حکمرانی میں شامل تھے۔ بلوچوں میں میر نصیر خان نوری کو ولی اللہ تصور کیا جاتا ہے۔ آج بھی لوگ ہر سال جوق در جوق ان کے مزار کی زیارت کیلئے قلات جا کر حاضری دیتے ہیں۔ تمام بلوچ مشکل وقت میں ''یا نصیر خان ولی'' کا محاورہ استعمال کرتے

ہیں۔ میر گل خان نصیر نے اسی عظیم بزرگ بلوچ سے اپنی روحانی نسبت کا لحاظ کرکے ''نصیر'' تخلص اپنایا۔'' (8) میر گل خان نصیر نے چوتھی جماعت تک تعلیم اپنے گاؤں کے ایک اسکول میں حاصل کی، مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھیں کوئٹہ بھیجا گیا۔

جہاں ان کو گورنمنٹ سنڈیمن ہائی اسکول کوئٹہ میں داخل کیا گیا۔ اس اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے لاہور چلے گئے۔ جہاں اُنھوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں ایف اے میں داخلہ لیا۔ فرسٹ ائیر کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب سیکنڈ ائیر میں پڑھ رہے تھے تو ایک دن اچانک بائیں آنکھ میں کوئلہ پڑنے کی وجہ سے ان کے آنکھ میں تکلیف پیدا ہوگئی۔ آنکھ کی تکلیف اتنی شدید تھی کہ اُنھیں اپنی تعلیم کا سلسلہ ادھورا چھوڑنا پڑا اور وہ واپس کوئٹہ آ گئے۔ یہ تقریباً ۳۲-۱۹۳۱ کا زمانہ تھا۔ (9)

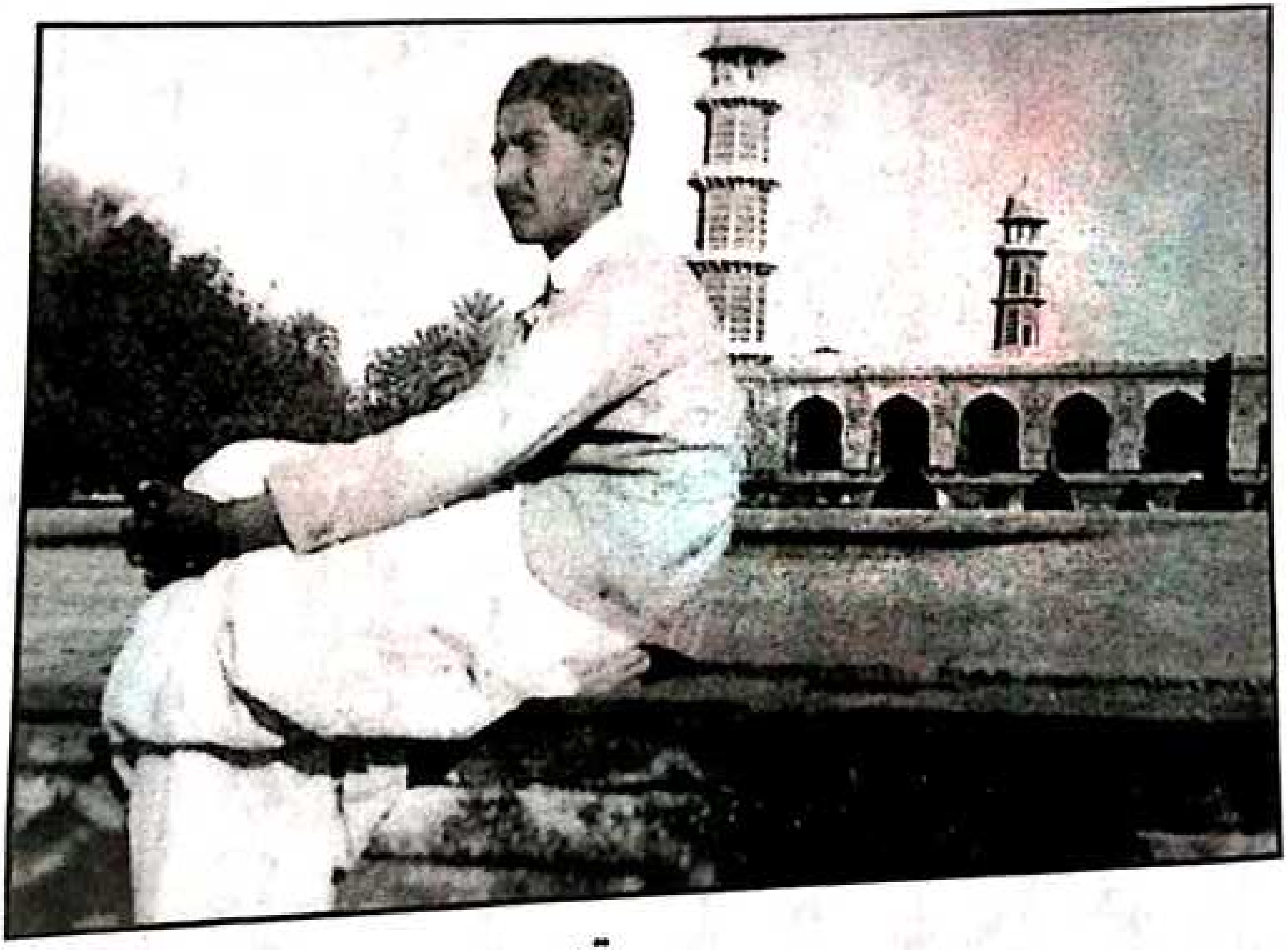

جب لاہور میں زیر تعلیم تھے

عملی زندگی کا آغاز

شادی

اس وقت میر گل خان نصیرؔ کی عمر تقریباً بائیس سال تھی جب ان کی منگنی ہوئی۔ اپنے ایک خط میں ملک فیض محمد یوسفزئی سے اپنی منگنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''......شاید آپ نے یہ سنا ہوگا کہ مورخہ ۳۶-۵-۱۳ کو میری منگنی ہوئی ہے۔ کدھر؟ وہ آپ خود سمجھیں کیونکہ میں نے آپ سے ذکر کیا ہوا ہے۔'' (10)

میر گل خان نصیرؔ کی منگنی ان کی پسند سے شہرک (مکران) کے گچکی خاندان میں، میر بوھیر خان کی بیٹی اور میر شہداد گچکی کی پوتی زبیدہ بی بی سے ہوئی۔ (11)

میر گل خان نصیرؔ کے خاندان اور بوھیر خان کے خاندانی مراسم اور تعلقات تھے۔ دورانِ ملازمت جب میر گل خان نصیرؔ مکران گئے تو اُنھوں نے ان مراسم کو رشتوں کے مضبوط بندھن میں باندھنا چاہا۔ اسطرح ۱۹۳۶ کے اواخر یا ۱۹۳۷ کے اوائل میں گل خان نصیرؔ کی شادی ہوئی۔ (12)

اولادوں میں دو بچیاں پیدا ہوئیں۔ گوھر ملک اور گل

بانو۔ گوھر ملک بچپن میں پولیو کے مرض کا شکار ہوئی جسکی وجہ سے وہ معذور ہوگئی۔ معذوری کی وجہ سے میر گل خان نصیرؔ اپنی اس بیٹی سے زیادہ پیار کرتے تھے اور ان کا خیال بھی زیادہ رکھتے تھے۔ گھر میں گوھر ملک کو پیار سے سب لوگ ملک جان کے نام سے پکارتے تھے۔

میر گل خان نصیرؔ نے اپنے عمل سے اپنے آپ کو ایک شفیق باپ اور پیار کرنے والا شوھر ثابت کردیا۔ اُنھیں بیٹا نہ ہونے کا بھی رنج نہیں ہوا اور نہ ہی یہ روایتی خیال اُن کے ذہن میں کبھی آیا کہ وہ بیٹا پیدا کرنے کیلئے دوسری شادی کرے۔ کچھ لوگوں نے اُنھیں دوسری شادی کا مشورہ بھی دیا اور حتیٰ کہ اُن کی بیوی نے بھی اُنھیں دوسری شادی کیلئے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ راضی نہیں ہوئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جتنے بھی بلوچ نوجوان جوان کے اشعار پڑھتے ہیں وہ سب اُن کی اولاد ہیں۔ (13)

شخصی خاکہ:

میر گل خان نصیرؔ کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ تھا۔ (14) بال بڑے رکھتے تھے۔ رنگ سانولا تھا۔ ناک کی ہڈی ٹوٹنے کے بعد آواز میں فرق آ گیا تھا اور وہ ''گین بند'' کر کے بولتے تھے۔ پیدل چلنے میں تیز

تھے۔ ہلکی سی مونچھیں رکھتے تھے اور داڑھی کاٹتے تھے۔ آنکھیں بڑی تھیں لیکن بائیں آنکھ میں کمزوری تھی۔ (15)

میر گل خان نصیؔر بڑے نیک دل انسان تھے اُن کے دل میں کسی کیلئے بغض وحسد نہیں تھا۔ وہ خود نہ کسی کی برائی کرتے اور نہ کسی اور کی برائی سنتے۔ (16)

''ایک دن میں اپنی چچا کی بیٹی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی کہ گاؤں کی ایک عورت آ گئی۔ باتوں باتوں میں چرواہے کی بیوی کے متعلق باتیں ہوئیں۔ ہمیں پتہ نہیں تھا کہ بابا گھر میں ہے اور کُنڈی بھی کھلی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ شیطان انسان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ ہم کوئی بات کہہ گئے۔ بابا نے آواز دی۔ ملک جان تمھارے منہ میں درد ہو۔ میں حیران رہ گئی کہنے لگے میری اولاد اور ایسی باتیں۔ کیا گاؤں کی عورتوں کی عزت ہماری عزت سے الگ ہے۔ ایسی باتیں کہنے سے تم دونوں کی منہ ٹیڑھی نہیں ہوئی؟۔'' (17)

میر گل خان نصیؔر کو محنت کی عظمت پر یقین تھا۔ وہ نہایت محنتی انسان تھے۔ ان کی زندگی کا ایک لمحہ بھی بے مقصد اور بغیر کام کے نہیں گزرا۔ (18)

جامعہ بلوچستان میں شعبہ اُردو کے پروفیسر ڈاکٹر فردوس انور قاضی میر گل خان نصیؔر سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''یہ تقریباً پندرہ بیس برس پہلے کی بات ہے جب پہلی بار گل خان نصیر سے میری ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا تاثر آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔ ان کے لہجہ کی شائستگی، مخلصانہ اور مودبانہ انداز گفتگو مجھے ابھی تک یاد ہے۔ ان دنوں میں کراچی سے نئی نئی آئی تھی۔ گل خان نصیر سے ملنے کے بعد میرا پہلا تاثر بلوچستان کے لوگوں کے بارے میں یہ بنا کہ وہ بے حد مخلص، مہمان نواز اور محبت کرنے والے لوگ ہیں۔'' (19)

میر گل خان نصیر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے، ان کے نظریات اور افکار کو پرکھتے ہوئے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں جرأت مندانہ اصولوں اور رویوں کے قائل تھے۔ اس لیے اُن میں جرأت مندی بہت تھی۔ عام دوستانہ اور مجلسی گفتگو میں وہ بڑی جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ (20)
جرأت کا یہی اظہار اُنکے اشعار اور دوسری تخلیقات میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ باجرأت لوگوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ عام زندگی میں بہت صاف گو ہوتے ہیں۔ صاف گوئی کی یہ خصوصیت میر گل خان نصیر میں بھی تھی۔ (21)

جو لوگ کسی آدرش کیلئے لڑتے ہیں۔ جن لوگوں کی زندگی

میں مصائب اور مشکلات بار بار آتے ہیں ان لوگوں میں قوتِ برداشت اور صبر و تحمل کا مادہ کھوٹ کھوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ میر گل خان نصیر میں برداشت کی کافی قوت تھی۔ دوستوں اور دشمنوں کی باتیں بڑے صبر و تحمل سے سنتے تھے۔ (22)

میر گل خان نصیر جھوٹ بولنے اور جھوٹی تسلی دینے کے بہت خلاف تھے۔ انھوں نے اپنے بچیوں کو نصیحت کی تھی کہ زندگی میں کبھی جھوٹ نہ بولیں۔ کیونکہ میر گل خان نصیر اچھی طرح جانتے تھے کہ جھوٹ انسان کو ذلیل و شرمندہ کرتا ہے۔ اُنھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کیلئے پھر کئی بار جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ اسی طرح جھوٹی تسلی بھی وہ کبھی کسی کو نہیں دیتے تھے۔ 23

''چند مہینوں کی مینگل کابینہ میں بابا وزیر تھے۔ اُن کے خلاف روز بی ایس او کے جلوس نکلتے۔ نعرے لگاتے۔ گالیاں دیتے۔ پتہ نہیں کیا کیا مطالبات تھے۔ اُن کو میں کہتی، بابا! آپ اُن کو منع کیوں نہیں کرتے۔ ایسا کیوں کرنے دیتے ہیں۔ تو فرماتے یہ اُن کا حق ہے۔ اپنا حق مانگنا کوئی جرم نہیں۔ میں نے کہا تو جو مانگتے ہیں دیدیں۔ فرمایا جو مانگتے ہیں میں دے نہیں سکتا اور جھوٹی تسلی کے میں خلاف ہوں۔'' (24)

قرض لینے کو میر گل خان بہت برا فعل تصور کرتے تھے۔

وہ ہمیشہ اس بات کیلئے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار رہتے کہ کوئی ان کا قرض دار نہیں اور نہ وہ کسی اور کے قرض دار ہیں۔(25)

عقائد اور اعتقاد میں وہ لبرل ذہن کے مالک تھے۔ لیکن مقامی پیروں اور زیارت پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اُنھیں خصوصاً شے حُسین اور حسن تر کہہ سے کافی عقیدت تھی۔(26)

بلوچوں کی روایات میں لمبے بال رکھنے کی رسم شامل ہے۔ میر گل خان نصیر بھی لمبے بال رکھتے تھے۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ انھیں اپنے بال چھوٹے کرنے پڑے۔ اُس وقت کے ملاؤں نے میر گل خان نصیر کے اس عمل کے خلاف فتویٰ جاری کر دیا۔

میر گل خان نصیر اپنے اوپر لگائے گئے اس فتوے کو خاطر میں نہیں لائے اور صرف اتنا کہا۔

مسلمانی افک فقط ریش ئی

ھر ھلی دُرستے ہزار بیش ئی

ترجمہ: مسلمان ہونا فقط داڑھی میں نہیں۔ گھوڑا تو ہزاروں گدھوں میں بھی پہچانا جاتا ہے۔(27)

اِن تمام صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد میر گل خان نصیر

کی شخصیت کے حوالے سے جو تصور اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اُس میں ہمیں میر گل خان نصیؔر کی شخصیت انتہائی متوازن اور معتدل نظر آتی ہے۔

بلوچی میر گل خان نصیر کی مادری زبان تھی اور انھیں اس زبان پر کافی عبور حاصل تھا۔ بلوچی زبان کے ساتھ ساتھ براہوئی زبان میں بھی دسترس رکھتے تھے۔

''میر گل خان نصیر کی مادری زبان بلوچی تھی۔ بلوچی اور براہوئی زبانیں نوشکی میں یکساں بولی جاتی ہیں۔ بلوچی زبان کے ماہر، براہوئی زبان کے بھی ماہر ہیں اور براہوئی دان بلوچی زبان کے بھی اچھے شاعر ہیں۔ چونکہ بلوچی ہم سب کی قومی زبان ہے اور براہوئی ہماری زبان کی ایک شاخ ہے۔ گل خان نصیؔر کو براہوئی اور بلوچی دونوں زبان میں مہارت حاصل تھی۔'' (28)

بلوچی اور براہوئی کے علاوہ میر گل خان نصیؔر نے اردو، سندھی، ہندی، فارسی اور انگریزی میں لکھا ہے۔ (29)

ان زبانوں کے ساتھ ساتھ انھیں پشتو زبان پر بھی مہارت حاصل تھی۔ (30)

باہر کے ممالک میں وہ افغانستان کا سفر کر چکے تھے یہ اُس وقت کی بات ہے جب نیپ کی حکومت تھی اور افغانستان میں سالانہ جشن کی

تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میر گل خان نصیرؔ کو اسی سالانہ جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی جو انھوں نے قبول کی۔(31)

متحدہ ہندوستان کے زمانے میں وہ دہلی، الہ آباد، ممبئی، سری نگر اور شملہ بھی گئے تھے۔(32)

میر گل خان نصیرؔ کو سویت یونین کی حکومت نے فیض احمد فیض کے ساتھ "لینن پرائز" کیلئے بھی نامزد کیا تھا۔لیکن ایوبی آمریت نے انھیں ماسکو جانے نہیں دیا۔(33)

انسان کی ظاہری شخصیت کو نکھارنے میں دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ لباس کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ میر گل خان نصیر لباس کے انتخاب کے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے وہ انتہائی خوش پوش اور خوش لباس تھے۔ "کپڑوں کے معاملے میں وہ بہت وسیع النظر تھے۔ وہ کلچر کو کسی کی میراث نہیں سمجھتے تھے۔شلوار قمیض کے ساتھ ساتھ پتلون بھی شوق سے پہنتے تھے۔"(34)

اپنی جوانی کے دنوں میں جب کراچی جاتے تو وہاں لنڈا بازار سے اپنے لئے کوٹ اور پتلون خرید لیتے اور پھر اُنھیں بنوا کر پہن لیتے۔ایک دن میر گل خان نصیرؔ کسی لاٹری والے کے پاس کھڑے تھے کہ

ایک اور آدمی وہاں پہنچ گیا۔ میر گل خان نصیؔر اور اُس آدمی نے ایک ایک روپیہ لاٹری کیلئے ڈال دیا۔ کچھ نہ نکلنے کے بعد میر گل خان نصیؔر نے ایک دفعہ پھر ایک روپیہ لاٹری کیلئے دیا مگر اُس آدمی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ جب اُس آدمی سے میر گل خان نصیؔر نے ہاتھ کھینچنے کا سبب پوچھا تو اُس نے فوراً میر گل خان نصیؔر کو جواب دیا کہ میں آپ کی طرح امیر نہیں ہوں۔ اُس آدمی نے اصل میں میر گل خان نصیر کے پہنے ہوئے مہنگے کوٹ اور لباس سے اس بات کا اندازہ کرلیا تھا کہ یہ بہت ہی امیر آدمی ہونگے۔(35)

میر گل خان نصیؔر نے اپنے ہر عمل سے ثابت کردیا کہ وہ صرف نام کے بڑے آدمی نہیں تھے بلکہ وہ واقعتاً اور عملاً بھی بڑے آدمی تھے۔ انھیں ڈھنگ اور سلیقے کے کپڑے جہاں کہیں بھی ملتے وہ وہیں جاتے۔ شروع شروع میں گوکہ کوئٹہ میں کباڑی کی دکان نہیں ہوتی تھی لیکن بعد میں جب یہاں بھی کباڑی کی دکانیں کھلیں تو استعمال کیلئے موزے، سویٹر، جوتے وغیرہ میر گل خان نصیؔر انہی دکانوں سے خریدتے تھے۔(36)

ایک دفعہ جیل میں میر گل خان نصیؔر کو جب سزا ملی اور وہ پکے قیدی بن گئے تو انھیں لباس میں پکے قیدیوں والے لباس دیئے گئے جن میں گجراتی یا بمبئی کٹ پاجامہ بھی شامل تھا۔ میر گل خان نصیؔر نے

یہ پاجامہ پہننے سے انکار کر دیا اور اسکے بدلے شلوار کا مطالبہ کیا جب جیل سپرنٹنڈنٹ نے اُنھیں جیل مینوئل دکھایا جس کی رو سے ہر کے قیدی کو پاجامہ پہننا پڑتا تھا۔تب وہ راضی ہوئے اور انھوں نے وہ پاجامہ پہن لیا۔

میر گل خان نصیرؔ کا خیال تھا کہ انسان جب بھوکا ہوتو اُسکے لئے تمام کھانے مزے دار ہونگے ،لیکن اسکے علاوہ میر گل خان نصیرؔ کھانے میں کچھ مخصوص چیزوں کو بھی پسند کرتے تھے خصوصاشکار کئے ہوئے پرندوں کو وہ شوق سے کھاتے تھے اور انکے علاوہ،''ان کے پسندیدہ کھانوں میں کلیجی اور بڑے گوشت کا قیمہ شامل ہوا کرتا تھا۔''(37)دوپہر کا کھانا بہت کم کھاتے، البتہ اُن کے پسند کی کوئی چیز پکتی تو وہ ضرور کھاتے۔اسی طرح ''ایک دن دوپہر کو کہنے لگے، آج جوبھی پکا ہے کھالوں گا۔ بہت بھوک لگی ہے۔تو امّی جان نے کہا کہ آج سرے سے روٹی ہی نہیں پکی ہے۔آٹا نہیں تھا۔تو وہ جاکے کمرے میں لیٹ گئے۔شام کو جب اٹھے تو اُنھوں نے اپنا شعر''گون ءِ جناس''(بھوک کا درندہ)لکھا ہوا تھا۔''(38)

میر گل خان نصیرؔ اکیلے کھانا کھانے کے عادی بھی نہیں تھے۔گھر سے باہر ہوتے تو دوستوں اور احباب کے ساتھ مِلکر کھانا کھاتے اور جب گھر میں ہوتے تو صبح کی چائے،دوپہر اور رات کا کھانا وہ اپنی امّی کے ساتھ کھاتے۔

رات کو سارے بچے نواسے ایک جگہ اکھٹا ہو کر کھانا کھاتے۔

میر گل خان نصیرؔ چائے اور سگریٹ بھی بڑے شوق سے پیتے تھے۔صبح کی چائے کے علاوہ گیارہ بجے سبز چائے ضرور پیتے تھے۔(39)

''اگست کے مہینے میں بابا بیمار پڑ گئے۔ بخار کے ساتھ کھانسی بھی تھی۔ دو تین دن کے بعد بخار تو اُتر گیا مگر کھانسی کا مسئلہ برقرار رہا۔ ......سگریٹ بہت زیادہ پیتے تھے۔امی اور انکے درمیان سگریٹ روز کے جھگڑوں کا سبب بنا۔''(40)

میر گل خان نصیرؔ کے پڑھنے،سوچنے کے ہر مرحلے میں سگریٹ اور چائے پینا شامل تھا۔جب شاعری کیلئے ذہن کو تیار کر لیتے تھے تو اکثر ان کے ساتھ چائے کی بھری ہوئی کیتلی،نوٹ بکس، لائٹر اور سگریٹ رکھے رہتے تھے۔سگریٹ کے کش لیتے جاتے تھے،چائے پیتے جاتے تھے اور قلم رواں رہتا تھا۔

تعلقات اور رشتے:

میر گل خان نصیرؔ اپنے تعلقات اور رشتوں میں بڑے حساس تھے۔خاندان کے علاوہ عزیزوں،دوست اور احباب،ہمسائے غرض

عام لوگوں سے بھی اُن کا رویّہ نہایت شفیقانہ رہا۔ ایک طرف ادبی، سیاسی، صحافتی مصروفیات اور دوسری طرف قید و بند کی صعوبتوں کی وجہ سے وہ اکثر اپنے خاندان، عزیزوں سے دور رہتے تھے لیکن جب بھی نوشکی میں ہوتے تو صبح دوستوں اور عزیزوں کو ضرور وقت دیتے اور ان سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے۔ (41)

''بابا بہت مہربان انسان تھے۔ میری معذوری کی وجہ سے تو مجھے بہت ہی چاہتے تھے۔ اگر کبھی میں رات کو دیر تک بیٹھی کام کر رہی ہوتی یا پڑھ رہی ہوتی تو لائٹ دیکھ کے جھانکتے۔ فرماتے اچھا میری ماں کام کر رہی ہے۔ یا پڑھ رہی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ میں کہتی بس بابا ابھی سو جاؤں گی تو خود مجھے لحاف اوڑھاتے اور بجلی بند کر دیتے'' (42)

جب تک میر گل خان نصیؔر کی والدہ ماجدہ زندہ تھیں۔ وہ جہاں کہیں سے بھی آتے تو سیدھے ان کے پاس جاتے۔ اُن کے ہاتھ چومتے اور کہیں جاتے وقت بھی یہی عمل دہراتے، اسی طرح اُن کی والدہ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتیں اور انھیں دعائیں دیتیں۔ (43)

''اپریل ۱۹۵۸ میں رمضان شریف کا مہینہ تھا بابا موجود تھے کہ انکی والدہ اِس دنیا سے کوچ کر گئیں۔ بابا چونکہ اپنی امی سے بہت پیار کرتے تھے

اس لیے انھیں اس بات کا بہت رنج ہوا۔...... اپنی امی کی انتقال کے بعد جب پہلی دفعہ باہر سے گھر آئے تو کہنے لگے۔"امی کے گھر کی طرف دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا گھر اس طرف سے ٹوٹا ہوا ہے۔میری دعا گو چلی گئیں۔انکی دعائیں ہر جگہ میرے ساتھ ہوتی تھیں" (44)

وہ انتہائی نرم دل انسان تھے۔انکے خاندان میں جب بھی کوئی بیمار ہوتا تو اُنھیں انتہائی پریشانی ہوتی۔وہ اس پریشانی کو بزدلی سے تعبیر نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کے خیال میں وہ چونکہ شاعر تھے اس لیے ان کا دل پھول کی طرح بہت حساس اور نرم و نازک ہے۔(45)

وہ اپنے اور بھائیوں کے بچوں میں فرق نہیں رکھتے تھے جس طرح وہ اپنے بچیوں کی ضد پوری کرتے تھے۔اسی طرح ان بچوں کی خاطر بھی اسی طرح کی کوشش کرتے تھے جب مچھ جیل میں تھے تو اُنکا نواسہ میر وخان پیدا ہوئے اور جب جیل سے رہا ہو کر آئے تو ان کا دوسرا نواسہ محراب خان پیدا ہوا۔میر گل خان نصیر ان بچوں سے بہت پیار کرتے تھے اور جب یہ بچے ذرا بڑے ہوئے تو خود اُنکو اسکول لے جاتے اور لاتے تھے۔انھیں اپنے بچوں کی خدمت کرتے ہوئے ایک طرح کی تسکین ملتی تھی۔(46)

اسی طرح وہ اپنے ہمسایوں کا بھی بہت خیال رکھتے

تھے۔ انکی کوشش ہوتی کہ انکی وجہ سے انھیں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ اپنے گھر کے فرد کی حیثیت سے ان کو دیکھتے تھے۔

''......امی ایک دن کہنے لگی کل اسدی آئی تھی کہنے لگی ولجہ پر قربان جاؤں۔ اس سال جب وہ یہاں ہیں ہمیں دو پہر کی نیند ہی نصیب نہیں ہوتی۔ اتنا زور زور سے پڑھتے ہیں کہ انکی آواز ہمارے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ بابا بہت پریشان ہوئے کہنے لگے اسدی کو کہنا مجھے معاف کر دے۔ مجھے اندازہ ہوتا تو میں زور سے نہیں پڑھتا۔'' (47)

پیر داد میر گل خان نصیؔر کا خدمت گار اور سیاسی دوست تھا۔ میر صاحب اسکا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب ۱۹۷۲ء وہ میں وزیر بنے تو پیر دادا نکے ساتھ انکے گھر میں رہا۔ حتیٰ کہ یہیں اُسکا انتقال بھی ہوا۔ (48)

میر گل خان نصیؔر کو دوستی نبھانے کا فن اچھی طرح آتا تھا۔ وہ دوستوں کیلئے جان کی بازی بھی لگانے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ انکی زندگی کا ایک اہم اور بڑا حصہ جیل میں گذرا مگر دوستوں سے دوستی نبھاتے ہوئے انھوں نے اپنی پوری زندگی گذار دی، وہ دوستوں کیلئے خود تو تکالیف اٹھاتے تھے مگر دوستوں کو تکلیف میں ڈالنے کے قائل نہیں تھے۔ حتیٰ کہ جب آخری دنوں میں بیمار رہے تو انھوں نے خصوصی طور پر اپنے خاندان والوں کو

ہدایت کی کہ میری بیماری کی خبر اخباروں میں نہیں دینا کیونکہ وہ پریشانی کو اپنے خاندان کے لوگوں تک محدود کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ انکی بیماری کی خبر سے انکے دوست احباب کسی بھی طرح کی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔(49)

ملازمت:

میر گل خان نصیرؔ کی تعلیم کا سلسلہ گو کہ ادھورا رہ گیا مگر ان کی ذہنی صلاحیتیں کافی حد تک اُبھر چکی تھیں۔ نوشکی سے کوئٹہ اور پھر کوئٹہ سے لاہور تک کا سفر میر گل خان نصیرؔ کی ذہنی صلاحیتوں کی وسعت کا سفر تھا۔ میر گل خان نصیرؔ کی انہی صلاحیتوں سے خانِ قلات میر احمد یار خان کام لینا چاہتے تھے۔

۲۰ ستمبر ۱۹۳۳ کو جب میر احمد یار خان، خانِ قلات کی حیثیت سے مسند نشین ہوئے تو انھوں نے خصوصاً مقامی تعلیم یافتہ طبقے سے تعاون حاصل کرنا چاہا۔

اپنے حکومتی کاروبار میں خان آف قلات ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ میر گل خان نصیرؔ

نے بھی ریاستِ قلات کی انتظامیہ میں آفیسری کا عہدہ قبول کیا اور مستوفی کے عہدے پر فائز ہوئے۔(50)

۵فروری ۱۹۳۷ میں بمقام سبی جب قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تو یہ پارٹی دو واضح حصوں میں منقسم تھی۔ پہلا گروہ ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کا تھا جو ملازمتوں پر تھے۔ یہ گروہ پارٹی کے مالی استحکام کا ذمہ دار تھا۔ دوسرا گروہ عوام اور ان سنجیدہ افراد اور سیاسی کارکنوں پر مشتمل تھا جو اعلانیہ طور پر پارٹی کے نظریات کی پرچار کرتے تھے۔ پارٹی کے ملازم ممبر اس گروہ کی درپردہ امداد کیا کرتے تھے۔(51)

ملازمت میں رہ کر پارٹی کیلئے کام کرنا قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کی پالیسیوں کا حصہ تھا۔ اسطرح اُن کے رابطے بھی موثر تھے۔

''میں گل خان نصیر سے پہلی مرتبہ اس وقت متعارف ہوا جب ۱۹۳۷ میں وہ کسٹم آفیسر تھے۔ پسنی مکران میں تعینات تھے۔ وہ قلات اسٹیٹ کے ملازم تھے۔''(52)

۱۹۳۸ میں جبکہ میر عبدالعزیز کرد جھالاوان کے نائب وزیر تھے۔ جھالاوان ریاستِ قلات کی نیابت مشکے میں واقع موضع گورجک کے ایک قطعہ زمین کی ملکیت کے جھگڑے نے، جو حکومتِ قلات

اور سردار خاران کے مابین تھی، شدت اختیار کر لی۔ ۱۹۳۹ء میں جب سردار خاران کے لوگوں نے ملشبند کی لیوی پوسٹ (چوکی) پر شب خون مارا اور لیوی کے چار سپاہیوں کو سات رائفلوں سمیت گرفتار کر کے لے گئے ان دنوں میر عبدالعزیز کرد جھالاوان کی نائب وزارت سے تبدیل ہو چکا تھا اور ان کی جگہ میر گل خان نصیر جھالاوان کا نائب وزیر مقرر تھے۔

انجمن اسلامیہ کی مقبولیت کے بعد اور خانِ معظم کے اقدام تک نیشنل پارٹی کے قیام ومقبولیت اور خانِ قلات سے مفاہمت تک کا مرحلہ انگریزی حکومت کے نمائندوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کو عوام میں مقبول بنانے میں ریاستِ قلات کے ان ملازمین کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس لیے انگریزی حکومت کے یہ نمائندے خانِ قلات اور اِن ملازمین کے مابین اختلافات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ (53)

قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کی جدو جہد کی کامیابی کہ جس میں پانچ غیر ملکی وزیروں کو ملازمت سے سبکدوش کرنا بھی شامل تھا ایسا عمل تھا جس نے پارٹی کے ورکروں میں اپنے طاقت کے گھمنڈ کا احساس پیدا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا پارٹی کا غیر ملازم طبقہ بھی یہی خواہش کرنے لگا کہ اُنھیں بھی

کوئی ملازمت بلکہ اچھی ملازمت ملے۔اس رویئے نے پارٹی میں ایک دفعہ پھر بحرانی کیفیت پیدا کردی۔پارٹی کے صدر ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کو پارٹی کا کنونشن بلانا پڑا۔(54)

"نیشنل پارٹی نے اپنا سالانہ کنونشن (۵ اور ۶ جولائی ۱۹۳۹) مستونگ میں منعقد کرنے کا اعلان کیا۔انگریز کے اشارے پر خانِ قلات اور بعض قبائلی سرداروں نے اپنے قبائلی مردمان کے ذریعے جلسے پر حملہ کرایا۔جس کے نتیجے میں نہ صرف جلسہ ہی درہم برہم ہوا بلکہ بہت سارے ساتھی بھی زخمی ہوئے۔لیکن پارٹی کے کارکنوں نے صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔ دوسرے دن پارٹی کو تمام ڈویژن میں خلافِ قانون قرار دے دیا گیا اور تمام اخبارات کے داخلے پر پابندی عائد کی گئی۔تیسرے دن کوئٹہ میں پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کا ایک انقلابی اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ جو ڈیڑھ دو سو افراد خانِ قلات کے ملازم تھے وہ فوری طور پر مستعفی ہو کر اس جبر و استبداد کے خلاف میدان عمل میں نکل آئیں چنانچہ میں نے تحصیل داری سے ٹیلی گرام کے ذریعے استعفیٰ دے دیا۔ملک عبدالرحیم اور عبدالکریم شورش بابو بھی فوری طور پر مستعفی ہوئے۔میر گل خان نصیر جو وزیر تھے اور میر حمل خان جو کسٹم آفیسر تھے احتجاجاً مستعفی ہوگئے۔"(55)

سیاسی صورتحال کو آگے لیجانے کا اہم ترین انحصار ملازم طبقے پر کیا جاتا تھا۔ پارٹی کے خلاف یہ تادیبی کاروائیاں پارٹی کا کمر توڑنے کے مترادف تھی ۔ میر محمد فاضل خان محمد شہی ، وزیر تعلیم اور ملک فیض محمد خان یوسفزئی اسٹنٹ مستوفی بھاگ احتجاجاً مستعفی ہوگئے ۔ بہت سارے ملازموں نے چپ سادھ لی یہاں تک کہ پارٹی کے وہ پرانے ملازم کارکن جن کو یہ عہدے اور افسریاں نیشنل پارٹی کے ہی دم قدم سے ملیں تھیں، اپنی کرسیوں سے چمٹے رہے۔ (56)

دوران ملازمت میر گل خان نصیر سکریٹری جوڈیشل کے عہدے پر بھی کام کر چکے ہیں۔

"پھر خان سے مفاہمت ہوئی مرحوم گل کو سکریٹری جوڈیشل ملک عبدالرحیم کو حاکم اعلٰی قلات، میر عبدالعزیز سکریٹری ایونیو اور مجھے سکریٹری ٹرانسپورٹ مقرر کیا۔ شورش صاحب نے صحافت اختیار کر لی، میر حمل خان نے ٹھیکیداری کی"۔ 57

ریاستِ قلات میں میر گل خان نصیر نے مستوفی (کلیکٹر)، سکریٹری جوڈیشل اور نائب وزیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ دوران ملازمت ایک اچھے ایڈمنسٹریٹر کے طور پر بھی میر گل خان نصیر

اپنا لوہا منوا چکے تھے۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً ۷ مئی ۱۹۴۱ تک میر گل خان نصیر ملازمت پر مامور رہے۔ وزیراعظم ریاست قلات کے ایک حکمنامے سے یہی بات سامنے آتی ہے جو انھوں نے میر گل خان نصیر اور میر حمل خان بلوچ کے استعفیٰ منظور کرتے ہوئے انھیں کسی بھی قسم کی گریجویٹی اور پروویڈنٹ فنڈ سے بھی محروم رکھا۔ حکم نامے کو من وعن نقل کیا جاتا ہے۔(58)

Order by the Wizir-i-Azam, Kalat State

Date camp Quetta, the 8th May 1941 No.265-C.

The Wizir-i-Azam is pleased to accept the resignations tendered by Mir Gul Khan and Mr. Hammal Khan. by their telegrams of 7th May, 1941. They will be entitled to no gratuity or provident fund.

SD/-

Wazir-i-Azam

Kalat State

Camp Quetta

Copy to:

1. Mir Gul Khan, Zaggar Mengal.
2. Mir Hammal Khan, Baloch.

for information. (59)

میر گل خان نصیرؔ اور دوسرے زعماً نے ملازمت قومی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر کی۔ میر محمد فاضل محمد شہی، ملک عبدالرحیم خواجہ خیل، میر عبدالعزیز کرد، ملک فیض محمد یوسفزئی، بابو عبدالکریم شورش، میر حمل خان، ملک محمد سعید، میر عبداللہ جان جمالديني وغیرہ ایسے نام ہیں جنھوں نے نہ صرف دورانِ ملازمت اچھی روایات قائم کیں بلکہ اپنے تجربے، علم اور مشاہدے سے اپنے آپ کو ان عہدوں کا اہل بھی ثابت کر دکھایا۔

سماجی سرگرمیاں اور کارنامے

کھیلوں میں دلچسپی:

جسمانی صحت کیلئے کھیلوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ ''صحت مند دماغ کیلئے صحت مند جسم ضروری ہے'' اور جسم اُس وقت صحت مند ہو سکتا ہے جب اُسے کسی باقاعدہ ورزش یا کھیل کا حصہ بنا دیا جائے۔ جب ہم میر گل خان نصیرؔ کی کھیلوں میں دلچسپی کو دیکھتے ہیں تو یہاں بھی وہ ہمیں ایک اچھے اور کامیاب کھلاڑی کے طور پر نظر آتے ہیں۔ باکسنگ کے میدان میں انھیں خصوصی مہارت حاصل تھی۔

''میر گل خان نصیرؔ جب اسلامیہ کالج لاہور گئے تو وہاں باقاعدہ باکسنگ سیکھنا

شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک اچھے باکسر بن گئے۔ باکسنگ سے انھوں نے بہت ہی اہم اور مشکل موقعوں پر کام بھی لیا۔'' (60)

باکسنگ سیکھنے کے بعد میر صاحب نے باقاعدہ مقابلوں میں حصہ لینا بھی شروع کیا، اسی طرح جب آل انڈیا یونیورسٹیز باکسنگ چیمپئین شپ کے مقابلے ہوئے تو میر گل خان نصیؔر نے بھی اُس مقابلے میں حصہ لیا اور رنراپ کی پوزیشن میں آ گئے۔ اسی مقابلے میں میر گل خان نصیؔر کی ناک کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ (61)

میر عاقل خان مینگل (مرحوم) میر گل خان نصیؔر کے ناک کی ہڈی کے ٹوٹنے کا دوسرا سبب بتاتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں۔

''اسکول کے زمانے میں نصیؔر کے گاؤں کا ایک شخص اعظم جان ولد میر گوھر خان مینگل جوان کا عزیز بھی تھا اور ہم جماعت بھی۔ ان دونوں کی کبھی نہیں بنتی تھی۔ اکثر لڑتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ اعظم جان نے نصیؔر کے چہرے پر یک پتھر ماردیا جس سے انکی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔'' (62)

میر گل خان نصیؔر کے ناک کی ہڈی کے ٹوٹنے کا جو بھی سبب ہو لیکن انکی آنکھیں اسی باکسنگ کی وجہ سے کمزور ہوئیں۔

اس کھیل کا انتخاب گو کہ میر گل خان نصیؔر نے مشغلے کے طور پر کیا تھا

مگر اہم اور مشکل موقعوں پر میر گل خان نصیرؔ اس سے کام بھی لیتے تھے۔

''نوشکی کے شہر میں دو دفعہ میر گل خان نصیرؔ پر حملہ کروایا گیا، ایک دفعہ نوشکی کے بازار میں اور دوسری دفعہ بس اڈے پر عظیم نامی ڈرائیور اور اُس کے کلینر اس کام پر مامور تھے لیکن باکسنگ کے کھلاڑی ہونے کے باعث دونوں دفعہ میر گل خان نصیرؔ نے حملہ آوروں کو مار بھگایا۔'' (63)

انکے علاوہ اور کئی واقعات ہیں جہاں میر گل خان نصیرؔ کیلئے باکسنگ کا کھلاڑی ہونا فائدہ مند ثابت ہوا۔

''کوھنگ کلات (قلاتِ بلوچ) میں پاکستان بننے کے بعد کرنیل نارتھ ایک دوسرے انگریز کے ساتھ نصیرؔ اور اسکے چھوٹے بھائی لیفٹیننٹ (بعد میں کرنل بنا) سلطان محمد سے کُردی یعنی براہوئی سیکھ رہے تھے۔ قلات میں ایک دن کسی انگریز نے کہا۔

آپ بلوچ لوگوں کو باکسنگ نہیں آتی۔ گل خان نے فوراً اُسے جواب دیا کہ آؤ، آزماؤ۔ انگریز بھی فوراً تیار ہوگیا۔ کھیلتے کھیلتے نصیر کو صحیح مکا مارنے کا موقع ملا تو وہ انگریز وہیں ڈھیر ہوگیا پھر اُسے ہسپتال لے جانا پڑا۔

۱۹۶۲ء میں کراچی میں ایوب خان کے خلاف ایک اجلاس منعقد ہونا تھا کہ جس

میں جسٹس لاری اور میر رسول بخش تالپور کے علاوہ گل خان نصیر، وڈیرہ لعل بخش رند، اور میر گوھر خان زرکزئی بھی شریک تھے۔ اس زمانے میں نواب کالا باغ امیر محمد خان اپنے بدمعاشوں کے ذریعے جلسوں کو درھم برھم کرنے میں کافی نام پیدا کر چکا تھا۔ انکے جلسے پر بھی اُس کے بدمعاشوں نے ہلہ بول دیا۔ لوگ سارے ادھر اُدھر بھاگ نکلے۔ نصیر کا کہنا ہے کہ جب میں نے اپنے آس پاس دیکھا تو لعل بخش رند اور گوھر خان کے علاوہ اسٹیج پر کوئی نہیں تھا۔ جسٹس لاری اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ اسی اثنا میں وہ لوگ ہم تک پہنچ گئے اور ہم لوگوں نے انکی ایسی خبر لی کہ وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ (64)

میر گل خان نصیر نے باکسنگ سے کبھی بھی غلط کام نہیں لیا۔ وہ ہمیشہ اسے اپنے دفاع کیلئے استعمال کرتے رہے۔ اس کھیل کے اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر انھوں نے کبھی بھی پہل نہیں کی اور نہ ہی بلا وجہ انھوں نے کہیں بھی باکسر ہونے کا تاثر دیا۔

"اسلامیہ کالج میں پڑھائی کے دوران ایک دن اپنے ایک اوگان دوست کے ساتھ ریلوے روڈ پر جا رہے تھے کہ ایک دکان کے سامنے اپنے ایک اور دوست کا انتظار کرنے کیلئے رک گئے۔ دکان کے تھڑے پر ایک غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ جس پر ایک بوڑھا ہندو بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اُس کا اوگان دوست اُس غالیچے کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ہندو کو شاید اُسکی یہ حرکت بری لگی۔

اس نے اپنی چھڑی اُٹھائی اور اوگان کو دے مارا۔ دونوں آپس میں اُلجھ گئے۔ سارے ہندو جمع ہو گئے۔ نصیر بھی اپنے دوست کی مدد کو پہنچ گیا۔ چوٹیں نصیر کو بھی آئیں مگر اس نے بہت سارے لوگوں کو زخمی بھی کر دیا۔ تب انگریزوں کا زمانہ تھا پولیس پہنچ گئی اور ان کو نکال دیا۔'' (65)

بائسنگ کے ساتھ ساتھ میر گل خان نصیر ایک اور فن کے بھی ماہر تھے۔ ان میں یہ خوبی تھی کہ اگر کوئی اُس کے سر کے بالوں کو جتنا بھی مروڑ کے سختی سے پکڑ لیتا وہ ایک ہی جھٹکے سے اپنے بالوں کو اس سے چھڑا سکتے تھے اور میر گل خان نصیر اس وقت بال بھی بڑے بڑے رکھتے تھے۔ (66)

فلم بینی :

میر گل خان نصیر کے مشاغل میں فلم بینی کا عمل بھی شامل تھا۔ انکی ہمیشہ کوشش ہوتی کہ اچھی اور تعمیری فلم ضرور دیکھے۔ میر گل خان نصیر کے رفیق اور ہمکار لعل بخش رند اپنے ایک مضمون ''میر صاحب کی چند یادیں'' میں لکھتے ہیں۔

''وہ اپنی ذاتی زندگی میں فلم دیکھنے کے بہت شوقین تھے۔ میر غوث بخش بزنجو اتنے شائق نہیں تھے۔ وہ چھوٹوں کے درمیان چھوٹے اور بڑوں کے درمیان بڑے تھے۔ وہ چھوٹوں کے ساتھ بھی فلم دیکھنے سینما

پاؤں جاتے تھے۔''(67)

میر صاحب کی یہ خوبی تھی کہ وہ اپنے مشغلوں میں بھی تعمیر کے عنصر کو اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے لہٰذا انھیں جب بھی موقع ملا اور ان کے ذہن میں جب بھی کوئی اچھا تصور ابھرا، اُسے میر صاحب نے عملی جامہ ضرور پہنایا۔ ''داستان دوستین وشیرین'' انہی لمحوں کا تصوراتی خاکہ تھا جس نے بعد میں عملی روپ دھار لیا۔

''1962 کے اپریل کا مہینہ تھا اور میں راولپنڈی میں تھا۔ ایک شام ''شیرین فرہاد'' نامی کوئی غیر ملکی فلم دیکھنے سینما چلا گیا۔ یہ فلم ترکوں کے نامور شاعر ناظم حکمت کی لکھی ہوئی تھی جو اس نے ''شیرین فرہاد'' کی داستان سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس داستان کا ماخذ بے شک شیرین فرہاد کے قدیم ایرانی تصور سے تھا مگر زندگی کے نئے تجربات اور بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ناظم حکمت نے اسے زندگی کے بنیادی اور حقیقی اصولوں سے ہم آہنگ کر کے عوامی رنگ میں رنگ دیا تھا کہ جس سے یہ داستان خسرو پرویز کی بے لگام بادشاہت کے خلاف مظلوموں کی ایک موثر تحریک اور آواز معلوم ہوتی تھی''(68)۔

اس حوالے سے ہم دو باتیں اخذ کر سکتے ہیں۔ پہلی بات

یہ کہ میر گل خان نصیرؔ فلموں کے انتخاب میں کن موضوعات اور رائیٹرز کو ترجیح دیتے تھے۔ اور دوسری بات یہ کہ اُن حالات کو وہ کس طرح اپنے حالات سے جوڑتے تھے یہ تبھی ممکن ہے جب کوئی انسان ایک لمحے کیلئے بھی اپنی قوم اور وطن سے فراموش نہ ہو، یہ خوبی میر گل خان نصیرؔ میں تھی۔

بے شک وہ سینما ہال میں بیٹھ کر ''شیرین فرہاد'' کی داستان کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر اُن کا ذہن محو پرواز تھا۔ وہ ان پہاڑی سلسلوں تک پہنچ چکے تھے جہاں ''دوستین اور شیرین'' کی محبت پروان چڑھی تھی۔ اُن کے ذہن میں یہ سوال بھی اُبھر رہا تھا کہ کیا میں جام دُرک کے اشعار کے ان رومانوی کرداروں کو عوامی اور حقیقی رنگ دے پاؤں گا؟ وہ جتنا زیادہ اپنے ذہن پر زور ڈالتے رہے اُنکے لئے کام کرنے کی تحریک اور بڑھتی گئی۔ 69

اسطرح میر صاحب کی فلم بینی کے مشغلے نے بلوچی ادب کو ایک بیش بہا اور نادر تحفہ ''داستان دوستین و شیرین'' کی شکل میں، منظوم انداز میں دے دی جو یقیناً بلوچی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

شکار کا شوق:

بلوچ سماج میں زندگی گزارنے کے روایتی انداز میں شکار کھیلنا بھی شامل ہے۔اب گو کہ یہ ایک مشغلے کی حد تک باقی رہ گئی ہے لیکن تاریخ پر نظر دوڑانے سے پتہ چلتا ھے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب یہاں کے لوگ شکار پر ہی گزر بسر کرتے تھے۔ بلوچوں کی ابتدائی زندگی چونکہ خانہ بدوشانہ رہی ہے اسی لیے انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں انتہائی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔طرح طرح کے درندے اور خون خوار جنگلی جانوروں سے اُن کا ہمیشہ پالا پڑتا تھا اور وہ ان درندوں اور خونخوار جانوروں سے مقابلے کیلئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔اپنے پاس کسی نہ کسی طرح کا ہتھیار وہ ضرور رکھتے تھے۔جس کا مقصد اپنے آپ کو ان درندوں اور جانوروں سے محفوظ رکھنا ہوتا تھا۔ترقی اور جدید ایجادات نے جہاں انسان کو ایک طرف محفوظ رکھا وہاں دوسری طرف اُس کے لئے نت نئے مشغلے بھی سامنے آگئے جن میں ایک مشغلہ شکار کھیلنا بھی ہے۔اسی طرح میر گل خان نصیر بھی شکار کو بلوچوں کی سماجی زندگی کا ایک اہم حصہ سمجھتے تھے۔(70)

شکار کے شوق کی جھلک میر گل خان نصیر کی شاعری میں

بھی نظر آتی ہے۔اپنے اشعار میں وہ اُن صحراؤں اور پہاڑوں کا ذکر کرتے ہیں جنھیں اپنے شکار کیلئے وہ منتخب کرتے ہیں۔ اُن بندوقوں کا بھی احوال بتاتے ہیں جنھیں دوران شکار وہ اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اُن پرندوں کے متعلق بھی بتاتے ہیں جنھیں میر گل خان نصیر کا شکار ہونا ہوتا ہے۔ ''کبھی کبھی سویرے اٹھ کر مرغابی کے شکار کو جاتے۔شکار لاتے یا نہ لاتے ایک تازہ نظم یا غزل کچھ نہ کچھ ضرور اپنے ساتھ لاتے۔ایک بار شکار سے آئے تو دیکھا کہ شکار کا تھیلا بھرا ہوا ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ سب پتھر ہیں۔ بابا جان نوٹ بک گھر بھول گئے تھے اس لیئے پتھروں پر شعر لکھ کر لائے تھے''۔71

۱۹۵۴ء میں جب میر گل خان نصیر کو نظر بند کیا گیا تو نظر بندی کے دوران انھیں اپنے گھر سے بیس میل تک آنے جانے کی اجازت تھی۔یہ عرصہ انھوں نے زیادہ تر سیر وتفریح اور شکار میں گزارا۔

میر گل خان نصیر کی بیٹی محترمہ گوھر ملک (مرحومہ) اپنی ایک ''گلگ نمدی'' میں اُن دنوں کو یاد کرتی ہیں جب ان کے ''بابا'' سے اُنکے مکالمے ہوتے تھے۔

''---کبھی کبھار شکار پر بھی جاتے۔لیکن آجکل کیوں

نہیں جاتے۔؟

''مادر! تمھیں سچ بات بتاؤں۔ مجھے ان پرندوں پر ترس آتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے یہ زندگی کی نعمت سے محروم رہیں۔ (ہنس کر) لیکن دیکھ! کسی سے مت کہنا کہ تمھارا باپ اتنا بزدل ہے۔'' 72

تنازعات اور فیصلے:

میر گل خان نصؔیر ہر طرح کی باہمی رنجشوں اور آپس کی چپقلشوں کے خلاف تھے۔ وہ بلوچوں کو ہر سطح پر ایک متحد اور متفق قوم کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ تعصبات تفرقات اور امتیازات سے اُنکی شخصیت بالاتر تھی۔ رنجش، چپقلش اور تنازعے انفرادی سطح پر ہوتے یا قبائلی سطح پر، نسلی سطح پر ہوتے یا مذہبی سطح پر وہ ہر محاذ پر انکو ختم کرنے کے درپے تھا۔ اُنکے اپنے دوستوں سے بہت سارے معاملات پر اصولی اختلافات بھی رہے لیکن ان اختلافات کو کبھی بھی ذاتیات تک نہیں لائے۔ صحافت کے زمانے میں لالہ غلام محمد شاہوانی سے انکے اختلافات ہوں یا سیاست کے محاذ پر میر غوث بخش بزنجو سے، ان اختلافات کو اُنھوں نے تعلقات کی راہ میں کبھی بھی رکاوٹ بننے نہیں دیا۔ وہ دوستوں کے باہمی جھگڑوں اور

ناراضگیوں کو انھیں قائل کر کے ختم کرتے تھے۔ اسی طرح کے ایک واقعہ کا ذکر لال بخش رند اپنے ایک مضمون ''میر صاحب کی چند یادیں'' میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''1965 میں ہم جیل میں قید تھے...... اس وقت جیل میں میرے اور میر صاحب کے علاوہ یار محمد یار، لطیف بلوچ، عبدالرحیم بلوچ اور یوسف نسکندی تھے۔ میرے اور یوسف نسکندی کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ میر صاحب نے جھگڑا رفع کرایا اور ہماری دوستی کرادی۔ انھوں نے مجھے اور نسکندی صاحب کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں صبح سے رات تک ایک ساتھ رہنے کے سبب، تلخیاں بھی پیدا ہوتی ہیں لیکن تم لوگ تو ایک بڑے آدرش کے علم بردار ہو اس لئے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا مناسب نہیں''۔ (73)۔

... قبائلی جھگڑوں کو قومی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور انہیں جب بھی موقع ملتا تھا وہ ان جھگڑوں کو ختم کرنے کیلئے اپنا کردار ضرور ادا کرتے تھے۔ بگٹی اور جکھرانی قبیلوں کے مابین صلح کروانے میں میر گل خان نصیر نے اہم کردار ادا کیا۔

''۷ فروری ۱۹۶۸ء کو سردار عطاءاللہ خان مینگل، میر غوث بخش بزنجو، میر گل خان نصیر اور میر عبدالکریم مینگل جھالاوان کی مخلصانہ جدوجہد اور قومی

مصالحانہ کوششوں سے بگٹی اور جکھرانی قبائل کے تمام تنازعات بلوچی رسم و رواج اور روایاتی قدروں پر استوار بنیاد پر فیصلے کیے گئے جس سے نہ صرف دونوں مذکورہ قبائل بلکہ دوسرے بلوچ قبائل پر بھی خوشگوار اثرات مرتب ہوئے ہیں۔'' (74)

مذکورہ قبائلی جھگڑا اراضیات کے حق ملکیت پر شروع ہوا تھا۔ جکھرانی قبیلہ سے بائیس افراد قتل ہوئے تھے اور پانچ افراد بندوقوں سے زخمی ہوگئے تھے جبکہ بگٹی قبیلہ کے بیس افراد قتل ہوئے تھے اور پانچ افراد بندوقوں سے اور دو لاٹھیوں سے زخمی ہو چکے تھے اتنی بڑی قبائلی چپقلش کو بھی میر گل خان نصیر اور اُنکے ساتھیوں نے خوش اسلوبی سے ختم کرا دیا۔ 75

اقلیت جنھیں بلوچ سماج میں ''باہوٹ'' تصور کیا جاتا ھے اور بڑی بڑی جنگیں بھی انکے میدان میں آنے سے ختم کردی جاتی ہیں لیکن کبھی کبھار ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں جو اپنی روایات کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں تو یقیناً ان حالات میں میر گل خان نصیر تماش بین کی حیثیت سے نہیں بیٹھتے وہ اپنا مثبت کردار ہر حال میں ادا کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا پاکستان نیا نیا وجود میں آچکا تھا۔ بہار، پنجاب اور دوسرے علاقوں میں ھندو، مسلمان اور سکھ آپس میں گھتم گھتا تھے

اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ سندھ اور بلوچستان میں بھی کچھ لوگ یہی خواہش رکھ رہے تھے کہ وہ بھی اپنے ہاتھ ھندوؤں کے خون سے رنگ لیں۔ بلوچ نہیں مان رہے تھے۔ شیر زمان نوشکی میں پولیٹیکل ایجنٹ تھا۔ اس نے کچھ میر اور سرداروں کو اس کام کیلئے آمادہ کیا جنھوں نے کچھ اوباش قسم کے لوگوں سے قتل وغارت کی ابتداء کروانی چاہی۔ یہ لوگ بازار میں جاتے ،ھندوؤں کو برا بلا کہتے اور گالیاں دیتے۔ میر گل خان نصیر نے پہلے تو ان لوگوں کو سمجھایا جسکی وجہ سے زیادہ تر لوگوں نے میر گل خان نصیر کی باتوں سے اتفاق کیا اور وہ چلے گئے مگر تین چار ھٹ دھرم قسم کے لوگ اپنا فیصلہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ تنگ آ کر میر گل خان نصیر نے ان لوگوں کی خود پٹائی کی اور انھیں مار بھگایا اور ایک بہت بڑے متوقع جھگڑے کو ختم کر دیا۔76

قومی ترقی، تعلیم کا کردار اور میر گل خان نصیر

جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کیلئے تعلیم کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ قومی تشخص کی بقاء بھی اس سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہے۔ آج وہی اقوام ترقی کے منازل طے کر رہی ہیں جو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہیں۔ جہاں تعلیم کی روشنی پھیلی وہاں روشن خیالی اور ذہنی

انقلابات برپا ہوئے اور جہاں جہاں اسکی روشنی نہ پہنچ پائی وہاں اب بھی لوگ نان شبینہ کے محتاج ہیں۔ بدقسمتی سے بلوچستان کا خطہ بھی تعلیم کی روشنی کی کرنوں سے کوسوں دور رہا جسکی وجہ سے کافی عرصے تک جہالت، پسماندگی یہاں کے لوگوں کا مقدر بنی رہی۔ لیکن میر گل خان نصیر اسکو مقدر کا کھیل نہیں سمجھتے تھے اُنھوں نے جہاد کی صورت میں تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ اُنکا خیال تھا کہ مقدر انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس طرح چاہے اُسے بنا سکتا ہے۔ سنوار سکتا ہے۔

ما جاہل ءُ کمزوراں بے الم ءُ ہنر کوراں

اے وسپگ ءُ نادانی بد پر تو گناہ پہ من

ترجمہ: ہم جاہل، کمزور بغیر علم و ہنر کے اندھے۔ اسطرح خواب غفلت میں پڑنے کی نادانی آپ کیلئے بری اور میرے لئے گناہ ہے۔ (77)

میر گل خان نصیر خواب جہالت سے نکلنے کا اہم ترین ذریعہ تعلیم کو ہی سمجھتے تھے۔ وہ ترقی، خوشحالی، آسودگی اور جدوجہد میں بالیدگی کے عنصر کو تعلیم سے ہی مشروط کرتے تھے۔ اپنی ایک قطعہ میں وہ کہتے ہیں۔

بے علم و ہنر کس من جہان شات نہ بیت

بے جوھر و عمل، ہچ کسے آبات نہ بیت

یک ٹکے گوشاں ،ایشرا تو مہر بہ دار

قربانی ءَ بید، تئ وطن آزات نہ بیت

ترجمہ: بغیر علم و ہنر کے کسی کو خوشحالی نہیں مل سکتی، جسطرح بغیر جوہر و عمل کے کوئی آسودہ نہیں ہوسکتا۔ ایک پتے کی بات بتاؤں اسکو تم مضبوطی سے تھام لو کہ بغیر قربانی کے وطن کبھی بھی آزاد نہیں ہوسکتا۔ (78)

ان دونوں اشعار میں میر گل خان نصیرؔ تعلیم اور ہنر پر زور دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اُس وقت جب میر گل خان نصیرؔ کی سرگرمیوں اور نقل و حمل پر پابندی عائد کی گئی اور انھیں گھر سے دو میل آگے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ہر ہفتہ انھیں پی اے صاحب کی خدمت میں حاضری دینی تھی۔ تب بھی جب وہ حاضری کیلئے جاتے تو ساتھ میں اُن کے سامنے مطالبات بھی رکھ دیتے۔ گوھر ملک اپنے بابا کے الفاظ یوں دھراتی ہیں۔

''میرے لئے اچھا ہے جب جاتا ہوں تو اخبارات بھی پڑھنے کیلئے ساتھ لاتا ہوں۔ ان سے اپنے دو مطالبے بھی کرونگا، لڑکیوں کیلئے اسکول اور نوشکی کے دیہات اور گاؤں میں پانی کے نل کا بندوبست۔ پانی کے نل کیلئے تو وعدہ کیا ہے۔ مگر اسکول کے متعلق کہتے ہیں کہ سردار نہیں مانتا۔ میں نے کہا

میں تو مانتا ہوں پہلے آپ میرے گاؤں میں تو اسکول کھول دیں۔"(79)

میر گل خان نصیر علم حاصل کرنے کیلئے تفریق کے قائل نہیں

تھے۔ وہ مرد و زن دونوں کیلئے یکساں تعلیم کے خواہان تھے۔ معاشرے کی ترقی کیلئے وہ خواتین کی تعلیم کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ باہر کے کسی اسکول میں بھیجنا تو دور کی بات تھی۔ گھروں میں بھی بچیوں کو تعلیم دینا نامناسب خیال کیا جاتا تھا۔ تب بھی میر گل خان نصیر نے اپنی دونوں بیٹیوں کو گھر ہی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ انکو اردو پڑھاتے تھے۔ بعد میں جب یہ سلسلہ ذرا آگے بڑھا تو میر صاحب کی دو بیٹیاں خاندان کے دوسرے بچیوں کو پڑھانے لگ گئیں۔ جب میر صاحب کے گاؤں "کلی مینگل" میں لڑکیوں کیلئے پرائمری اسکول کھولا گیا تو یہ واحد اسکول تھا جس میں پہلی جماعت سے لیکر پانچویں جماعت تک طالبات موجود تھیں۔ 80

"وہ لڑکیوں کیلئے تعلیم کو لازمی سمجھتے تھے۔ میرے چچا میر لونگ خان کو لڑکیوں کا پڑھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن بابا کی خاطر کچھ نہیں کہتے تھے۔

......ایک دن بابا ہمیں پڑھا رہے تھے۔

ماموں کہنے لگے گل جان آج اگر ہمارے ابو زندہ ہوتے اور وہ یہ دیکھتے کہ آپ بچیوں کو انگریزی پڑھا رہے ہیں۔.......... بابا نے جواب دیا۔ والدین اور ہمارے دور گزر گئے، اب جدو جہد اور ترقی کا دور ہے اور بغیر علم حاصل کیے ترقی کرنا ناممکن ہے۔ وہ بھی اس وقت جب بچے بچیاں یکساں تعلیم حاصل کر سکیں۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ وقت کے شانہ بشانہ چلے۔ ادوار ہمارے لئے نہیں ٹھہرتے۔ اگر ہم ساتھ نہ دے سکے تو خود پیچھے رہ جائیں گے۔"81

میر گل خان نصیر سماج کی ترقی چاہتے تھے وہ لڑکیوں کیلئے تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے لیکن وہ اپنی روایات کا لحاظ بھی رکھتے تھے۔ وہ معاشرے کی ترقی میں چھلانگ لگانے کے قائل نہیں تھے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ چھلانگ لگانے سے بگاڑ کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ سماج کو اُس کے ارتقائی مراحل میں ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ پھونک پھونک کر قدم بڑھاتے۔ وہ آنے والے وقت کیلئے پیش بندی کرنے اور ہر کام کو اُس کے مقررہ وقت میں دیکھنے کے قائل تھے۔

"باتوں باتوں میں ایک دن میں نے بابا سے پوچھا کہ جب ہم چھوٹے تھے اور جس وقت آپ کوئٹہ میں تھے تب آپ نے ہمیں

کوئٹہ لے جا کر اسکول اور کالج میں داخل کیوں نہیں کروایا۔ کہنے لگے قلات میں جب آپ لوگوں کو اسکول میں داخل کروایا تو پھر صورتحال خراب ہوگئی۔ پھر اُس وقت حالات ایسے نہ تھے۔ پھر غازی امان اللہ خان کی مثال دیتے ہوئے کہنے لگے۔ جب اُس نے عورتوں کو آزادی دی تو انگریزوں نے اسی بات کو بہانہ بنا کر عوام کو اس کے خلاف اٹھ کھڑا کر دیا اور اسے ملک سے نکال دیا۔ ہر کام کیلئے ایک خاص وقت مقرر ہے۔'' (82)

میر گل خان نصیر انقلابی افکار رکھتے تھے اور حالات کا مشاہدہ کرکے آنے والے وقتوں میں اُس کے انجام کو بھی پہنچ جاتے تھے۔ لہذا تجزیہ و تحلیل کے بعد وہ اپنا ذہن بنا کر اُسی انداز سے حالات سے نبرد آزما ہوتے تھے۔

لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے میر گل خان نصیر کی ایک نظم ''بے علمیں جنکے'' یعنی ''ایک ان پڑھ لڑکی'' انکے خیالات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ وہ نہ صرف تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور لڑکیوں کیلئے اسے ضروری تصور کرتے تھے بلکہ وہ تعلیم حاصل کرنے کیلئے نوجوانوں کا حوصلہ بھی بڑھاتے تھے۔ وہ اس بات کو اہم سمجھتے تھے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ

ملکی سیاست سے باخبر رہ کر نوجوان اپنے آپ کو مادرِ وطن کی خدمت کے اہل بنا سکتے ہیں۔ میر صاحب ۱۱۶ اکتوبر ۱۹۶۴ کو کراچی سے ایک خط محمد یوسف عزیز مگسی کو لکھتے ہیں۔

''تمھارا خط ملا۔ تمھارے پاس ہونے اور پھر کالج میں داخلہ لینے کی خبر سے بہت خوشی ہوئی مجھے اُمید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح دل لگا کر پڑھو گے تا کہ صحیح طور پر مادرِ وطن کی خدمت کے اہل بن سکو..........

خوب پڑھو! لیکن ساتھ ہی مادرِ وطن کی سیاست سے بھی اپنے کو باخبر رکھا کرو۔.........'' 83

ایک اور خط جو انھوں نے محمد یوسف عزیز مگسی کو لکھا۔ اُس میں بھی میر صاحب اُسے پڑھنے کی جانب مائل ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ (84)۔

وہ پڑھنے اور پڑھانے کو مشنری جذبہ کے ساتھ لئے ہوئے تھے۔ انھیں گھر میں رہنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ لیکن ایک ہفتہ دس دن کیلئے جب بھی گھر آتے تو بچوں کو ضرور پڑھاتے۔ (85)

انھیں اپنے بچوں کی خدمت کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی تھی۔ بچوں کو خود اسکول لے جاتے اور لاتے تھے۔ یہی ذمہ داری

انھوں نے آخر دم تک نبھائی۔

"............دس نومبر تک خود ان کو اسکول لے گئے اور کراچی کے آخری سفر سے چار دن پہلے تک میرو کو پڑھاتے رہے کہ اس کے امتحان ہو رہے ہیں۔ انکی خواہش تھی کہ وہ میرو کے کالج میں داخلہ لینے تک زندہ رہیں۔"(86)

"انکی عادت تھی کہ صبح سویرے اٹھتے۔ ایک پیالی چائے پیتے پھر میرو اور شاہکو کو اسکول لے جاتے۔ پھر نہاتے اور بیٹھ کر ناشتہ کرتے۔"(87)

اے ڈولیں حکومت کہ ترا نان مہ دنت

ناجوڑ بہ بۓ آترا درمان مہ دنت

زھگاں تئ موانیت وحقاں تئ مہ زانت

کسے پہ حکومت ءَ چشیں جان مہ دنت

ترجمہ: ایسی حکومت جسے تمھاری روٹی کا خیال نہ ہو۔ بیمار پڑنے پر دوائیوں کا بندوبست نہ کر سکے۔ بچوں کو نہ پڑھائے اور تمھارے حقوق نہ جانے۔ اسطرح کی حکومت کیلئے کوئی بھی اپنی جان نہ گنوائے۔(88)

اسطرح میر گل خان نصیر علم کو بنیادی انسانی حقوق سے جوڑتے ہیں۔ اور اسے لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہمارے صوبے کو تعلیم کے میدان میں جان بوجھ کر پسماندہ رکھا گیا تاکہ یہاں کے

لوگ جاہل اور ذہنی طور پر غریب رہیں۔(89)

جب تعلیم اور علم کی بات ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ غیر روایتی تعلیم کا تذکرہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ میر گل خان نصیؔر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ وہ خود بھی لکھنے پڑھنے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے جو لمحے فارغ ہوتے وہ ان لمحوں کو ضائع نہیں کرتے یا تو کوئی کتاب پڑھتے یا پھر لکھتے رہتے۔ جب ہم میر صاحب کی شخصیت کیلئے ہمہ جہت کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس سے ان کے وسیع مطالعے کا پتہ بھی لگ سکتا ہے۔

''کراچی جیل میں، میں نے جو عرصہ میر گل خان نصیر کے ساتھ گذارا اس میں، میں نے دیکھا کہ وہ بہت مطالعہ کرتے تھے اور مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات اور مختلف فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ جاری رکھتے تھے۔ ان کے مطالعے میں شاعری سرِ فہرست تھی''(90)۔

میر گل خان نصیؔر جب بھی نوشکی جاتے تو اُنکی مصروفیات میں روزانہ لکھنے پڑھنے کا عمل شامل ہوتا، جب صبح ناشتہ کرتے تو کچھ وقت دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ باہر بیٹھک میں ضرور گذارتے اور پھر بیٹھک کے ساتھ والے کمرے میں جو ان کے لکھنے کا کمرہ تھا لکھنے میں لگ

جاتے۔اسی طرح دو بجے سے چار بجے تک آرام کرتے، دوپہر کو سونا یا چِر لیٹنا اُنکا معمول تھا اگرانھیں نیند نہ آتی تو وہ ضرور کوئی کتاب اُٹھا کر پڑھ لیتے۔(91)

انسان گوں کائنات ءِ مڑان انت چہ ازل
ھر چی ءِ گران، دیان انت، وتی ڈول ءِ بدل
ھچ چیئے درءَ نہ روُت چہ دست ءِ بشرءِ
کل بنتی گلام و بندگ بے مرگ و اجل

ترجمہ: انسان اور کائنات کی جنگ ازل سے جاری ہے۔انسان اس کائنات کی ہر شے کو اپنے رنگ میں رنگتا اور بدلتا جارہا ہے۔کوئی شے ایسی نہیں جو انسان کی پہنچ سے باہر ہو۔اسطرح اجل اور موت کے سوا تمام اشیاء پر انسان کا تصرف ہوگا۔(92)

میر گل خان نصیر جب انسان کی قدرت اور اختیار کے قائل ہوتے ہیں تو انھیں قائل کرنے میں اہم عنصر علم ہی کا ہوتا ہے۔وہ یہی سمجھتے ہیں کہ انسان بہت ساری چیزیں علم ہی کی بدولت اپنے تصرف میں لاسکتا ہے۔جب سویت یونین (سابقہ) کے خلانورد مریخ پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ اسے علم ہی کا کرشمہ قرار دیتے ہیں اور ایک نظم تخلیق کرتے ہیں۔

''گردیت پہ بال ٹیٹوف'' یعنی''اڑ کر چلتا ہے ٹیٹوف''۔

گردیت پہ بال ٹیٹوف بیگواتیں آسمان ءَ
علم و ھنر ا رس ءَ گوازیتہ کل جہان ءَ

ترجمہ: آسمان کے اُس حصے میں جہاں ہوا نہیں ٹیٹوف اڑ کر چلتا ہے۔ علم و ہنر میں روس ساری دنیا سے آگے نکل گیا۔

' لکھنے، پڑھنے کے عمل کو میر گل خان نصیر نے اپنی روزمرہ کی معمولات کا حصہ بنا رکھا تھا۔ اپنے جیل کے زمانے کے ایام کا اپنی بیٹی گوہر ملک سے تذکرہ کرتے ہوئے کہتے تھے۔

''ہمارے پاس کاغذ تھے نہ قلم، سب چھین کے لے گئے تھے۔ میر غوث بخش بزنجو جب آئے تو ان کے پاس نہ جانے کیسے پنسل اور نوٹ بک تھی۔ یہ چیزیں ہم تینوں (میر گل خان نصیر، غوث بخش بزنجو محمد حسین عنقا) نے تین جگہ بانٹ دیں اور پھر جب سپاہی سگریٹ کے خالی ڈبے پھینکتے، میں انھیں اٹھا کر برابر برابر کھولتا اور ان پر''پری'' کی باتیں لکھتا۔ (بابا اپنی شاعری کی آمد کو پری سے تشبیہ دیتے تھے۔) انھیں پھر اپنی تکیے کے اندر رکھ دیتا تاکہ کوئی نہ دیکھ لے۔ ایک دن میرے اپنے ایک عزیز میر فتح خان بولازئی جو فوج میں تھے اور ہمارا نگران بھی، نے میری پنسل دیکھ لی۔ میں نے اُس

کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ دیکھ فتح خان یہ مجھ سے مت چھینا پھر اُس نے یہ اچھائی کی کہ مجھ سے پنسل نہیں چھینی۔"(93)

بلوچستان کو صوبائی حیثیت ملنے کے بعد جب بلوچستان میں نیپ اور جمعیت اللعمائے اسلام کی مخلوط حکومت بنی تو اُس میں میر گل خان نصیر سینئر وزیر بنا دیئے گئے، ان کے پاس دوسرے محکموں کے علاوہ تعلیم کا محکمہ بھی تھا۔

انھوں نے تعلیمی اصلاحات کیلئے کافی کاوشیں کیں۔ وہ ایک بات پر بہت زور دیتے تھے کہ بچے اپنی مادری زبان میں ہی بہتر طور پر تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ مجاہد بریلوی کو اپنے ایک دیئے گئے انٹرویو میں میر صاحب کہتے ہیں۔

"آج تو ہمارے صوبے میں ٹیلی ویژن بھی آ گیا ہے مگر ٹیلی ویژن میں ہمارے لوگوں کے لیے پروگرام نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ ابلاغ عامہ پر قابض افراد کے ذہن میں چونکہ مقاصد واضح نہیں ہیں اس لیے ان سے ہماری زبان اور ادب کی ترقی نہیں ہو سکی۔ بلوچی زبان اور ادب کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے اسکولوں میں رائج کیا جائے اور ساتھ ہی بلوچی کو وہ مقام ملے جو اُردو کو حاصل ہے اور اُردو کو وہ مقام

حاصل ہو جو انگریزی کو ہے" (94)۔

میر گل خان نصیر مادری زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے ایک واضح موقف رکھتے تھے۔ اگر انھیں حالات اجازت دیتے تو یقیناً وہ بہت سی مثبت اصلاحات تعلیم کے میدان میں لاتے اور جنکے دوررس نتائج بھی برآمد ہوتے مگر ایسا نہیں ہونے دیا گیا۔ نو مہینے میں نیپ کی منتخب قیادت کو اقتدار سے ہٹا دیا گیا اور اُنھیں مختلف الزامات لگا کر پابند سلاسل کر دیا گیا۔

وفات:

اگست ۱۹۸۳ میں میر گل خان نصیر بیمار پڑ گئے۔ اُنھیں بخار کے ساتھ کھانسی بھی تھی۔ گھر میں علاج کے دو تین دن بعد ان کی بخار تو اتر گئی مگر کھانسی کا سلسلہ برقرار رہا۔ نومبر ۱۹۸۳ کے مہینے میں اُنھیں پھر بخار ہوا اور ساتھ ساتھ ان کی کھانسی میں بھی شدت پیدا ہوگئی۔ ان کے گھر والے اور عزیز و اقارب انھیں علاج کی غرض سے کراچی جانے پر آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں مان رہے تھے۔ پھر انھیں بڑی مشکلوں سے کوئٹہ کے سی ایم ایچ تک چلنے پر راضی کر لیا گیا۔ جہاں کرنل زہیر نے ان کا معائنہ کیا اور ان کیلئے

دوہفتوں کی دوائیاں تجویز کیں۔ دوہفتے تک دوائیاں استعمال کرنے کے بعد انھیں ایک مرتبہ پھر سی ایم ایچ لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے مزید معائے کے بعد کینسر کا شبہ ظاہر کیا اور ساتھ ساتھ مرض کی صحیح تشخیص کیلئے انھیں کراچی جانے کا مشورہ دیا۔ وہ تب بھی کراچی جانے کیلئے تیار نہیں تھے مگر اپنے اہل و عیال کی ضد کے سامنے اُنھیں گھٹنے ٹیکنے پڑے تب انھیں کراچی لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے کینسر کی تشخیص کی۔ جس وقت ڈاکٹروں نے اس جان لیوا مرض کی تشخیص کی اس وقت یہ مرض ان کے جسم میں پوری طرح پھیل چکی تھی اور اب ان کی زندگی کے محض چند دن رہ گئے تھے۔ (95)

کراچی میں ڈاکٹر اے اچ سعید نے انھیں مڈایسٹ میڈیکل سنٹر میں داخل کیا لیکن افاقہ ہونے کی بجائے ان کی طبیعت روز بروز بگڑنے لگی۔ ان پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوگئی جس پر انھیں ہسپتال کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں منتقل کیا گیا۔ (96)

میر گل خان نصیر پر بے ہوشی کی کیفیت ۴ دسمبر سے شروع ہوئی اور بے ہوشی کی ہی کیفیت میں ٦ دسمبر کی رات سوا گیارہ بجے منگل کے روز اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔ (97)

ان کی میت بذریعہ سڑک کراچی سے نوشکی لائی گئی۔ ے

دسمبر رات آٹھ بجے جب ویگن ان کی میت لے کر نوشکی پہنچی تو میت کو دیکھ کر لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور پورے علاقے میں صفِ ماتم بچھ گیا۔ ان کا جسدِ خاکی ایک چوبی تابوت میں تھا۔ سفید رنگ کے تابوت پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ تابوت کو ان کے گھر کے صحن میں اہلِ خانہ اور اقربا کی موجودگی میں کھولا گیا۔ وفات کو ۲۰ گھنٹے گزرنے کے باوجود ان کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی موجود تھی۔ ان کے گاؤں کے ایک غسال نے انھیں غسل دیا۔

تکفین کے بعد ان پر سرخ رنگ کی چادر ڈالی گئی جس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ میر گل خان نصیر کو کلی مینگل میں ان کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ لوگوں کی کثیر تعداد نے ان کے جنازے میں شرکت کی (98)۔

آخری آرام گاہ

باب اول

حواشی

1۔ بالمشافہ انٹریو۔ کرنل (ر) سلطان محمد خان مینگل ۔ کوئٹہ ۔ 14 نومبر 2000

2۔ اختر علی خان۔ بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد اول) 1994۔ ص 180+179

3۔ ایضاً۔ ص175۔

4۔ میر غوث بخش بزنجو۔ ''بلوچی زبان کا بہت عظیم شاعر''۔ گل خان نصیر فن اور شخصیت (مرتبین) 1986۔ ص29۔

5۔ بالمشافہ انٹریو۔ کرنل (ر) سلطان محمد خان مینگل ۔ کوئٹہ ۔ 14 نومبر 2000

6۔ یوسف عزیز مگسی ۔ ''مظلوم ءِ توار نصیر۔ اولس ءِ شاعر نصیر'' تپتان۔ مئی جون 1990۔ ص28۔

7۔ میر گل خان نصیر۔ ''میں اور میرا فن''۔ میر گل خان نصیر فن اور شخصیت (مرتبین)۔ 1986۔ ص36۔

8۔آغا نصیر خان احمد زئی۔ ''ملک الشعراء میر گل خان نصیر'' میر گل خان نصیر فن اور شخصیت (مرتبین) 1986۔ص 36

9۔ بالمشافہ انٹریو۔ کرنل (ر) سلطان محمد خان مینگل ۔ کوئٹہ ۔ 14 نومبر 2000

10۔ملک فیض محمد یوسف زئی۔یادداشتیں۔ 1997۔ص158۔

11۔گوھر ملک۔''بابا''۔بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر 1984۔ص15۔

12۔ بالمشافہ انٹریو۔ کرنل (ر) سلطان محمد خان مینگل ۔ کوئٹہ ۔ 14 نومبر 2000

13۔گوھر ملک۔''بابا''۔بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر 1984۔ص18۔

14۔میر عاقل خان مینگل۔''چوزم مبئے کہ کس بجاھی'' تپتان۔مئی جون 1990۔ص70۔

15۔ بالمشافہ انٹریو۔ کرنل (ر) سلطان محمد خان مینگل ۔ کوئٹہ ۔ 14 نومبر 2000

16۔گوھر ملک۔''بابا''۔بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر 1984۔ص15

17۔گوھر ملک۔''یا تانی پاھار''۔تپتان۔مئی جون 1990۔ص66۔

18۔عبداللہ جان جمالدینی۔''گل خان نصیر کی شاعری''۔ میر گل خان نصیر

شخصیت شاعری اور سیاست ۔ 1993 ۔ ص 51

19 ۔ پروفیسر ڈاکٹر فردوس انور قاضی ۔ ''گل خان نصیر کی یاد میں'' غیر مطبوعہ مقالہ۔

20 ۔ لال بخش رند ۔ ۔ ''میر گل خان نصیر شاعر انقلاب'' ۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست ۔ 1993 ۔ ص 48

21 ۔ لال بخش رند ۔ ۔ ''میر صاحب کی چند یادیں'' ۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست ۔ 1993 ۔ ص 72

22 ۔ گوهر ملک ۔ ''یا تانی پا ھار'' ۔ تپتان ۔ مئی جون 1990 ۔ ص 67 ۔

23 ۔ گوهر ملک ۔ ''بابا'' ۔ بلوچی دنیا ۔ ملتان ۔ دسمبر 1984 ۔ ص 17 + 18

24 ۔ ایضاً

25 ۔ ایضاً

26 ۔ بالمشافہ انٹریو ۔ یوسف عزیز مگسی ۔ کوئٹہ 17 دسمبر 1997 ۔

27 ۔ بالمشافہ انٹریو ۔ کرنل (ر) سلطان محمد خان مینگل ۔ کوئٹہ ۔ 14 نومبر 2000

28 ۔ مولوی محمد عمر ۔ ''گل خان نصیر میرے پرانے دوست'' ۔ گل خان نصیر فن اور شخصیت (مرتبین) 1986 ۔ ص 71 ۔

29۔ رحیم بخش آزاد۔ ''عوامی انقلابی اور عہد آفرین شاعر''۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست 1993۔ ص 113۔

30۔ بالشافہ انٹریو۔ کرنل (ر) سلطان محمد خان مینگل۔ کوئٹہ۔ 14 نومبر 2000

31۔ ایضاً۔

32۔ بالشافہ انٹرویو۔ یوسف عزیز مگسی۔ 17 دسمبر 1997۔ کوئٹہ

33۔ میر عاقل خان مینگل۔ ''شاعری ءِ شرگداری''۔ ماہنامہ بلوچی۔ کوئٹہ۔ دسمبر 1987۔ ص 16

34۔ لال بخش رند۔ ''میر صاحب کی چند یادیں''۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔ 1993۔ ص 79۔

35۔ گوہر ملک۔ ''یا تانی پاھار''۔ تپتان۔ مئی جون 1990۔ ص 67+68۔

36۔ ایضاً۔ ص 68۔

37۔ ملک فیض محمد یوسف زئی۔ ''رفیق اور دوست گل کی یادیں اور باتیں۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔ 1993۔ ص 29

38۔ گوہر ملک۔ ''بابا''۔ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ دسمبر 1984۔ ص 16

39۔ گوہر ملک۔ ''یا تانی پاھار''۔ تپتان۔ مئی جون 1990۔ ص 63۔

40۔ایضاً۔

41۔لال بخش رند۔۔"میر صاحب کی چند یادیں"۔میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔1993۔ص75۔

42۔گوھر ملک۔"بابا"۔بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر1984۔ص15

43۔ایضاً۔ص17۔

44۔گوھر ملک۔"یا تانی پاھار"۔تپتان۔مئی جون1990۔ص63۔

45۔گوھر ملک۔"بابا"۔بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر1984۔ص15

46۔ایضاً۔17۔

47۔گوھر ملک۔"یا تانی پاھار"۔تپتان۔مئی جون1990۔ص65۔

48۔میر عاقل خان مینگل۔"چوزم مبے کہ کس بجاھی"۔تپتان۔مئی جون 1990۔ص70۔

49۔گوھر ملک۔"بابا"۔بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر1984۔ص18

50۔آغا نصیر خان احمد زئی۔"ملک الشعراء میر گل خان نصیر" میر گل خان نصیر فن اور شخصیت 1986۔ص35

51۔میر گل خان نصیر۔تاریخ بلوچستان (جلد اول دوئم)۔1986۔ص 440۔

52۔ مولوی محمد عمر۔ ''گل خان نصیر میرے پرانے دوست''۔ گل خان نصیر فن اور شخصیت۔ 1986۔ ص 68۔

53۔ میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (جلد اول دوئم)۔ 1986۔ ص 469۔

54۔ ایضاً۔

55۔ ملک فیض محمد یوسفزئی۔ ''رفیق اور دوست گل کی یادیں اور باتیں''۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔ 1993۔ ص 25۔

56۔ میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (جلد اول دوئم)۔ 1986۔ ص 462۔

57۔ ملک فیض محمد یوسفزئی۔ ''رفیق اور دوست گل کی یادیں اور باتیں''۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔ 1993۔ ص 26۔

58۔ ملک فیض محمد یوسفزئی۔ یادداشتیں۔ 1997۔ ص 86۔

59۔ ایضاً۔

60۔ میر عاقل خان مینگل۔ ''چو زم مبئے کہ کس بجاھی''۔ تپتان۔ مئی جون 1990۔ ص 70۔

61۔ بالمشافہ انٹرویو۔ یوسف عزیز مگسی کوئٹہ۔ 17 دسمبر 1997۔

62۔میر عاقل خان مینگل ''چوزم مبئے کہ کس بجاھی۔ تپمان مئی جون 1990۔
ص 71۔

63۔بالمشافہ انٹریو۔ یوسف عزیز مگسی۔کوئٹہ۔17۔دسمبر 1997۔

64۔میر عاقل خان مینگل ۔''چوزم مبئے کہ کس بجاھی۔ تپمان ۔ مئی جون
1990۔ص۔70۔

65۔بالمشافہ انٹریو۔ یوسف عزیز مگسی۔کوئٹہ۔17۔دسمبر 1997۔

66۔لال بخش رند۔میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔1993 ص
82۔

67۔میر گل خان نصیر۔داستان دوستین و شیرین۔1964 ص 7۔

68۔ایضاً۔

69۔میر عاقل خان مینگل ۔''منی نا کو شکارانی''۔ماہنامہ بلوچی کوئٹہ۔دسمبر
1986۔۔ص 75۔

70۔گوھر ملک۔'' بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر 1984۔ص 16۔

71۔میر عاقل خان مینگل ۔''منی نا کو شکارانی''۔ماہنامہ بلوچی کوئٹہ۔دسمبر
1986۔۔ص 75۔

72۔گوھر ملک۔''گلگ نمدی'' ماہنامہ بلوچی کوئٹہ۔دسمبر 1986 ص۔35۔

73۔لال بخش رند۔میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔1993ص 72۔

74۔عبدالکریم شورش۔نوکیں دور۔کوئٹہ۔13 فروری 1968۔ص 8

75۔ایضاً۔

76۔میرِ عاقل خان مینگل۔''چو نزم مبئے کہ کس بجاھی۔ تپتان۔مئی جون

1990۔ص۔70+71۔

77۔ماہنامہ بلوچی۔کوئٹہ۔دسمبر 1986۔بیک ٹائیٹل۔

78۔میر گل خان نصیر۔گرند۔1971۔ص 90۔

79۔گوھر ملک۔''یا تانی پاھار''۔تپتان۔مئی جون 1990۔ص 65۔

80۔بالمشافہ انٹریو۔یوسف عزیز مگسی۔کوئٹہ۔17 دسمبر 1997۔

81۔گوھر ملک۔''یا تانی پاھار'' تپتان۔مئی جون 1990۔ص 66۔

82۔ایضاً۔

83۔غیر مطبوعہ خط بنامِ محمد یوسف عزیز (مگسی)

84۔غیر مطبوعہ خط بتاریخ 19 اکتوبر 1964۔بمقام کراچی۔

85۔گوھر ملک۔''یا تانی پاھار''۔تپتان۔مئی جون 1990۔ص 66۔

86۔گوھر ملک۔''بابا''۔بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر 1984۔ص 17

87۔گوھر ملک۔''یا تانی پاھار''۔تپتان۔مئی جون 1990۔ص 66۔

88۔میر گل خان نصیر۔گرند۔1971۔ص82

89۔مجاھد بریلوی۔بلوچستان مسئلہ کیا ہے۔1984۔ص100

90۔لال بخش رند''میر گل خان نصیر، شاعر انقلاب''۔میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔1993۔ص70۔

91۔گوھر ملک۔''بابا''۔بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر1984۔ص16

92۔میر گل خان نصیر۔گرند۔1971۔ص58

93۔گوھر ملک۔''یاتانی پاھار''۔تپتان۔مئی جون1990۔ص64+65۔

94۔مجاھد بریلوی۔بلوچستان مسئلہ کیا ہے۔1984۔ص101

95۔گوھر ملک''بابا''بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر1984۔ص16۔

96۔گوھر ملک۔''یاتانی پاھار''۔تپتان۔مئی جون1990۔ص68۔

97۔روزنامہ جنگ۔کوئٹہ۔7دسمبر1983۔

98۔روزنامہ مشرق۔کوئٹہ۔8دسمبر1983 ۔

باب دوئم

اِدیب اور شاعر

1۔ ادبی سرگرمیوں کا آغاز

1.1 ادبی تنظیموں سے وابستگی

2۔ ادب کے بارے میں نظریات

3۔ نثر نگاری

3.1۔ مکاتیب میر گل خان نصیر۔

3.2۔ دانشِ نصیر (اقوال و پیام)

4۔ ایام اسیری میں تحقیقی و تخلیقی کارنامے

5۔ بلوچی ادب میں مقام

6۔ شاعری

6.1۔ شعری ماخذ

6.2۔ جدید شعری ادب پر میر گل خان نصیر کے اثرات

6.3۔ گل خان نصیر کی شاعری اور ناقدین

ادبی سرگرمیوں کا آغاز:

کچھ لوگوں کے متعلق یہ فقرہ صادق آتا ہے کہ ''فلاں بندہ پیدائشی شاعر تھا یا ہے'' اسی طرح میر گل خان نصیر پر بھی اس جملے کا اطلاق ہوتا ہے اور ہم گل خان نصیر کو بھی پیدائشی شاعر قرار دے سکتے ہیں۔

''مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کب شاعری شروع کی البتہ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نے پانچ جماعت پڑھنے کے بعد شعر لکھنا شروع کر دیا۔ اس وقت کے اشعار سے کئی اب تک موجود ہیں اور بعض اشعار کو میں نے نئے سرے سے دیکھنے اور پرکھنے کے بعد جلا ڈالا جو مجھے پسند نہیں (1)

میر گل خان نصیر کی امی انھیں پیدائشی شاعر قرار دیتی ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق میر گل خان نصیر پانچ سال کے تھے جب انھوں نے اپنے گھر میں دری بنوانے کیلئے ایک عورت بلائی تھی جسکا نام تاجی تھا۔ گل خان نصیر کی امی نے اس عورت کو کچھ کھجوریں دیں تب میر گل خان نصیر بھی کھڑے تھے۔ انھوں نے بے ساختہ کہا۔

''بلہ تاجی ہرف دانا باجی''

ترجمہ: لے لو اپنی باجی نانی تاجی

ان کے گھر میں ایک نوکرانی تھی جسکا نام ماہو تھا۔ ایک دن جب میر گل خان نصیر کی امی اسے روٹیاں دے رہی تھیں تو ساتھ میر گل خان نصیر بھی کھڑے تھے۔ انھوں نے چار چپاتیوں کے اندر ایک اور آدھی چپاتی رکھ دی اور ماہو کو دے دیئے۔ گل خان نصیر کہنے لگے۔

''چار چپٹی کپ تل ئی ایتہ ماہونہ بغل ئی''

ترجمہ: چار چپاتی اور آدھی چپاتی ان کے اندر، دیدو ماہو کے بغل میں۔(2)

یہ زمانہ جسکا ہم نے ذکر کیا میر گل خان نصیر کیلئے فی البدیہہ اشعار کہنے کا زمانہ تھا اور ان میں شعور کا عمل دخل کم تھا یا بالکل نہیں تھا۔ یہ میر گل خان نصیر کی کم سنی کا زمانہ تھا لیکن علاقائی اور عالمی سطح پر تبدیل ہوتی ہوئی صورتحال نے ہر حساس ذہن کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ میر گل خان نصیر کی بھی سوچوں میں وسعت آ گئی۔ نوشکی سے کوئٹہ اور پھر کوئٹہ سے لاہور کے سفر نے اس وسعت اور حساسیت کو مزید گہرائی اور گیرائی عطا کی۔ اس خطے میں انگریزوں کی حاکمیت، اپنی محکومیت اور مقامی استحصالی طبقے کے ظلم و جبر نے میر گل خان نصیر کے ذہن میں مثبت اثرات مرتب کیئے۔ تب انھوں نے اپنے خیالات کو شعر کا جامہ پہنایا۔

"نصیر نے یہ گیت اس وقت تخلیق کیے جب روئے زمین پر عہد پارینہ اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور ایک نیا عہد اسکی جگہ لینے کیلئے آگے کی طرف رواں تھی۔ تاریخ میں نئے اور بڑے انقلابات جنم لے رہے تھے۔ روس کے عظیم انقلاب کی ہوا تازہ تھی۔ نیند گراں میں ڈوبے ہوئے چینی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ھندوستان میں نئی صبح کی ظہور کیلئے حالات سازگار تھے۔ افریقہ کے لوزدہ سرزمین کے شعلوں نے وہاں کے لوگوں کے دلوں میں شعور کا دیا جلا دیا تھا۔
غلے کی سرزمین لاطینی امریکہ آزادی کے متوالوں کے پیروں تلے لُردھ ہو چکی تھی۔ انقلابات کے اس دور میں نصیر نے اپنی بے چین دل اور تپتی ہوئی روح کی آواز کو اشعار کے قالب میں ڈھال لیا اور اپنی چھینی گئی آزادی کا مطالبہ کیا۔ اور بلوچوں کو للکار کر انھیں جگایا۔" (3)

ایک طرف لاہور کی سیاسی اور ادبی فضاء تھی اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات تھے تو دوسری طرف بلوچستان میں ترقی پسندانہ سیاسی سرگرمیوں کا آغاز تھا۔ ان صورتحال نے میر گل خان نصیر کو تحریک دی کہ وہ بھی جدوجہد میں اپنا حصہ شامل کرلے۔ تب انھوں نے اپنی شاعری کی ابتداء اردو سے کی اور تحریک میں ایک کارکن کی حیثیت سے شامل رہے یوں ان کی شاعری اور سیاست ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ (4)

لیکن اردو چونکہ میر گل خان نصیر کی مادری زبان نہیں تھی اس لیے اپنے جذبات کے بھرپور اظہار میں اردو کا دامن ان کیلئے تنگ پڑ رہا تھا اور چونکہ اسکے مخاطب ایک ایسی مفلوک الحال قوم تھی جو اردو سے نابلد تھی اس لیے انھوں نے شعر کہنے کیلئے اپنی مادری زبان کا انتخاب کیا۔

"ابتداء میں تو اُردو سے کام چلتا تھا مگر جب جزبات کے بھرپورا ظہار کی ضرورت پڑی تو مادری زبان میں شعر کہنے لگے" (5)

وہ کون سے حالات تھے۔جنھوں نے میر گل خان نصیر کو بلوچی کی طرف راغب کیا؟ اس صورتحال کا نقشہ عبداللہ جان جمالدینی اسطرح کھینچتے ہیں۔

"۔۔۔ایک دفعہ گل خان نصیر نے خود مجھے بتایا کہ چارسدہ (پشاور) میں عبدالغفار خان کے سرخ پوشوں نے ایک اجلاس طلب کی تھی جس میں پشتون شعراء کے پشتو کلام سننے کے بعد انھیں اپنی مادری زبان بلوچی میں شعر کہنے کی تحریک ملی۔ گل خان جو ایک شاعر کے طور پر مشہور تھے انھیں یہیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ پشتون شاعر اپنی ہی مادری زبان میں شعر کہہ رہے ہیں جبکہ انھیں بھی اپنی مادری زبان میں شعر کہنا چاہیئے۔ وہیں انھوں نے اپنی پہلی بلوچی نظم "بیا او بلوچ" تخلیق کی یہیں سے میر گل خان نصیر کی بلوچی شاعری کی ابتداء ہوتی ہے۔میر گل خان نصیر کے جمع کیے گئے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ پہلا بلوچی

شعر انھوں نے سردریاب پشاور میں سرخ پوشوں کے کیمپ میں ۵ جنوری ۱۹۴۲ کو تخلیق کی۔ (6)

اسطرح میر گل خان نصیر کی بلوچی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ بلوچی میں شاعری کرتے ہوئے انھیں اس بات کا بہت جلد احساس ہو جاتا ہے کہ بلوچی زبان ایک وسیع زبان ہے اور اس میں ہر ایک مضمون آسانی سے ادا کی جا سکتی ہے (7)

میر گل خان نصیر اس بات کا اچھی طرح ادراک رکھتے تھے کہ زندگی کی حقیقتوں سے دور اور انسانی رشتوں سے لاتعلق رہ کر ان کی شاعری نمو نہیں پا سکتی۔ اس لیے جب انھوں نے اپنی پہلی بلوچی نظم ''بیا او بلوچ'' تخلیق کی تو اس نظم میں انھوں نے اپنی شاعری کی شعوری سمت کا تعین بھی کر لیا۔ وہ نہ صرف اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے سے آگاہ تھے بلکہ اپنی کلاسیکل شعری روایتوں سے بھی انھوں نے استفادہ کیا۔ میر گل خان نصیر کی یہ کوشش دراصل شعوری طور پر ادب کو اپنے عہد کے سماجی عمل کے ساتھ جوڑنے کی کوشش تھی اور ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ شاعری کا ایک معاشرتی عمل بھی ہوتا ہے یعنی افراد معاشرہ شاعری کی سطح پر ایک دوسرے

کے تجربات میں شریک ہوتے ہیں اور یوں انھیں ایک نئے شعور کی آ گاہی حاصل ہوتی ہے۔ جس سے یا تو وہ اب تک بے خبر تھے یا پھر ان پر یہ واضح نہیں تھا۔

''بیا او بلوچ'' بلوچی شاعری میں فکری رویّوں کا نقطۂ آغاز تھا۔ ایک ایسا آغاز کہ جس نے بلوچوں کی ایک غالب اکثریت کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

۱۹۵۱ میں میر گل خان نصیؔر کا پہلا شعری مجموعہ ''گلبانگ'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ بلوچی شاعری پر مبنی یہ کسی شاعر کا پہلا شعری مجموعہ تھا جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔

اس شعری مجموعے کی ابتداء ایک دعا سے ہوتی ہے جس میں میر گل خان نصیؔر ایک آئیڈیل کردار کیلئے اللہ تعالیٰ کے حضور دست بہ دعا ہیں۔

''اے خداوندا بلوچان ءَ چشیں مردم بدئے
پُردماغ وجان شاروزندہ دل روشن خیال
فکر آوانی بہ بیت چوتازگ ووشیں چرک
عقل جو سبزیں زرءِ پُرشوکتیں جاہ وجلال

سر بہ بیت خالی چہ کہنیں قصگ ءُ رسم و رواج
دپ بہ بی خندوک آوانی پہ ہر رنج و ملال
دل بہ بی مضبوط چو شکیں تلارے من زرءَ
بھیم و ترسے چج میاریت پر دلءَ گوات ءِ شمال
اے خداوندا بلوچاں من جہان ءَ زندہ کن
دشمنانش گم و گارو پر شتگ و شرمندہ کن

ترجمہ: ''اے خداوند۔ بلوچوں میں ایسے انسان پیدا کر جو صاحب عقل، زندہ دل، روشن خیال ہوں اور جان نثار کرنے والے بھی ہوں۔ انکی فکر تازہ ہو اور وہ ہوشیار ہوں۔ عقل میں وہ سمندر کی جاہ و جلال سے مشابہت رکھیں۔ قدیم بوسیدہ کہانیوں اور گلے سڑے رسم و رواج سے ان کا ذہن خالی ہو۔ مصیبت اور مشکلات کو ہنس کر سہہ لیں سمندر کے مضبوط پہاڑوں کی طرح دل ان کا مضبوط ہو، بادِ طوفان سے کسی طرح کا خوف و ڈر انھیں محسوس نہ ہو۔

اے خداوند۔ بلوچوں کو تا ابد زندہ رکھ۔ ان کے دشمنوں کو نیست و نابود اور شرمندہ کر۔'' (8)

اسی کردار کو آئیڈیل بنا کر میر گل خان نصیرؔ اپنی جدوجہد کا آغاز کرتا ہے کیونکہ یہی آئیڈیل کردار ہی ان کے آئیڈیل سماج کی تشکیل

میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے اور زندگی کے مثبت زاویوں اور رویئوں کو صحت مندانہ انداز میں ابھار سکتا ہے۔

بنیادی طور پر ہر حساس آدمی مثبت افکار اور ترقی پسند تحریکات سے اثر قبول کرتا ہے اسی طرح میر گل خان نصیرؔ نے بھی اپنے اردگرد کے حالات اور پھیلے ہوئے مثبت افکار سے اثرات قبول کیے۔ وہ نہ صرف علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے بلکہ ان کے بنیادی افکار اور علامہ اقبال کے افکار میں بہت یکسانیت بھی پائی جاتی ہے۔ علامہ اقبال مسلمانوں میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے جبکہ میر گل خان نصیرؔ بلوچوں میں تحریک پیدا کررہے تھے اپنی قوم اور وطن کیلئے قربانی کے جذبے کو ابھارنا، ترقی کیلئے اپنی کوششیں تیز کرنا، فرسودہ روایات کی بیخ کنی کرنا دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کرنا اور وسیع تر انسانیت کی فلاح کیلئے آواز بلند کرنا، علامہ اقبال اور گل خان نصیرؔ کے مشترکہ فکری مقاصد تھے۔ (9)

مجاہد بریلوی کے ساتھ اپنے ایک انٹرویو میں میر گل خان نصیر کہتے ہیں۔

"کچھ عرصہ علامہ اقبال سے متاثر رہا مگر ادب کے حوالے سے میں نے سب سے زیادہ اثر ۱۹۳۴ کی ترقی پسند ادب کی تحریک سے قبول کیا لیکن میرے خیال میں ایک شاعر جسے اپنی وطن اور قوم کا درد ہو سب سے زیادہ اثر

اپنے اطراف پھیلے ہوئے لوگوں کی بدحالی، پسماندگی اور قومی جبر سے قبول کرتا ہے۔ میری شاعری بھی بنیادی طور پر اپنے عوام کی مادی اور ذہنی پسماندگی اور ان سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کا عکس ہے۔'' (10)

تاریخی عمل اور عہد کے حالات ہر کسی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عام آدمی پر بھی اور کسی عالم و دانشور پر بھی لیکن ہر عہد میں لوگوں میں ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوئی ہیں جو خود تاریخی عمل اور عہد کے حالات پر اثر انداز ہوئی ہیں۔ وہ اپنی توانا فکری، کمالِ فن اور سچائی پر کامل یقین رکھنے کی وجہ سے انسان کے اجتماعی شعور کو متاثر کرتے ہیں۔ عظیم شاعر اور بڑے فنکار کا کمال یہ ہے کہ انسان ہونے کے ناطے وہ اپنے عہد کے معروضی حالات سے نہ صرف بہت زیادہ اثر قبول کر لیتی ہے بلکہ وہ اُس تاریخی عمل پر اپنے فکری اثرات بھی مرتب کر لیتا ہے۔ (11)

میر گل خان نصیر ریکی زنگی شاھی اور بالاچ گورگیج سے بہت متاثر تھے۔ بلوچی کے ان قوم پرور شعراء کے کلام نے ان کے دل میں بچپن سے ہی حب الوطنی کے جذبے کو سب سے زیادہ ابھارا تھا۔ وہ ہمیشہ ان کے کلام کو سننے اور ازبر کرنے کا مشتاق رہا۔ ریکی مینگل قبیلہ کے ریزوار (رزمیہ اشعار کہنے والا قبائلی شاعر) شاعر اور خانِ قلات میر خداداد خان کے دربار کے ملک

لشعراء گزرے ہیں۔ بالاچ گورگیج جس کو میر گل خان نصیر بلوچوں کا عظیم قوم پرور شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ابتدائے عمر سے ہی ان کے پسندیدہ شاعر رہے ہیں۔ ریکی کا طویل نظم ''وختی نصیر خانِ ولی'' اور بالاچ کی رزمیہ ''کوہ انت بلوچانی کلات'' ہمیشہ ان کے وردِ زبان رہی ہیں۔ ان شعراء کے کلام نے انکے دل پر جو نقش مرتب کیے بلاشبہ، عمر کے ساتھ ساتھ ان میں زیادہ گہرائی اور وسعت پیدا ہوتی رہی اور ان کا کینوس بڑھتا اور پھیلتا رہا۔ (12)

ان ابتدائی اثرات نے میر گل خان نصیؔر کی فکر میں نئی وسعتیں اور احساس میں نئی گہرائیوں کو جنم دیا جن کے نتیجے میں انکی شاعری نے زندگی سے دلچسپی کو گہرا اور بامعنی بنا دیا۔ انھیں اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ اگر تخلیق کار کا رشتہ قاری سے کٹ جائے تو اس کا ذہن بے معنویت کا شکار ہو جائے گا۔ میر گل خان نصیؔر چونکہ اپنی فکر کو بڑی فراخدلی کے ساتھ بانٹنا چاہتے تھے اور اپنے تجربات میں اپنے سننے اور پڑھنے والوں کو شریک کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اس مقصد کے حصول کیلئے انھیں اپنا مطالعہ بھی وسیع کرنا پڑا۔

''بلوچی کلاسیکل ادب (شاعری) پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مکران کے مشہور شعراء کے کلام ہمیشہ گل خان کی زبان پر ہوتے تھے۔ رحم علی

اور مست توکلی سے وہ بہت متاثر تھے۔ جام درک کے اشعار کے مطالعے سے گل خان کی شاعری میں ایک نئی موسیقیت ابھری تھی۔ گل خان عالمی پیمانے پر بھی ابھری ہوئی تحریکوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ اس صورتحال نے گل خان کی شاعری کو ایک توانا آہنگ اور ایک نئی تحریک دی۔ وہ فکری طور پر ابوالقاسم لاہوتی، ناظم حکمت، فیض احمد فیض، پبلو نرودا اور رسول حمزہ کے شانہ بشانہ چل رہے تھے۔(13)

اس طرح میر گل خان نصیر نے ابتداء ہی سے آزادی کے انقلابی تصور سے سرشار اور بنی نوع انسان کے سلسلے میں ذمہ دارانہ احساسات وخیالات کا بھرپور اظہار کیا۔

ادبی تنظیموں سے وابستگی:

ادبی تنظیمیں نہ صرف ادبی رویئوں ورجحانات کو ماپنے کا پیمانہ ہوتی ہیں بلکہ ان تنظیموں کی سرگرمیوں سے ادب میں جمود اور ترقی کے امکانات کا بھی اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کسی بھی زبان وادب کی نشونما کیلئے ادبی تنظیموں کا کردار بہت ہی اہم ہوا کرتا ہے۔

بلوچی ادب کی تاریخ کے صفحوں کو ٹٹولنے سے پتہ چلتا ہے

کہ میر گل خان نصیؔر سب سے ''بلوچی زبان ءِ دیوان'' سے منسلک رہے۔ وہ نہ صرف اس ادبی انجمن کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے بلکہ وہ اس کے پہلے صدر بھی منتخب ہو گئے۔ اس انجمن نے گل خان نصیؔر کے بلوچی اشعار کا پہلا مجموعہ ''گلبانگ'' بھی شائع کیا جسے جدید بلوچی شاعری کا نقطۂ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔(14)

۱۹۵۳ میں گل خان نصیؔر، غلام محمد شاہوانی، عبداللہ جان جمالدینی اور ان کے دیگر احباب نے اس ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی۔ کوئٹہ میں بلوچی زبان وادب کی ترقی وترویج کیلئے یہ پہلی ادبی انجمن تھی۔(15)

''بلوچی زبان ءِ دیوان'' کے ساتھ وابستگی میر گل خان نصیؔر کی پہلی ادبی وابستگی تھی۔ اس انجمن میں کریم شورش اور آزاد جمالدینی کے علاوہ کامل القادری اور زمرد حسین بھی شامل تھے۔

''یہ انجمن بلوچی زبان وادب کی ترویج وفروغ کیلئے قائم کی گئی تھی۔ اس انجمن کا دفتر اسٹنڈرڈ ہوٹل مشن روڈ کوئٹہ میں قائم کیا گیا جہاں گل خان نصیؔر رہائش پذیر تھے۔''(16)

میر گل خان نصیؔر اور ان کے احباب اس تنظیم کے توسط سے ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینا چاہ رہے تھے اور وہ اپنے اس مقصد میں کسی

08-07-1973۔ اسپیکر بلوچستان اسمبلی کے کمرے میں
میر گل خان نصیر اور عبدالکریم شورش
انھیں اسی دن سنٹرل جیل سے سینٹ کے انتخابات کیلئے لایا گیا تھا

حد تک کامیاب بھی رہے۔

اس کے علاوہ آس پاس میں جو ادبی سرگرمیاں جاری تھیں۔ میر گل خان نصیرؔ ان پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ انجمنِ ترقی پسند مصنفین سے بھی میر گل خان نصیر فکری وابستگی رکھتے تھے اور اس انجمن کے فعال اراکین سے وہ ہمیشہ رابطے میں رہتے تھے۔

۱۹۵۴ میں جب انجمنِ ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگ گئی تو اس کے مقابلے میں سرکاری ادبی تنظیمیں وجود میں آنے لگ گئیں۔ ''پاکستان رائٹرز گلڈ'' بھی انہی دنوں میں وجود میں آئی۔ دوسری طرف اس بات کو شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا کوئی متبادل وجود میں آئے۔

''سچے ترقی پسند لکھنے والے ''انجمنِ ترقی پسند مصنفین'' کی جگہ لینے کیلئے ایک ملک گیر ادبی تنظیم کے قیام کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ ان میں فیض احمد فیض، میر گل خان نصیرؔ، حسن حمیدی، ڈاکٹر حسان اور عنایت کاشمیری کے نام نمایاں ہیں۔

آخر کار فیض صاحب، نصیر، شیخ ایاز، اجمل خٹک، محمد ابراہیم جویو، حسن حمیدی، ڈاکٹر حسان اور عنایت کاشمیری نے باہم مشورے سے ''عوامی ادبی

انجمن'' کے قیام کا اعلان کر دیا۔ یہ ۱۹۶۷ کی بات ہے۔'' (17)

میر گل خان نصیر نہ صرف خود اس ادبی پلیٹ فارم سے سرگرم کردار ادا کر رہے تھے بلکہ انھوں نے اپنے ایک اور بلوچی کے ادیب سیف الرحمان مزاری کو بھی تعاون پر آمادہ کیا۔ اس انجمن کی پہلی تنظیمی کمیٹی کے اجلاس کی صدارت بھی میر گل خان نصیر نے کی۔ (18)

انجمن کے منشور پر میر گل خان نصیر نے سب سے پہلے دستخط کیے اور ساتھ ساتھ اس منشور کو بلوچی میں ترجمہ بھی میر گل خان نصیر نے کیا جو بنگلہ، پنجابی، سندھی، پشتو اور اردو کے ساتھ یکجا کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ (19)

اس انجمن کے بننے اور اسکے منشور کے مشتہر ہونے کے بعد اسٹبلشمنٹ کے حمایتی دانشور بہت پریشان ہو گئے۔ انھوں نے اپنے اپنے اخبارات اور رسائل میں انجمن پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے۔ ان الزامات کی نوعیت کچھ اسطرح تھی کہ انجمن کا منشور اردو پر مبنی ہے انجمن کے منشور میں اردو کو ''رابطہ زبان'' کا مقام دیا گیا ہے۔ اس میں پاکستان کو ''مختلف قوموں کا وطن'' قرار دیا گیا ہے۔ یعنی بنگالی، پنجابی، سندھی، پختون اور بلوچوں کی علیحدہ علیحدہ قومیں تسلیم کی گئی ہیں۔ انجمن کے بانی

اراکین ''محبِ وطن'' نہیں ہیں اور اس میں زیادہ تر میر گل خان نصیر کی دستخط کو ہدفِ تنقید بنایا گیا۔ اسکے باوجود عوامی ادبی انجمن قائم رہی اور اسکی مختلف شاخیں بھی تشکیل دی گئیں۔ بلوچی زبان و ادب کی شاخ کیلئے میر گل خان نصیر کو منتظم مقرر کیا گیا۔(20)

تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر میر گل خان نصیر انجمن کے کاموں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکے لیکن انھوں نے اپنا تعلق انجمن سے آخر وقت تک نبھائے رکھا۔(21)

میر گل خان نصیر مختلف ادبی سرگرمیوں میں شرکت کرتے تھے۔ جنرل رحیم الدین جو بلوچستان کے گورنر تھے۔ ان کی بیوی بیگم ثاقبہ رحیم الدین ادیبہ تھیں۔ اس نے کوئٹہ میں ''قلم قبیلہ'' کے نام سے ایک ادبی تنظیم بنائی تھی۔ وہ اپنے ادبی جلسوں میں میر گل خان نصیر کو دعوت دیتی تھیں اور میر گل خان نصیر ان ادبی جلسوں میں کبھی کبھار شرکت بھی کر لیا کرتے تھے مگر وہ قلم قبیلہ کے ممبر کبھی نہیں بنے۔(22)

میر گل خان نصیر جب اسلامیہ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے تب وہاں کالج کی طرف سے ایک میگزین ''کریسنٹ'' کے نام سے چھپتی تھی۔ میر گل خان نصیر غالباً اس کے ایڈیٹر یا سب ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔(23)

ادب کے بارے میں نظریات:

میر گل خان نصیر ادب اور شاعری کو سماجی عمل کا ایک ضروری جز سمجھتے تھے اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میر گل خان نصیر کی بیشتر شاعری اس وقت کے فکری رجحانات کی توسیع ہیں۔ جن اعلیٰ وارفع مقاصد کے حصول کیلئے میر گل خان نصیر سرگرم عمل تھے اپنی شاعری کو بھی کہیں کہیں ان مقاصد کے حصول کا انھوں نے ذریعہ بنایا۔

میر گل خان نصیر کے خیالات اور نظریات کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ان باتوں کو، ان حالات اور واقعات کو، ان تہذیبی قدروں کو سمجھا جائے جو میر گل خان نصیر کی شاعرانہ کردار کو بنانے اور سنوارنے میں بنیادی عوامل کا درجہ رکھتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ اس عہد اور عہد کے تقاضوں کو بھی سمجھنا ضروری ہے جس میں رہتے ہوئے میر گل خان نصیر کے تخلیقی جوہر وجود میں آئے، ان رجحانات ونظریات کی روشنی میں ان کے تخلیقات کی آبیاری ہوئی۔ جس طرح انسانی رویئے تاریخی عمل سے گزر کر تشکیل کے مرحلے تک پہنچتے ہیں بلکہ اسی طرح میر گل خان نصیر کے نظریات و خیالات کو دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ میر گل خان نصیر کے شعور اور

آ گہی کا دور جبر اور استحصال کا دور تھا، سچ کہنا بغاوت اور حق کی بات کرنا بہت بڑا گناہ تصور ہوتا تھا چونکہ وہ بنیادی اور فطری طور پر ایک حقیقت پسند اور حساس انسان تھے اس لیے ان کے مشاہدے اور مکالموں میں، احساس اور اظہار میں، کردار و گفتار میں، فکر اور عمل میں کسی بھی قسم کا تضاد نظر نہیں آتا۔ انھوں نے اگر اپنی شاعری میں گل و بلبل، حسن و عشق، بہار اور شراب، جنت اور حوروں کی بجائے ، جنگ ، مزاحمت، بغاوت اور انقلاب کے مضمون باندھے تو یہ حیرت کی بات نہیں کیونکہ یہ شاعری اس کے وجود میں پلنے والی سچائی کا اظہار ہے۔ دوٹوک اور واضح اظہار۔ (24)

اگر غور سے دیکھا جائے تو میر گل خان نصیؔر کے خیالات و نظریات صرف ایک انسان کے خیالات و نظریات نہیں ہیں بلکہ ایک پوری عہد اور دور کے نظریات و خیالات ہیں۔ اس وقت جب میر گل خان نصیر شعر وادب کے میدان میں وارد ہوئے تو ہر طرف قوم پرستی کے جذبات سر اٹھائے ہوئے تھے۔ ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی۔ آزادی کے متوالے آزادی کے ترانے گانے میں مصروف تھے اور بلوچستان میں شعوری سیاست کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان تمام صورتحال نے میر گل خان نصیر کے فکری سمت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا وہ استحصالی قوتوں کے خلاف مظلوم

طبقے کا حامی بن کر ابھرا اور انھوں نے ''ادب برائے ادب'' کے نظریے سے جڑنے کے بجائے ''ادب برائے زندگی'' کے نظریے کو اپنایا۔

''حقیقت یہ ہے کہ ادب کو سماجی عمل سے علیحدہ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا اور جو تحریکیں ادب کو سماجی عمل سے الگ کر کے محض مجرد اور فنی نقطۂ نظر سے اپنانے کی دعویدار بنتی ہیں اپنی معنویت سماج کے تیز رفتار عمل میں خود بخود کھودیتی ہیں۔ وہ ادب کو سیاسی، سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں سے الگ دیکھنا چاہتی ہیں۔ زندگی کے سنگین حقائق، عوام اور ان کے مسائل کو ادب وفن کیلیے مہلک سمجھتی ہیں۔ ایسے ادیب دراصل ادب وفن کو انقلابی تحریک کا ایک فعال حصہ بنانے کے بجائے جامد کلچر اور غلامانہ تہذیب وتمدن کا آلہ کار بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ نفس کی الجھنوں اور وجود کے چکر سے باہر نکلنے اور سماجی عمل کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھنے کا ان میں حوصلہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ ادیبوں اور شاعروں کو اپنے سماجی ڈھانچے کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ سماج کی طبقاتی تقسیم پر گہری نظر ڈالنی چاہیے۔ مختلف طبقوں کے حالات وکوائف، ان کے انداز فکر، ان کی نفسیات کا شعور اور ادراک حاصل کر کے اور ان تمام عوامل کا تجزیہ کر لینے کے بعد ہی بامعنی ادب تخلیق کی جا سکتی ہے۔'' (25)

میر گل خان نصیر جہاں ادب کو سماجی عمل کا ایک لازمی حصہ

سمجھتے تھے وہاں وہ ادب کو سیاسی، سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں کے تناظر میں دیکھتے تھے، زندگی کے سنگین حقائق، عوام اوران کے مسائل کوادب وفن کے لئے ضروری گردانتے تھے۔ انھیں اپنے سماجی ڈھانچے کے مطالعے کا شعور حاصل تھااس لئے وہ ادب اورفن کوانقلابی تحاریک کا یک فعال اورضروری حصہ بنانا چاہتے تھے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے وہ ''ادب برائے زندگی'' کے فلسفے کا حامی تھا۔ ''گرئند'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''ادب برائے ادب'' کی پیروی کرنی چاہیئے یا ''ادب برائے زندگی'' کی۔ ''ادب برائے ادب' یعنی وہ شاعری جو اظہار کے پیمانے کو صرف شیرین گفتاری تک محدود کردے بیکاروں کے لئے وقت گزاری کا ایک ذریعہ ہے یا پھر دنیاداروں کی بزمِ طرب کا ایک کھیل ہے۔ یا پھر محنت کشوں کوسلانے اورانھیں ان کے حقوق سے دست بردار کرانے کے مترادف ہے اس لئے میں ''ادب برائے ادب'' کوتسلیم نہیں کرتا۔ شاعری ونثر نویسی یا ادب وہ ہے جوزندگی کی جدوجہد میں عوام کامددگارثابت ہو۔'' (26)

اپنی شاعری کی زبان کوموثر بنانے اور اپنے اظہار میں گہرائی و گیرائی پیدا کرنے کیلئے ناقدین عشق کے عنصر کو بہت ہی اہم سمجھتے ہیں۔ یہ عشق مختلف نوعیت وکیفیت میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ میر گل خان نصیر اس

فلسفے کو تسلیم کرتے ہیں۔

''شاعری عشق کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ جہاں تک عشق کا تعلق ہے، وہ کسی ایک شے کیلئے مخصوص نہیں۔ کائنات کے بیسیوں مناظر ایسے ہیں جن کو دیکھے یا ان دیکھے شاعر پر ایک گونہ بے خودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بیسیوں حقیقتیں ایسی ہیں، جن سے عشق کی شعاعیں پھوٹتی اور شاعر کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں بچپن سے ہی اپنی مادری زبان میں شعر کہتا رہا ہوں۔ مجھے اپنی قوم اور وطن سے عشق ہے۔ وطن سے محبت کا جزبہ بالکل ایسا ہی غیر ارادی اور فطری ہوتا ہے جیسے کہ اولاد کو اپنی ماں سے لگاؤ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، اولاد کو جو پرورش ماں سے ملتی ہے، وہی ایک قوم کو اس کی سرزمین یا مادرِ وطن سے حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح ماں کی محبت سے اولاد کا دل خالی نہیں ہوتا اسی طرح وطن کی محبت بھی ہر دل میں موجود ہوتی ہے، البتہ کمی و بیشی کا دونوں صورتوں میں امکان رہتا ہے۔''(27)

میر گل خان نصیر کی شاعری میں عشق کی اس کیفیت کو سب سے زیادہ محسوس کیا جا سکتی ہے۔

میر گل خان نصیر اظہار کو الجھاؤ کا نہیں بلکہ ابلاغ کا ذریعہ سمجھتے

تھے۔اس نظریے کے پیش نظر وہ عوام سے عوام کی زبان میں اظہار کے قائل تھے۔جدید شاعری کو جہاں مختلف نوعیت کی تحاریک کا سامنا کرنا پڑا وہاں یہ بحث بھی سامنے آ گئی کہ فن کار قاری کا محتاج ہے یا نہیں؟

”جدید ترین شاعری میں جہاں صرف اپنے ذات کے حوالے سے بات کی جاتی ہے یا ایسے علائم واشارات سے کام لیا جاتا ہے، جن کے معنی کی کلید خود نظم یا شعر کے اندر ہی موجود نہ ہو وہاں ابلاغ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،اس لئے شعر وجود ہی میں نہیں آتا اور اگر یہ کہا جائے کہ فن کار کسی قاری کا محتاج نہیں تو ایسی نظمیں یا غزلیات چھپوانے کا مقصد کیا ہے جو کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔اشاعت خود اس بات کی دلیل ہے کہ فن کار چاہتا ہے کہ لوگ اس کی واردات کی نوعیت کو سمجھیں۔اور تعبیر میں لاکھ اختلاف ہو۔نقاد یہ ضرور کہیں کہ فن پارہ، نظم یا غزل اچھی ہے۔ ہاں اس کیلئے نقاد کا صاحب ذوق سلیم ہونا ضروری ہے تاکہ کروچے کے الفاظ میں وہ اپنے آپ کو مصنف سے ذہنی سطح پر ہم آہنگ پائے اور اس کے تجربے کا تخلیقی اعادہ کر سکے۔“(28)

میر گل خان نصیر نے اس نظریے کے بجائے کہ قاری کو اپنی سطح تخلیق کار کے ذہنی سطح کے برابر لانی چاہئے،اس نظریے کو اپنایا کہ تخلیق کار قاری کو اپنے

تجربے کا حصہ بنا کر اسے اپنے قلبی اور ذہنی واردات میں شامل کر لے اس طرح قاری کا ذہنی سطح بھی آہستہ آہستہ بڑھتا اور بلند ہوتا جائے گا۔

''ادب جب نئی شاہراؤں پر آگے بڑھنے کی سعی کرتا ہے تو ایسے مراحل بھی پیش آتے ہیں جب شاعری ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اپنے وجدان کی تسکین چاہتا ہے اور بسا اوقات وجدان ہی صحیح رہنمائی کا کام دیتا ہے لیکن اس کے باوجود عوام کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس لئے جدید تصورات کو عوام کے قابلِ فہم زبان میں پیش کرنے کی ضرورت ہے ورنہ دورِ حاضر کا ادب مستقبل کیلئے تو شاید کار آمد ثابت ہو سکے لیکن دورِ حاضر اس سے پورا پورا استفادہ نہیں کر سکے گا۔''(29)

میر گل خان نصیر شاعری میں نہ صرف مثبت تبدیلیوں کے قائل تھے بلکہ وہ مختلف تحاریک سے اثرات قبول کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے تھے مگر وہ اس صورتحال کو اپنانے میں اپنی بنیادیں ڈھانے کیلئے تیار نہیں تھے۔ وہ بلوچی شاعری کے روایتی رنگ کہ جس میں زورِ بیان، بے ساختہ پن، سادگی، روانی، حقیقت پسندی، آمد اور نغمگی جیسی خوبیاں شامل ہیں سے مزین تخلیقات کا خواہاں اور حامی تھا۔ وہ شعری ادب میں تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ وہ دورِ حاضر کے ادب کا ماضی سے ناطہ جوڑنے کے

حق میں تھے۔

''میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اور آج کے سرمایہ دارانہ نظام کے تناظر میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان سے ہم بھی متاثر ہوں گے۔ ہماری زندگی کے تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا پہلو بدل جائے گا۔ زبان میں نئے نئے الفاظ داخل ہوں گی، نئے ضرب المثال وجود میں آئیں گے، الفاظ کے معنی بدل جائیں گے، روزمرہ کی زبان متاثر ہوگی، اشعار کے پرانے اصول ترک کر دیئے جائیں گے اور اظہار کے نئے وسیلے منظر عام پر آجائیں گے۔ یہ ہونے والی باتیں ہیں اور ہو کر رہیں گی۔ ہم جتنا اس صورتحال کو روکنا چاہیں لیکن وقت اور حالات کے تپیڑوں کو نہ ہم روک پائیں گے اور نہ دوسرے اقوام ان کو روک سکے ہیں۔

زبان وادب کو ان حالات کا سامنا کرنا ہے اور ہمیں یہ سب بہ خوشی قبول کرنی چاہئیں لیکن دنیا کے دوسرے ممالک میں کہ جہاں دانشور اور صاحبِ علم شعراء اور نثر نگار بیدار ہیں۔ یہ طوفانی ہوائیں ان کے قدم ان کی گلزمین سے الگ کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ انھوں نے بے شک شاعری اور نثر میں طرح طرح کے تجربوں کے محلات تعمیر کیے، نئے دور کے قمقموں سے انھیں روشن بھی رکھا۔ نئے تہذیب وتمدن کے رنگ برنگے پھولوں سے

انھیں مزین بھی کیا لیکن وہ اپنی شاعری کی بنیاد سے نہ کبھی ہٹے اور نہ انھوں نے اس بنیاد کو ڈھانے اور گرانے کی کوشش کی۔ اس تعمیر شدہ محل پر ہی انھوں نے اپنے اشعار کے نئے محل تعمیر کیے۔ ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے کیونکہ پرانی روایات کو یکسر مسترد کرنے اور انجان راستوں پر چلنے کیلئے فوراً آمادگی ظاہر کرنے سے ہم ایسی ڈگر پر چل پڑیں گے جس کا نہ کوئی پتہ ہے اور نہ منزل۔" (30)

وہ چونکہ اپنے خیالات اور تصورات کو عوام کے تجربات اور مسائل کا حصہ بنانا چاہتے تھے اس لئے انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اگر وہ اپنے اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اسے تاریخ کے تسلسل کو برقرار رکھنا ہے اور ان حقائق اور صورتحال کی نشاندہی کرنی ہے جن سے مفلوک الحال عوام کے دکھوں کا تھوڑا بہت مداوا ہو۔

"ایسا مناسب نہیں کہ ہمارے شعراء کے قدم اپنی گل زمین سے کٹ جائیں اور ان کی شاعری خلا میں، زمین اور آسمان کے بیچ لٹکتی ہوئی دکھائی دے۔ ہماری شاعری کو مکمل صورت میں نہ بے لگام ہونا چاہیئے اور نہ اپنی بنیادوں سے ہٹنا چاہیئے۔ (31)

ادب کو تنقید حیات کا درجہ دینے، ادب اور زندگی کے رشتوں کو باہم

استوار کرنے میں میتھو آرنلڈ کا نام سرِ فہرست ہے۔ آرنلڈ کے نزدیک شاعری کا منصب یہ تھا کہ وہ زندگی میں اعلیٰ اقدار کو مروج کرے۔ شاعری کا یہ منصب موضوع کی سنجیدگی اور اعلی اسلوب کا متقاضی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاعری انسانی تکمیل کے عظیم مقصد کو پورا کرسکتی ہے۔ اسی طرح ورڈز ورتھ کے خیال میں لوگوں کے احساس کی تنظیم عظیم شاعر ہی کر سکتے ہیں (32) شاعری انھیں نئے احساسات سے آگاہی دلاتا ہے، احساس کو شائستگی، پاکیزگی اور استقلال عطا کرتا ہے۔ دوسرے معنوں میں وہ احساسات کو فطرت سے ہم آہنگ کرتا ہے وہ ابدی فطرت جس سے تمام اشیا، کوتحریک ملتی ہے۔ میر گل خان نصیر کے ذہن میں اچھی شاعری اور اچھے شاعر کا کیا تصور تھا؟ جیل کے دنوں میں وہ یار محمد یار سے مکالمہ کرتے ہیں۔

''اچھا شعر وہ ہے جسے ایک عام آدمی پڑھ کر یا سن کر محسوس کرے کہ یہ شعر میرے ہی دل کا حال اور احساس کا ترجمان ہے یعنی شاعری زندگی کے لئے ہو اور زندگی کے محرومی حالات کی عکاس ہو اور شاعر محض عکاس نہیں ہوتا، نقاد بھی ہوتا ہے اور مبلغ بھی۔ وہ اپنے معاشرے میں جاندار اور زندہ قدروں کو شناخت کر کے ان کا ابلاغ کرتا ہے۔ معاشرہ اور ماحول کی تبدیلی سے شاعر کی حیثیت اور مقام بھی بدلتا رہتا ہے۔ شاعر اپنے ماحول کی عکاسی

کرتے رہتے ہیں اور جاندار قدروں کی ترجمانی بھی، غلط اقدار اور غلط مقاصد کے خلاف جدوجہد کرنا ایک سچے شاعر کا بنیادی فریضہ ہے۔" (33)

میر گل خان نصیرؔ کے خیال میں شاعر کے اشعار کا انتخاب ان کے پڑھنے والے کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح کوئی ماں اپنے بچوں سے کسی ایک کو منتخب نہیں کر سکتی بالکل اسی طرح ایک شاعر اپنے اشعار میں کوئی شعر منتخب نہیں کر سکتا کیونکہ شاعر کو اپنے تمام اشعار اولاد کی طرح پیارے اور عزیز ہوتے ہیں۔ شاعر اپنی موج میں مگن شعر کہتا رہتا ہے پسند اور ناپسند کا اختیار سننے والوں، سوجھ بوجھ رکھنے والوں اور دانشوروں کو ہے۔ (34)

ادب میں ایک بحث کافی عرصے سے چلی آ رہی ہے کہ شاعری فن یا آرٹ کے زمرے میں آ جاتی ہے یا نہیں اس بحث کے نتیجے میں دو مختلف مکتبِ فکر وجود میں آ چکے ہیں۔ ایک مکتب شاعری کو فن قرار دے کر اس کے جملہ فنی لوازمات پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے حق میں ہے۔ جبکہ دوسرا مکتب شاعری کو ایک خداداد ملکہ اور ایک لاہوتی استداد قرار دیتا ہے۔ اس نظریے پر عمل پیرا ہونے والوں کے خیال میں شاعری کی کیفیت الہامی ہوتی

ہے۔ یہ کسی ردیف قافیے کی پابند بھی نہیں ہوتی اور نہ علم العروض کا سیکھنا شاعر کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

''سارے قدیم یونانی شعرا کا یہ خیال تھا کہ وہ کسی دیوتا یا فن کی دیوی کے زیرِ اثر ایک قسم کی جنونی کیفیت یا آسیب زدگی کی حالت میں شعر کہتے ہیں۔ قدیم یونانی شاعر Pindar بھی اس بات کو مانتا تھا کہ شعراء کی بیرونی طاقت سے تحریک پا کر عالمِ وجد میں شعر کہتے ہیں۔ افلاطون نے اس نظریئے کو بھی اپنا لیا۔'' (35)

میر گل خان نصیر نے شاعری کے فن سے متعلق بہت کچھ پڑھا۔ فن برائے فن اور فن برائے زندگی کے کئی مباحث ان کی نظروں کے سامنے سے گزریں تب انھوں نے ان نظریات میں ایک توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے شاعری کو آرٹ یا فن نہیں سمجھا۔ ان کے خیال میں فن ایک سیکھنے کی چیز ہوتی ہے جسے کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب طے کر کے سیکھا جا سکتا ہے۔ ایک ہنر یا ایک حرفہ ہوتا ہے مگر شاعری سیکھنے کی چیز نہیں ہوتی۔

''شاعری ایک خداداد ملکہ، ایک لاہوتی استعداد اور ایک ایسی الہامی کیفیت ہوتی ہے جسے ہم وحی نہیں تو وحی کے مترادف کہہ سکتے ہیں۔ جو

شاعر کے دل پر نزول کرتی ہے اور اس کی زبان سے بے ساختہ الفاظ ، ایک مترنم روانی ، وزن اور ترتیب کے ساتھ پھوٹ پڑتے ہیں۔ شاعری ایک لدنی علم ہے جو کسی کو خدا کی طرف سے براہِ راست بغیر کسی استاد کے حاصل ہوتا ہے۔'' (36)

میر گل خان نصیرؔ اپنے اس خیال کو ثابت کرنے کیلئے جو انسال بگٹی کی مثال پیش کرتے ہیں جو ایک چرواہا تھا اور جسے علم العروض کا علم بھی نہیں تھا مگر انھوں نے اپنی مادری زبان بلوچی میں ایسے اشعار کہے ہیں جنھیں بے بدل قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو انسال کے علاوہ رحم علی مری، بجار، مست توکلی، گیدو سہیت اور ریکی زنگی شاہی وغیرہ بیسیوں ایسے شاعروں کا الہامی کلام ملتا ہے جو اگرچہ ان پڑھ تھے لیکن انھوں نے بلوچی میں گفتار کے ایسے موتی پروئے ہیں جن کی نظیر اب تک پیدا نہیں ہوئی ہے۔ (37) ان کے خیال میں جو شعرائے کرام علم العروض کی استعداد سے شعر کہتے ہیں وہ فنکار کہلاتے ہیں اور اس فن میں ردیف قافیے والی شاعری یا شاعر کیلئے علم العروض سیکھنے کی شرط بعد کی عالمانہ ایجادیں ہیں۔

''البتہ میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ بعض تعلیم یافتہ حضرات جو علم العروض پر مہارت تامہ حاصل کر چکے ہیں شعر کہتے اور شاعر کہلاتے ہیں

لیکن اس کی مثال اس باکمال اور صاحب فن سنگتراش کی ہوتی ہے جو مرمر کی سلوں سے ایک حسین پیکر تراش تو لیتا ہے لیکن اس میں جان نہیں ڈال سکتا۔ ان کے اشعار قواعدِ شعر کے مطابق بے عیب تو ضرور ہوتے ہیں لیکن ان میں سے وہ شے ناپید ہوتی ہے جسے اثر کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ عقل سے شعر کہتے ہیں دل سے نہیں۔(38)

میر گل خان نصیؔر اس تمام مرحلے میں علم کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ان کے خیال میں بے شک شاعری ایک ایسی دین ہے جو شاعر کو ودیعت کی جاتی ہے لیکن علم شاعری کے اس تپش میں تیزی لاکر اسے مزید بھڑکا سکتا ہے۔علم ہی سے شاعر کے احساس کی سمت کا تعین ہوتا ہے اور علم ہی اسے یہ بات سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی شاعری سے کس طرح کام لے۔شاعر سرمایہ داروں کی رنگین محفلوں کو خوبصورت بنانے میں ان کا معاون وآلہ کار بنے یا اپنی شاعری سے قوم،وطن اور محنت کش عوام کے مفاد کو خاطر میں لائے؟علم ہی اسے ایک مثبت فیصلے تک پہنچا سکتی ہے۔(39)

میر گل خان نصیؔر اس صورتحال کو آمد اور آورد کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ان کے خیال میں جو بات دل سے کہی جائے وہی آمد ہوگی اور جس بات کو کہنے کیلئے عقل کو استعمال میں لایا جائے تو یہ آورد کی کیفیت ہوگی

اسطرح دو مختلف کردار وجود میں آئیں گے ایک وہ جسے باقاعدہ شعر کی درد اٹھتی ہے اور وہ اسے جنم دیتا ہے۔ جب کہ دوسرا وہ جس کا کردار ماں کا نہیں بلکہ دائی کا ہوتا ہے۔ دائی اور ماں کے کردار میں کتنا فرق ہے؟ یہی فرق شاعر اور اشعار بنانے والوں کے مابین ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس فرق کو واضح کرنے کیلئے ہمارے پاس پیمانہ کیا ہونا چاہئے؟ میر گل خان نصیرؔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ''گرند'' کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں۔

ا۔ شاعر کے اشعار اس کے دل سے نکلتے ہیں جن میں سچائی اور یقین کی تپش ہوتی ہے اس لیے سننے والوں کے دلوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ شعر کہتے وقت جو کیفیت شاعر پر طاری ہوتی ہے۔ وہی کیفیت اس کے سننے والوں میں بھی آجاتی ہے لیکن اشعار بنانے والے لاکھ عالمانہ باتیں کہہ لیں مگر ان کے اشعار میں وہ چاشنی نہیں ہوتی جس کا اثر دل پر پڑے۔

۲۔ شاعر کے اشعار کبھی چشمے کی طرح رواں دواں، کبھی سمندر کے لہروں کی طرح اٹھتے اور ٹوٹتے، کبھی اڑا کر لے جانے والے طوفان اور سیلاب کی طرح، کبھی نسیم سحر بن کر اور کبھی پھوار بن کے برستے ہیں۔ لیکن اشعار بنانے والے اپنے اشعار میں اتنی دلکشی اور رنگینی پیدا ہی نہیں کر سکتے۔

۳۔ شاعر اکثر نظم سے مضمون باندھتا ہے جبکہ شعر بنانے والے غزل اور اسی طرح کے دوسرے اصناف سے کام چلاتا ہے۔

۴۔ شاعر روزمرہ استعمال ہونے والی زبان میں مخاطب ہوتا ہے۔ اُستادانہ انداز میں اور روانی کے ساتھ وہ اپنی کیفیت بیان کرتا ہے جبکہ شعر بنانے والے کی زبان بھاری اور اس کے الفاظ پتھر کی طرح ہوتے ہیں۔ جیسے وہ ایک ایسے ٹین کے خالی ڈبے کو ہلاتا ہے جس میں پتھر بھرے ہوئے ہوں۔

۵۔ شاعر اپنے معاشرے سے اثر قبول کرتا ہے اور اپنے اظہار کیلئے اپنے اندر کے تلاطم خیز جزبات سے کام لیتا ہے۔ اسے اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کے اشعار سے کسے خوشی ہوتی ہے اور کون اس سے ناراض ہوتا ہے وہ ہر حال میں حق بات کہہ دیتا ہے، بے شک ایک جہان اس کی بات کو ماننے کیلئے آمادہ نہ ہو لیکن شعر بنانے والے وقت اور حالات کو دیکھتا ہے اور عقل کی پیروی کرتا ہے۔

۶۔ سب سے بڑی بات یہ کہ شاعر عشق کا غلام ہوتا ہے جبکہ شعر بنانے والے عقل کا۔

میر گل خان نصیر چونکہ ادب کو مجموعی زندگی کے تناظر میں دیکھنے

والے شاعر تھے اس لئے ان کے ادبی نظریات کو مجموعی طور پر ''ادب برائے زندگی'' کے روشن، مثبت اور ترقی پسند پہلو سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ ادب کو مقصد نہیں سمجھتے بلکہ کسی اعلیٰ وارفع مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کے نظریات کو دیکھتے ہوئے یہ رائے بھی قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ ادب کو صرف انفرادی جذبات و احساسات کا ترجمان نہیں سمجھتا بلکہ وہ ادب کو سماجی شعور کا مجموعی عکاس بھی سمجھتے ہیں۔ میر گل خان نصیر ادب میں ہیت کے بجائے بنیادی اہمیت موضوع اور مواد کو دیتے ہیں۔ (40)

نثر نگاری:

ادب میں طے شدہ کسی تخلیقی نثری صنف پر گو کہ باقاعدگی سے میر گل خان نصیر نے طبع آزمائی نہیں کی لیکن تاریخ اور تحقیق کے شعبے میں ان کی تحریریں نثری ادب کی ترویج کیلئے نہایت اہم ثابت ہوئی ہیں۔ یہ دونوں موضوع ان کیلئے اتنے سدا بہار تھے کہ ان کی ہر تحقیق و تالیف میں ان موضوعات میں ایک طرح کی تازگی نظر آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انھوں نے ایک ہی مضمون کو سو رنگ میں باندھا بلکہ ہر دفعہ ان موضوعات کا ایک نیا زاویہ ایک نئے انداز میں پیش کر دیا۔ انھوں نے صورتحال کو ہر

دفعہ اس نظر سے پیش کیا کہ وہ کسی سابقہ عمل کی تکرار بھی نظر نہیں آئی۔

نثر نگاری کے شعبے میں میر گل خان نصیر کی تاریخی و تحقیقی کتب نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔اس سلسلے میں ''تاریخ بلوچستان'' اور ''بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں'' خصوصی طور پر بہترین نثری کاوشیں شمار کی جا سکتی ہیں۔ادبی تحقیق میں ''بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی'' ''بلوچی رزمیہ شاعری'' اور ''بلوچی عشقیہ شاعری' نثری ادب کیلئے گراں بہا اضافہ تصور کئے جاسکتے ہیں۔نثری تراجم میں بھی ان کی ترجیحات تاریخ اور تحقیق پر زیادہ مرکوز رہی، لانگ ورتھ ڈیمز کی ''کوچ و بلوچ''، اخوند محمد صدیق کی ''تاریخ خوانینِ قلات'' اور جنرل ڈائر کی ''بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار'' جیسی کتابوں کو میر گل خان نصیر نے بڑی خوبصورتی سے ترجمہ کیا۔ان کے لکھے گئے حواشیوں اور وضاحتوں سے ان تراجم کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ان تراجم کو بھی نثری ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

میر گل خان نصیر نے اپنے تحقیقی و تخلیقی کتب پر جو پیش لفظ اور دیباچے تحریک کئے ان کو بھی نثری ادب میں ''اعلیٰ نثر'' کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔''حون ءِ گوانک'' (لہو کی پکار) جوان کا شعری مجموعہ ہے، کا پیش لفظ ''گوشگی ھبر'' کے عنوان سے بلوچی میں (صفحہ ۱۷ تا ۲۴) اور ''سخن ہائے

گفتنی'' (صفحہ ۲۵ تا ۳۲) کے عنوان سے اردو میں۔ داستانِ دوستین وشیرین کا پیش لفظ ''سرلوز'' کے عنوان سے بہترین نثری نمونوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔(41)

میر گل خان نصیر شاہ عبداللطیف بھٹائی اور فیض احمد فیض کے بڑے مداح تھے۔شاہ سائیں کے ''شاہ جو رسالو'' میں جو اشعار بلوچوں یا بلوچستان سے متعلق تھے میر گل خان نصیر نے انھیں ''شاہ لطیف گوئشیت'' کے نام سے ترجمہ کیا اور ''سرحال'' کے عنوان سے اس کا پیش لفظ تحریر کیا۔(42)

''سروادی سینا'' فیض احمد فیض کا شعری مجموعہ ہے جس کا ترجمہ میر گل خان نصیر نے ''سینائی کیچگ ءَ'' کے نام سے کیا اس میں بھی ''سرحال'' کے عنوان سے پیش لفظ تحریر کیا۔(43) ان دونوں تراجم کے پیش لفظ کو بھی ہم بطورِ نثر پیش کر سکتے ہیں۔ ویسے اکثر میر گل خان نصیؔر اپنی تخلیقات کا پیش لفظ منظوم انداز میں تحریر کرتے تھے جو بلوچی ادب کے حوالے سے یقیناً ایک نیا تجربہ تھا۔

میر گل خان نصیؔر نے کچھ نثری مضامین بھی تحریر کیے یہ ایسے مضامین ہیں کہ جنھیں باقاعدہ طور پر اور طے شدہ نثری اصناف کے ذیل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ''ماہنامہ اومان بلوچی'' جو مولانا خیر محمد ندوی کی زیرِ نگرانی کراچی

سے چھپتا تھا۔ اس ماہنامے کو بلوچی کا پہلا ادبی جریدہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس ادبی جریدے میں میر گل خان نصیر بھی وقتاً فوقتاً لکھتے رہتے تھے۔ ''اومان'' کے فروری ۱۹۵۶ کے شمارے میں ''بلوچی املا'' کے عنوان سے میر گل خان نصیر نے ایک مضمون لکھا جو بلوچی ادب میں لسانی مباحث کی بنیاد بنا۔ اس کے علاوہ مارچ ۱۹۵۹ میں اومان میں لالہ غلام محمد شاہوانی کے شخصی اور صحافتی صفات پر ''یک یاتے'' کے عنوان سے انھوں نے ایک بہت ہی خوبصورت اور پر مغز مضمون تحریر کیا۔

بلوچی زبان وادب کی ترقی وترویج کے لئے ''بلوچی ادبی دیوان'' کا اہم کردار رہا ہے۔ ''گچین'' (انتخاب) کا چھاپنا اس ادبی تنظیم کے اہم کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں مختلف ادبی مضامین اور تخلیقات اکھٹے کیے گئے ہیں۔ اس میں میر گل خان نصیر کا بھی ایک مضمون شامل ہے جو پہلوان ریکی کی فن اور شخصیت پر ہے۔ (44)

''بلوچی املا'' لکھ کر بلوچی ادب میں لسانی مباحث کو رواج دینے کے بعد میر گل خان نصیر نے بعد میں بھی اس اہم موضوع پر بہت سے مضامین لکھے جو ۱۹۶۰ میں ماہنامہ زمانہ بلوچی، کوئٹہ میں قسط وار چھپتے رہے۔ (45)

میر گل خان نصیر کی تخلیقات وتحریروں میں ان کے مکتوبات بھی شامل

ہیں جن میں آئندہ نثر کا حصہ بننے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں۔ انکے علاوہ میر گل خان نصیر کے کہے گئے وہ جملے بھی آئندہ نثر کا حصہ ہونگے جن میں اقوال و پیام کی صورتحال موجود ہے۔

مکاتیبِ میر گل خان نصیر:

خط کو بلوچی میں ''نمدی'' کہتے ہیں جسکے معنی ''نیم دیدار'' کے ہیں۔ خطوط نہ صرف اپنے عہد کی تاریخ ہوتے ہیں بلکہ اس عہد کے سیاسی، معاشی، سماجی، ثقافتی اور ادبی صورتحال کا مشاہدہ کرنے اور جائزہ لینے میں بھی مددگار ومعاون ثابت ہوسکتے ہیں۔

ویسے تو ہم اپنی روزمرہ زندگی میں مختلف لوگوں اور اداروں کو مختلف نوعیت کے خطوط لکھتے رہتے ہیں لیکن ان میں کچھ خطوط چھانٹی کے مرحلے سے گزر کر بعد میں بڑی اہمیت اختیار کر کے تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ شروع شروع میں یہ بات کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خطوط اس قدر اہمیت اختیار کر جائیں گے۔

انسانی ترقی کے مراحل میں جب ٹیلی فون شامل ہوا تو اس سے خطوط نویسی کی اہمیت پر کچھ اثر ضرور پڑا لیکن یہ بھی ممکن ہے ایک وقت ایسا

بھی آئے کہ ریکارڈ کیے گئے ٹیلی فون بھی اہمیت اختیار کر کے کتابی صورت میں چھپ کر منظرِ عام پر آئیں اور ایک ادبی صنف کی صورت اختیار کر لیں۔

بیسویں صدی نے ادب کو جہاں بہت سارے ادبی اضاف سے روشناس کرایا وہاں خطوط نویسی کو بطورِ فن متعارف کرانے کا سہرا بھی اسی صدی کو جاتا ہے۔ اس صدی میں افسانے کے صنف میں بھی تجرباتی بنیاد پر خطوط نویسی ایک مخصوص تیکنیک کے انداز میں شامل ہوگئی۔

بلوچی میں خطوط چھاپنے کی بنیاد سید ظہور شاہ ہاشمی نے رکھی۔ سید ہاشمی نے جب ''سگیں دستونک'' چھاپا تو اس میں ''دونمدی'' کے عنوان سے ایک حصہ مخصوص کر لیا۔ جس میں سید ہاشمی کے دو خطوط شامل تھے۔ (46)

اسکے علاوہ بلوچی میں خطوط پر مشتمل پہلا مجموعہ بھی ''سید نمدی'' کے نام سے سید ظہور شاہ ہاشمی کا ہی چھپا جو سید ہاشمی اکیڈیمی کراچی کی جدو جہد اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں وہ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے اپنے احباب ، عزیزوں ، ادب دوست لوگوں اور مختلف اداروں کو لکھے۔ یہ خطوط ۱۹۵۹ سے لے کر ۱۹۶۹ تک کے زمانے کے ہیں۔ (47)

''بلوچی ادب کیلئے سید ہاشمی نے پہلا ناول ''نازک'' تخلیق کیا۔ خطوط نویسی کے حوالے سے بھی پہل کا اعزاز سید ہاشمی ہی کو جاتا ہے۔ بلوچوں کی

ترقی اور خوشحالی کیلئے سید ہاشمی کیا سوچتے تھے؟ اور کیسے خواب دیکھتے تھے؟ بلوچی زبان وادب کی ترقی ونشوونما کیلئے وہ اپنے دل میں کیا کیا خواہشات رکھتے تھے؟ بلوچستان کے مستقبل کے بارے میں وہ کس طرح فکرمند رہتے تھے؟ انہی خطوط میں ان سوالوں کا جواب بہتر انداز میں مل سکے گا۔(48)

سید ظہور شاہ ہاشمی اور میر گل خان نصیر دو ایسے نام ہیں کہ جنھوں نے بلوچی میں خطوط نویسی کی طرف پوری توجہ دی۔ وہ لوگوں کو بلوچی میں خط لکھنے کیلئے ہمیشہ تحریک دیتے رہتے تھے۔ ماہنامہ ''اومان'' بلوچی کے مدیر کو اپنے ایک جوابی خط میں (جو بلوچی میں تحریر ہے) میر گل خان نصیر لکھتے ہیں۔

''آپکا ۱۴ فروری کا لکھا ہوا خط مجھے ملا۔ اس خط کے ملنے سے مجھے خوشی ہونی چاہئے تھی مگر مجھے افسوس ہے کہ میں نے ''ناکام دل'' کے ساتھ آپ کا خط پڑھا۔ مجھے افسوس دو باتوں کی بناء پر ہوا۔ پہلی بات یہ کہ رسالہ بھیجنے سے پہلے آپ مجھ سے تبصرہ نہ کرنے کیلئے گلہ کر رہے ہیں۔ اگر آپ اومان بھیجتے تو یقیناً میں آپکو شکایت کا موقع نہیں دیتا۔ دوسری بات جس سے مجھے افسوس ہوا یہ کہ بلوچی زبان میں رسالہ نکالنے کے باوجود اور یہ جانتے ہوئے کہ میں ایک بلوچ ہوں اور ہر وقت بلوچ بھائیوں سے بلوچی میں خط وکتابت کو دیگر زبانوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ آپ نے مجھے انگریزی زبان میں مخاطب کیا ہے۔ اگر آپ

اردو میں خط لکھتے تب بھی کوئی بات تھی مگر انگریزی میں خط و کتابت بہت عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ انگریزوں کا رعب و دبدبہ اور انگریزی جاننے کو اپنے لیے باعثِ شان تصور کرنا ہمارے ذہنوں میں رچ بس گئی ہے، تو غلط نہ ہوگا۔ اگر حالات ایسے ہیں تو بلوچی زبان کو ترقی دینا اور اسے عام کرنا ایک خواب اور خیال سے زیادہ نہ ہوگا۔

میں ایک مرتبہ پھر اپنی تلخ باتوں کیلئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ آپ ان باتوں کو درگزر فرمائیں گے..........(49)

میر گل خان نصیر کے بہت سارے خطوط زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ گوھر ملک اپنے بابا کو یاد کر کے لکھتی ہیں۔

"......... ہر روز ہمارے گھر کی تلاشی لی جاتی تھی۔ بابا کو پکڑ کر لے جاتے تھے۔ پشکن اور گورکی کے کچھ ناول تھے۔ سویت عورت جو واجہ عبداللہ جان جمالدینی نے بھیجا تھا۔ کچھ اور کتابیں اور ماہنامے۔ میں حیران تھی کہ ان کا کیا کروں۔ پھاڑ کر پھینکنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ بابا کے کتنے تاریخی خطوط جو انھوں نے جیل سے مجھے ارسال کی تھیں، روز کی تلاشیوں کی نذر ہو گئیں۔ میری ایک بری عادت تھی کہ خطوط کتابوں میں رکھتی تھی۔ تلاشی کے دوران جو کاغذ اور کتابیں ان کے ہاتھ لگتے وہ انھیں اٹھا کر لے جاتے تھے۔ بابا کے زیادہ کہنے پر میری یہ عادت مجھ سے چھوٹ گئی

مگر کیا فائدہ۔'' (50)

میر گل خان نصیر اپنے خطوط میں نہ الفاظ اور جملوں کی تکرار کرتے تھے اور نہ ہی بے مقصد باتیں لکھ کر خط کو خواہ مخواہ طول دیتے تھے۔ ان کے خطوط مختصر اور عام فہم ہوتے تھے۔

ایک دفعہ قلات میں میر گل خان نصیر بخار کے ساتھ کھانسی کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے عزیزوں نے جڑی بوٹیاں دیں مگر اس سے افاقہ نہیں ہوا۔ پھر وہ کوئٹہ آ گئے اور ڈاکٹر جعفر کے پاس چلے گئے۔ پلورسی کا مرض تشخیص ہوا۔ ڈاکٹر جعفر نے علاج کیا اور ان کے پھیپھڑوں سے پانی نکالا۔ اس صورتحال کو اپنی بیٹی (گوھر ملک) کے نام ایک خط میں میر گل خان نصیر نے یوں بیان کیا۔

''میری اچھی بیٹی!

میں ذرا بیمار تھا جب ڈاکٹر کو دکھایا تو معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں میں پانی ہے۔ یہ ٹی بی کی ایک قسم ہے۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پریشان مت ہونا، اپنی امی اور دادی کو تسلی دیجیئے۔ اب میں بہتر ہوں۔

تمھارا ابو

نصیر (51)

میر گل خان نصیر ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیشہ تیار رہتے تھے وہ اپنی تمام معاملات میں، حالات اور واقعات میں اپنے لوگوں اور عزیزوں کو اپنے تجربات کا حصہ بناتے اور انھیں حالات سے باخبر بھی رکھتے۔ جب نواب نوروز خان اپنے بیٹوں اور دوستوں کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے تب سیاسی قیدیوں کو مختلف علاقوں کے قید خانوں میں بھیج دیا گیا۔ میر گل خان نصیر کو پورے نو مہینے قلی کیمپ میں شیر علی باز کی تشدد و بربریت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جب انھیں نوشکی کے جیل میں منتقل کیا گیا تب انھوں نے اپنی بیٹی (گوھر ملک) کو خط لکھ کر صورتحال سے آگاہ کیا۔

"........... مجھے یقین ہے کہ میرے برسوں کی احوال اور باتوں سے آپ لوگ (قوم اور وطن اور اسکی طلب جو وہ اپنے دلیر بیٹوں اور بیٹیوں سے مانگتی ہے) اچھی طرح باخبر ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو میرے لئے بالکل فکر مندمت ہونا اور نہ پریشان ہونا بلکہ خوش رہنا۔ اپنے سروں کو فخر اور شان کے ساتھ اونچا رکھنا کہ ہم بھی اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ انجام اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے۔ میں خوش ہوں آپ لوگوں کا خوش رہنا میرا حوصلہ بڑھاتا ہے۔" (52)

میر گل خان نصیر اپنے عزیزوں میں بچوں سے لیکر بڑوں تک سب کے معاملات سے باخبر رہتا تھا۔ خطوط کے ذریعے چھوٹوں کو پڑھنے کی طرف

راغب کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں مادرِ وطن کی سیاست سے باخبر رہنے کی تلقین بھی کرتا تھا۔ اپنے ایک خط میں جو انھوں نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو کراچی سے محمد یوسف عزیز (مگسی) کے نام تحریر فرمایا لکھتے ہیں۔

''تمھارا خط ملا، تمھارے پاس ہونے اور پھر کالج میں داخلہ لینے کی خبر سے بہت خوشی ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح دل لگا کر پڑھو گے تا کہ صحیح طور پر مادرِ وطن کی خدمت کے اہل بن سکو!

......خوب پڑھو! لیکن ساتھ ہی مادرِ وطن کی سیاست سے بھی اپنے کو باخبر رکھا کرو......'' (53)

اپنے ایک اور خط میں جو انھوں نے ۱۱۹ کتوبر ۱۹۶۴ء کو کراچی سے محمد یوسف عزیز (مگسی) کے نام تحریر فرمایا، لکھا۔

تمھارا خط ملا۔ آج شپگر وک کی دس جلدیں تمھارے نام پارسل کر کے بھیج رہا ہوں۔ زاں بعد بھی اگر ضرورت ہو تو لکھیں۔ کوئٹہ میں شیرین دوستین اب چھپ رہی ہے۔ اُمید ہے مہینہ ڈیڑھ میں مارکیٹ میں آ جائے گی۔ (54)

میر گل خان نصیر کے کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جو انھوں نے رسالوں اور اخباروں کے مدیروں کے نام تحریر فرمائے جنکی یقیناً ادبی اور تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح کا ایک خط میر گل خان نصیر نے ہفت روزہ استقلال کے ایڈیٹر کو تحریر فرمایا۔ (55)۔

میر گل خان نصیر اپنے احباب کے ساتھ

ایڈیٹر ہفت روزہ استقلال

نوشکی

۵۰-۲-۱۱

پیارے ساتھی!

اتنا تو ہے کہ زندہ ہوں، اگرچہ مردوں سے گندہ، کل رفیقِ اعظم جان کے خط میں ملفوف خان صاحب کا خط ملا متواتر اسے پڑھ رہا ہوں، رمز و اشارے کی باتیں ہیں اور خان کی تحریر بہت کم سمجھ آ رہا ہے۔ خیر اسی سے اتنا تو ہوا کہ ریگستان میں پڑے پڑے جو دماغ بے کار ہو چکا تھا، کچھ کچھ جاگ اٹھا، جسکا پہلا ثبوت پالِ نیک یا فالِ نیک بلوچی نظم ہے۔ آج صبح ہی گھر سے ریتوں کی طرف نکلتے ہی موزوں ہوئی اور اس خط کے ساتھ بمع ترجمہ آپ کی طرف چل پڑی۔ پسند آئے تو "استقلال" میں شائع فرما دیجئے ورنہ ردی کی ٹوکری تو میز کے نیچے ہی پڑی ہے اسکی نذر کرادیں۔

میں یہ مانتا ہوں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا وعدہ وفا نہ کر سکا۔ بھلا یہ تو بتایئے کہ آپ نے اپنا وعدہ کہاں تک نبھایا۔ یعنی وہ بلوچی مجموعہ کیلئے گردپوش والی گزارش کہاں تک پوری ہوئی؟ اُمید ہے، اگر جواب نہ دے ۲۰ فروری کے بعد کوئٹہ آ جاؤں گا۔ آپ اور اعظم جان کی دید کو ترستا ہوں اور وہ "خدا کا بیل" تو کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کرتا۔

والسلام

ارباب صاحب اور ملک صاحب کی خدمت میں آداب عرض

آپ کا

گل خان نصیر

وقتاً فوقتاً میر گل خان نصیر نے اپنے احباب ، عزیزوں اور مختلف اداروں کو جو خطوط لکھے، ان خطوط میں بھی چھانٹی کے مرحلے سے گزرنے کے بعد تاریخ بننے کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔

میرو خان، میر گل خان نصیر کا نواسہ۔ وہ خطوط جو انھوں نے اپنے عزیزوں کو لکھے ان میں میرو خان کا تذکرہ ضرور موجود ہوگا۔ میر گل خان نصیر کو میرو خان سے بہت پیار تھا۔ تبھی تو وہ علالت کے باعث آخری دنوں میں بھی میرو خان کیلئے بہت فکر مند ہوا کرتے تھے۔ خاندان کے لوگوں کے منع کرنے کے باوجود وہ نہ صرف میرو خان کو پڑھاتے تھے بلکہ اسے اسکول بھی خود لے جاتے تھے۔ اپنی بیٹیوں گوھر ملک اور گل بانو کے نام جو بھی خطوط میر گل خان نصیر ارسال فرماتے تھے ان خطوط میں میرو خان کو پیار دینے کے ساتھ ساتھ اسکی تربیت کو بھی مدِ نظر رکھتے تھے۔

''میرو جان کی صحت اور شرارتوں کا حال کسی قدر ملک جان نے بھی لکھا تھا۔ خدا اُسے سلامت رکھے اور عمر دے۔ اس کا بہت خیال رکھیں مگر اسے غصہ نہ دلائیں۔ بچپن میں جیسے اسکی تربیت ہوگی، جوانی میں وہی کام آئے گا، خدا کرے کہ وہ ایک ایسا نوجوان بنے جو باپ دادے کا نام روشن کرے۔'' (56)

میر گل خان نصیر جس آئیڈیل کردار کو تراشنا چاہتے تھے وہ اسی مجموعی صورتحال کے تناظر میں میرو خان کو دیکھنا چاہتے تھے۔ گوھر ملک کے نام اپنے ایک خط میں میر گل خان نصیر رقمطراز ہیں۔

''میری خواہش ہے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل و کرم سے پورا کرے کہ میرو مادرِ وطن کا ایک درخشندہ تارا بنے۔ ان احمد زیوں میں سے جن کے نام قوم و وطن کی تاریخ میں سنہرے حروف میں تحریر ہیں۔ خدا اسے ان وطن فروشوں کے سائے سے اپنے امان میں رکھے جو اپنے ماتھے پر سیاہ داغ لگائے، دوسروں کے جوتے سیدھا کرنے پر خوش ہیں۔ بچے کی تربیت پنگوڑہ یعنی گوانزگ سے شروع ہوتی ہے۔ یہی میں گلبانو سے اور تم سے چاہتا ہوں۔ میرو کی ہر حرکت پر کڑی نظر رکھیں۔ اس سے ایسی باتیں کریں، ایسی کہانیاں سنائیں، بلوچی کی ایسی لوریاں دیں، ایسے تصاویر دکھائیں اور واقعات بیان کریں جن سے بلوچی غیرت، جوانمردی اور دانائی کا اظہار ہوتا ہو۔ اپنا شجرہ نسب (مینگل اور احمد زئی)، اپنا خاندان اس کے سامنے قابلِ فخر انداز سے پیش کریں۔ خیر اللہ اسے عمر دے یہ باتیں رفتہ رفتہ ہونگیں۔ اس وقت تم لوگ اسے بہلانے کیلئے اردو (افسوس کہ بلوچی کے نہیں بنے) کے ایسے قاعدے اس کے سامنے رکھیں جن میں تصویریں ہوں اور اسطرح خدا کا نام لے کر اسے ا، ب پڑھانا شروع کریں۔ یہ تصویریں دیکھ دیکھ کر بچہ رفتہ رفتہ حرف شناس ہو جاتا ہے۔ بازار میں اردو اور انگریزی کے ایسے باتصویر قاعدے بہت ملتے ہیں۔ پہلی کوشش یہی ہو کہ اسے پڑھائی کا شوق پیدا ہو۔ دھمکی، ڈانٹ ڈپٹ بالکل نہیں کریں اس سے بچے میں احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ جرات کم ہو جاتی ہے۔ عزتِ نفس مجروح ہو جاتا ہے۔ اور وہ بلوچ نہیں رہتا۔ سب کام خوشی خوشی، ہنسی کھیل کی طرح ہونا چاہیئے'' (57)

میر گل خان نصیر نے ویسے تو بہت سے خطوط تحریر فرمائے لیکن یہاں ہم صرف ان کے چند خطوط پر اکتفا کریں گے۔

میر گل خان نصیر کی ان خطوط کو اگر کتابی صورت میں اشاعت کے مرحلے سے گزارا جائے تو ان سے نہ صرف گل خان نصیر شناسی میں مدد ملے گی بلکہ اردو اور بلوچی زبان کیلئے بھی یہ بیش بہا سرمایہ ثابت ہونگے اور بلوچی نثری ادب میں خصوصاً ایک اچھا اضافہ تصور ہونگے۔

دانش نصیر (اقوال و پیام)

میر گل خان نصیر نے مختلف اوقات میں اپنے اشعار میں، دیئے گئے انٹرویوز میں اور اپنے کچھ نثری مضامین میں بھی کچھ ایسی باتیں کہی ہیں کچھ ایسے جملے استعمال کئے ہیں جنھیں اگر ''دانش نصیر'' کے نام سے یا ''اقوال و پیام'' کے عنوان سے سامنے لایا جائے تو یہ مواد بلوچی نثری ادب میں گراں بہا اضافہ تصور ہوں گے اور ان اقوال میں اتنی صلاحیت ہے کہ آنے والے وقتوں میں انہیں مثال کے طور پر بھی پیش کیا جا سکے۔ اس صورتحال کو واضح کرنے کیلئے میں نے کچھ اقوال کا انتخاب کیا ہے جن کا ماخذ میر گل خان نصیر کے انٹرویوز، خطوط، اشعار اور مضامین ہیں۔ میر گل خان نصیر پر یہ ایک بالکل نیا تجربہ ہے جو آنے والے محققین کیلئے ایک در وا کر سکے گا۔

ملک فیض محمد یوسفزئی کے نام میر گل خان نصیر کے خطوط سے چند اقتباس۔

☆۔قدرت نے انسان کو ہمدردی کا مادہ عطا کیا ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ اگر یہ جزبہ نیست و نابود ہو جائے، انسان تو کیا تمام موجوداتِ عالم میں ایک ایسا تصادم واقع ہو کہ چند لمحوں میں اس کرہِ ارض کا پتہ بھی نہ لگے۔

☆۔ناراض ہونا میرے نزدیک ایک بچگانہ لفظ ہے جو عام طور پر ان آدمیوں کے درمیان استعمال ہوتا ہے جن کے پیشِ نظر اپنا ذاتی مفاد ہو۔

☆۔ایک ردِ عمل قائم کرنا اور اس پر عمل کرنا ہمارا فرض ہے۔

☆۔جس نے پہل کی اس نے دوسرے کو ملزم گردانا۔

☆۔ہماری غفلت کی وجہ سے غیر ملکی ہمارے سروں پر سوار ہیں۔

☆۔مُردوں کی ہمارے پاس گنجائش نہیں۔

☆۔ہر شخص اپنا رونا روتا ہے۔

☆۔جس نوجوان کے دل میں قومی تڑپ موجزن نہ ہو ملک کیلئے اس کا ہونا یا نہ ہونا یکساں ہے۔

☆۔جس شخص کو اپنی غلطی یا غلطیوں کا احساس ہو وہ سالک راہ ہے۔ اسکی پیروی کرنی چاہیئے۔

☆۔قومی مفاد سے میرے سرفروش جزبات کا ماند پڑنا میرے لئے گناہ تصور ہوگا۔

۱۹۷۸ میں مجاہد بریلوی نے جناب یوسف مستی خان کی رہائش پر میر گل خان نصیر سے ایک انٹرویو لیا تھا جو بعد میں ''بلوچستان مسلہ کیا ہے'' (۱۹۸۴) میں چھپ بھی گیا تھا۔ اس انٹرویو سے چند اقوال بھی ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

☆ ۔ جذبے کی شدت مادری زبان میں ہی پورے طور پر ظاہر کی جا سکتی ہے۔

☆ ۔ ایک شاعر جسے اپنے وطن اور قوم کا درد ہو سب سے زیادہ اثر اپنے اطراف پھیلے ہوئے لوگوں کی بدحالی، پسماندگی اور قومی جبر سے قبول کرتا ہے۔

☆ ۔ ہمارا صوبہ صدیوں سے پسماندہ ہے مگر ہمارا ادب پسماندہ نہیں۔

☆ ۔ جیل ایک ادبی شخص کیلئے تخلیقی کام کا موقع فراہم کرتا ہے۔

میر گل خان نصیر کی بیٹی اور بلوچی کے افسانہ نگار گوھر ملک (جسے اس کے گھر والے پیار سے ملک جان کہتے تھے) نے ''بابا'' کے عنوان سے ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان (دسمبر ۱۹۸۴) میں اپنے والد محترم سے متعلق اپنی یاد داشت بیان کی ہیں۔ اس نے اپنے ''بابا'' کے ساتھ کچھ مکالموں کا بھی ذکر کیا تھا جن سے کچھ منتخب کر کے ''اقوال و پیام'' کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

☆ ۔ شاعر کا دل بہت حساس اور نرم و نازک ہوتا ہے۔ پھولوں کی طرح۔

☆ ۔کوئی چیز پسند آئے اور پاس پیسے ہوں تو بے شک خرید لو لیکن قرض لینے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ ایک بار قرض لیا تو عادت سی پڑ جائے گی۔

☆ ۔کبھی جھوٹ مت بولنا۔ جھوٹے انسان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔

☆ ۔اپنا حق مانگنا جرم نہیں۔

☆ ۔جھوٹی تسلی کے میں خلاف ہوں۔

☆ ۔بھلا کون بلوچ ہے جو اپنے ''باہوٹ'' کو پناہ نہیں دیتا۔

☆ ۔وہ سارے بلوچ جوان جو میرے اشعار پڑتے ہیں، میرے بیٹے ہیں

میر گل خان نصیؔر نے جب فیض احمد فیض کے شعری مجموعے ''سرِ وادیٔ سینا'' کا بلوچی میں ترجمہ کیا تو 1982ء میں کوئٹہ میں اس کی تقریب رونمائی بھی ہوئی۔ اس تقریب میں میر گل خان نصیر کے خطبے سے چند اقتباسات:

☆ ۔میں شاعر ہوں یا نہیں اس کا فیصلہ مجھے نہیں بلکہ میرے قارئین کو کرنا ہے۔

☆ ۔شاعری ایک لدنی علم ہے جو کسی کو خدا کی طرف سے براہ راست بغیر کسی اُستاد کے حاصل ہوتا ہے۔

☆ ۔ شاعری ایک خداداد ملکہ، ایک لاہوتی استعداد اور ایک ایسی الہامی کیفیت ہوتی ہے جسے ہم وحی نہیں تو وحی کے مترادف کہہ سکتے ہیں، جو شاعر کے دل پر نزول کرتی ہے۔

میر گل خان نصیر بلوچی کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ اپنے
اشعار میں بھی انھوں نے کچھ ایسے تصورات اور خیالات کا اظہار کیا ہے جن کو
اسی کیفیت میں سمویا جا سکتا ہے جن کو ہم دانش نصیر کا نام دیتے ہیں۔ اس
سلسلے میں میر گل خان نصیر کے جن شعری مجموعوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔
ان میں ''گلبانگ'' ۔ ''شپ گروک'' ''حون ءِ گوانک'' (لہو کی پکار)،
''شنبلاک'' اور ''پرنگ'' شامل ہیں۔

☆۔ شاعر کے جیسے جذبات ہونگے، ویسا ہی اس کا کلام ہوگا۔

☆۔ شاعری عشق کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔

☆۔ وطن سے محبت کا جزبہ بالکل ایسا ہی غیر ارادی اور فطری ہوتا ہے جیسے
کہ اولاد کو اپنی ماں سے لگاؤ ہوتا ہے۔

☆۔ شعر کہنے سے، شعر کا کسی اور زبان میں ترجمہ کرنا زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔

☆۔ میری سوچ کی نظروں میں تم (بولان) دورِ منبع رکھنے والی محض ایک
پہاڑی ندی نہیں ہو، بلکہ کہکشاں ہو جس نے زمین پر اتر کر اپنی صورت بدل
دی ہے۔

☆۔ چاند اور چاند کی طرح ترشی ہوئی یہ زمین جو طرح دار بلوچوں کا وطن
ہے، اس نے دل کی طرح تمہیں (بولان) سینہ میں جگہ دی ہے۔

☆ ۔کل گیا، گزر گیا۔آنے والا کل محض ایک خیال ہے۔آج ہی کا دن تقدیر کے بدلنے کا دن ہے اس میں پس وپیش مت کرو۔

☆ ۔بولان کی رفعت کا زمانہ بھورے گھوڑوں کے سواروں کے ساتھ گزر گیا، آج اس میں لاریاں اور ٹینک، ریل کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے ہیں۔

☆ ۔جانتا ہوں کہ بولان پھر ایک طوفان کیلئے انگڑائی لے رہا ہے۔اس کی چٹانوں اور گونجنے والی گھاٹیوں میں بجنے والی ہوا کی سیٹیوں سے میں یہ فال لیتا ہوں۔

☆ ۔ساتھیو! اپنے اٹھے ہوئے قدموں کو مت روکو، حوصلہ قائم رکھو۔جو پیچھے رہ گئے ہیں ان کی طرف مڑ کر مت دیکھو کیونکہ اس راہ میں جو مرے ہیں وہ اپنا انتقام لے کر مرے ہیں۔

☆ ۔ہم بھیک نہیں مانگتے، انعام نہیں مانگتے اور نہ ہی کسی سے کوئی بخشش طلب کرتے ہیں۔مال ہمارا اپنا ہے جو نسل درنسل ہماری ملکیت ہے۔ہم اپنا مال واپس چھین لیں گے اس کے لئے ہمیں چاہے کوئی بھی طریقہ کار اختیار کرنا پڑے۔

☆ ۔ہم نے دشمن کو کبھی پیٹھ نہیں دکھائی۔

☆ ۔ہم نے سروں کا نذرانہ تو دیا ہے لیکن محاذ کبھی نہیں چھوڑا۔

☆ ۔یادیں تاریک ایام کوسحر کی سپیدی بخشتی ہیں۔

☆ ۔یہ کالی رات آخر کار گذر ہی جائے گی اور دودھیا سحر طلوع ہوگی۔

☆ ۔جواں مردوں کے لئے جدوجہد کا ایک ہی راستہ ہے۔اپنے خون میں نہانے اور قربانی دینے کا۔اور یہی منزل کی طرف بڑھنے کا راستہ ہے۔

☆ ۔رات میرا دیوانہ دل خوشی سے ایسا وارفتہ ہوا جیسے تشنہ مرید کو حانی کا دیدار نصیب ہوا ہو۔

☆ ۔سیاہ خانہ زنداں کے تلخ ترین مصائب نے زندگی کی خواہشیں مٹا دی ہیں۔

☆ ۔کوئی شخص مقابلہ کئے بغیر اپنے کالے گدھے کو بھی لٹیروں کے حوالے نہیں کرتا۔

☆ ۔سورج اُبھرتا ہے اور دن نمودار ہوتا ہے لیکن رات کی دھول نہیں چھٹتی، اور رات کو چودھویں کا چاند ایک خوبصورت بیوہ کی طرح برباد نظر آتا ہے۔

☆ ۔یہ مادر وطن سے عشق کا جنون ہے جس نے میرے من کو فولاد کی طرح مضبوط بنا دیا ہے

☆ ۔دو دن کی خدائی پر متکبر ہونے والا یہ انسان رُوسیاہ ہو کر ہی جائے گا جیسے شمر اور شدّاد چلے گئے۔

☆۔وہ رہنما جو گدھی کے بچے کی طرح اچھلتا کودتا ہے بے قصور ہے کیونکہ بداطواری اسے پیدائشی ودیعت ہے۔

☆۔جو فصل لہو سے اُگی ہو وہ ثمر بار اور دائمی ہوتی ہے۔

☆۔صرف جاں نثاری ہی میں تمھاری بقا مضمر ہے۔

☆۔جھوٹ اور ظلم کی بنیادوں پر تعمیر کیا ہوا محل آخر کار ڈھ جائے گا۔

☆۔آزادی کی دیوی کو حاصل کرنے کیلئے کوئی قیمت بھی گراں نہیں ہوتی۔

☆۔ظلم اور زور کے بل پر آج تک مجھے کوئی مطیع نہیں کر سکا۔

☆ شاعری زبان کا سرمایہ ہے اور زبان قوم کیلئے باعث افتخار ہے۔

☆۔زندان میں برف کی مانند سرد جگر رکھنا مجھے زیبا نہیں۔

☆۔آزادی ،اپنی مقدس درگاہ پہ بہادروں سے نذرانے اور عظیم قربانیاں مانگتی ہے۔

☆۔بلوچوں کی ڈھالوں کے لیے باعث عار ہے کہ وہ ماؤں کے محافظ نہ بنیں۔

☆۔جہاں خوف اور حیا باقی نہ رہے وہاں مکار شیطان کے سوا دوسرا کوئی باقی نہیں

☆۔ اگر ملنا نصیب سے وابستہ ہے پھر تمہاری منزل کہاں ہے؟

☆۔ ہمت کرنے سے ہی کچھ بنتا ہے۔

☆۔ گولی اور بندوق سے محبت جنم نہیں لیتی اور نہ پھول آگ کی تپش کو برداشت کر سکتی ہے۔

☆۔ زنجیریں، قید خانے۔ توپ اور بندوقیں آزادی کے لئے اٹھتی لہروں کو نہیں روک سکتیں۔

☆۔ جسے ذرا بھی قومی غیرت اور ناموس کا خیال ہو اس کا دل غلامی سے یقیناً تنگ آئے گا۔

☆۔ جو دانا ہیں وہ اشعار کا مطلب جانتے ہیں۔

☆۔ عاقل وہی ہے جسے احساس ہو، جو بھائیوں کی نصیحتیں سنے۔ عقل اور سلیقے سے کام کرے۔

☆۔ بغیر منزل کے بھاگنے والے یقیناً کسی گھاٹی میں گریں گے۔

☆۔ آگ سے تپا لوہا تلوار تو بن سکتا ہے مگر جانوروں کے لیے چارہ کبھی نہیں بن پاتا۔

☆۔ عمل کرنے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

☆۔ دلیل اور عقل جب منہ موڑ لیں تو بخت اور نصیب بھی روٹھ جاتے ہیں۔

☆ ۔جہل کی مجلس میں عقل کا کیا کام۔

☆ ۔مرد مجاہد کی ہمت ہی نظام زندگی بدل سکتی ہے۔

☆ ۔دوسرے کے ہاتھ کے شکار پر نادان لوگ ہی آسرا لگاتے ہیں۔

☆ ۔اگر بروقت غلطی کا احساس ہو جائے تو صحیح راستے تک آنے میں کوئی مشکل نہیں

☆ ۔سوئے ہوئے اقوام کے نصیب بھی سویا ہی رہتا ہے۔

☆ ۔آنکھیں کھلی رکھنے سے دانائی آتی ہے اگر آنکھیں بند ہوں تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔

☆ ۔ سپہ سالار، تلوار اور اسپر پر جبکہ شاعر اپنے اشعار پر نازاں ہوتا ہے۔

☆ ۔مسلسل اور تیز چلنے والے ہی منزل تک پہنچ پاتے ہیں۔

☆ ۔زندگی کا اصل مزہ سوز اور مستی ہی میں تو ہے۔

☆ ۔ہم زندہ رہنے کیلئے ہی مر جاتے ہیں۔

☆ ۔دنیا زندہ اقوام سے بھری پڑی ہے۔مرنے والوں کے لیے قبر کی پناہ موجود ہے۔

☆ ۔جب زیادہ نرم بن جاؤ گے لوگ تمھیں چبا جائیں گے۔

☆ ۔درد و غم اور عشق کے امتحان ہمیشہ کیلئے تو نہیں ہوتے۔

آتا ہے۔

☆۔زندہ لوگوں کے لیے رات ٹل جاتی ہے اور دن نکل آتا ہے۔

☆۔یہ کیسی زندگی ہے جو کوّے بتاتے ہیں، اصل زندگی تو شہباز کی ہے۔

☆۔اگر بے حیائی سے عزرائیل میری زندگی بھی بخش دے تو مجھے ایسی زندگی کی کوئی خواہش نہیں۔

☆۔بزدلی اچھے بھلوں کو بھی بدنام کردے۔

☆۔عشق کے کام نرالے ہوتے ہیں۔اچھے بھلے پاگل بن جاتے ہیں۔

☆۔جنگ کے میدان میں مردوں کے لیے پیٹھ دکھانا عیب تصور ہوگا۔

☆۔ایک ہے خون چوسنے والا۔ایک جو ہڈیاں چباتا ہے۔اک کو سرمایہ دار کہتے ہیں۔اک ہے جاگیردار کہلاتا۔

☆۔وہ زندگی، زندگی نہیں ہے، عزت سے نہ جو بسر ہو۔

☆۔رنگیلی دھنک کو بادلوں میں اندھا نہیں کوئی دیکھ سکتا۔

☆۔زندگی جری و بہادر مردوں کیلئے ایک کھیل کی مانند ہے۔

☆۔یہ نرم و نازک ہوا کے جھونکے نور کے دلفریب کنگن، ندی نالوں کا میٹھا پانی، خورشید کی سنہری کرنیں، چاند کی ضوفشاں چاندنی، یہ سب بے مول ہیں اور یہ ہر ایک کے واسطے یکساں ہیں۔

☆۔میدانِ جنگ سے بھاگنا تیرے لئے معیوب ہے۔

☆۔ میری فکرِ بلند پرواز اپنی موج میں آ کر غمِ فرقت کے تیروں کو اٹھا کر چھوم لیتی ہے۔

☆۔ دعا کرو دوستو! اب ہاتھ پھیلاؤ نہیں اپنے کہ عرضِ مدعا سے کام کب سنبھلے ہیں دنیا میں۔

☆۔ جو زندگانی محتاجِ قُبا دھو کے رہے اس سے زنداں کے آلام کی زندگی بہت بہتر ہے۔

ایام اسیری میں تحقیقی و تخلیقی کارنامے:

کچھ لوگ جب اپنی زندگی کے مقاصد متعین کر لیتے ہیں تو انھیں ان مقاصد کے حصول کے لیے کبھی کبھار بہت ہی صبر آزما اور کھٹن جدو جہد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ادب کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ایسے بہت سے نام ہیں جنھوں نے اپنی غیر متزلزل، غیر مصالحانہ اور انتھک جدو جہد سے ایک تاریخ رقم کی۔ انھوں نے قلم کی قوت سے تخلیق کار اور سپاہی کا کردار بہ یک وقت ادا کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی قوم اور وطن سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ان کا جینا مرنا اپنی وطن اور قوم کیلئے تھا۔ ان لوگوں کے دلوں میں مٹی کی محبت اس حد تک رچ بس گئی تھی کہ اس محبت کو دوسری محبتوں سے الگ کر کے

دیکھنا ناممکن ہوگیا تھا اسی وابستگی کی وجہ سے ان لوگوں پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے، انھیں جیل جانا پڑا، جلاوطنی کے دن دیکھنے پڑھے، مختلف قسم کی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں، نظر بندی، قید تنہائی، روپوشی، جس بے جا، جرمانے اور جائیداد کی ضبطگی کا بھی اُنھیں سامنا کرنا پڑا، کئی ایک کی کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ کہیوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا لیکن اسکے باوجود نہ ان کی کمٹ منٹ میں کمی آئی اور نہ انکے پیر ڈگمگائے۔

"ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے"

ترکی کے ناظم حکمت، چلی کے پابلو نرودا، اسپین کے گارسیا لورکا، فلسطین کے محمود درویش، تاتار شاعر موسیٰ جلیل وغیرہ عالمی ادب میں ایسے نام ہیں جنھوں نے مختلف مرحلوں میں مختلف اذیتوں کا سامنا کیا۔ نظمیں لکھ کر ترکی بحریہ کو بغاوت پر اکسانے کے جرم میں نامور شاعر ناظم حکمت کو اٹھارہ برس جیل کی سزا سنائی گئی۔ جیل میں انھیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ تیرہ برس تک جیل میں رہنے اور سزا کاٹنے کے بعد جیل سے رہا کرنے کی عالمی دستخطی مہم کے نتیجے میں اُنھیں جیل سے رہائی ملی۔ اسی طرح اسپین کے نامور انقلابی شاعر گارسیا لورکا کو بھی عوامی جدو جہد کی تائید و

نواب اکبر خان بگٹی، سردار عطا اللہ خان مینگل، میر گل خان نصیر،
میر غوث بخش بزنجو

حمایت کی پاداش میں ۳۸ برس کی عمر میں اپنی جان گنوانی پڑی۔(58)

عوام کی سر بلندی کے گیت گانے کے جرم میں پابلو نرودا کی عمر کا ایک حصہ روپوشی میں گزرا۔ روپوشی کی حالت میں اُنھیں بہت ہی مشکل اور کٹھن مراحل سے گذرنا پڑا۔(59)

ایران کے انقلابی شاعر محمد رضا عشقی کو اپنے وطن اور اہل وطن کی زبان بننے کی پاداش میں قید خانوں میں بھی رہنا پڑا۔ جب وہ اپنے اصولی موقف سے باز نہ آئے تب اُنھیں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔(60)

عوامی نظمیں کہنے کی پاداش میں ایک اور نامور ایرانی شاعر فرخی یزدی کے ہونٹ سی دیئے گئے۔(61)

الیگزنڈر پشکن کو جدید روسی ادب کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھیں مئی 1820 میں اپنی سیاسی نظموں کے باعث مولداویا کے جنوب میں جلا وطن کر دیا گیا۔(62) اسی طرح ہنگری کے عوامی زندگی کے حقیقی چہرے والے ادب کا سب سے بڑا شاعر شانڈور پیتوفی ۲۶ سال کی عمر میں شاہی فوج کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔(63)

موسیٰ جلیل نامور تاتار شاعر گذرے ہیں۔ جب دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو وہ فوج میں بھرتی ہو گئے اور سیاسی کاموں کی تربیت لے کر محاز پر چلے گئے۔ 1942 میں وہ دشمن کے گیرے میں آ گئے۔ وہ بہت زخمی تھا اور انھیں اسی طرح زخمی حالت میں پولینڈ میں ہیلم کے قریب قیدی کیمپ میں بند کر دیا گیا۔ سال کے آخر میں اُنھیں جنگی قیدیوں کے کیمپ میں بیج دیا گیا۔ اگلے برس برلن کے قریب دستراؤ کیمپ میں، جہاں خفیہ انجمن کی ہدایات کے تحت اُنھوں نے کام شروع کر دیا۔ 12 اگست 1943 کی رات کو انھیں وارسا جیل بھیجا۔ گیا اور بالاخر 1944 میں ڈرلیڈن کی عدالت نے اُنھیں گولی سے اڑا دینے کی سزا سنائی۔ انھیں سال کے آخر میں قتل کر دیا گیا۔ (64)

برصغیر پاک وھند کی ادبی تاریخ میں بھی کچھ نام ایسے آئے ہیں جنھوں نے عوام کی زبان بننے کی روایت کو برقرار رکھا۔ عوام کی حق حاکمیت کے لئے، آزادی اور سماجی انصاف کے لیے اُنھوں نے اپنا قلم وقف رکھا۔ ان لوگوں میں حبیب جالب، فیض احمد فیض، احمد فراز، شیخ ایاز وغیرہ کے نام خصوصی طور پر لئے سکتے ہیں۔

بلوچی زبان کو انقلابی لب ولہجہ عطا کرنے والے اور بلوچستان میں

ادبی انقلاب کے پیشوا میر گل خان نصیر کا تعلق بھی شاعروں اور ادیبوں کے اسی قبیلے سے ہے۔ آزادی، انصاف اور سماجی برابری کیلئے لڑتے ہوئے میر گل خان نصیر نے کئی برس پاکستان کے مختلف جیل خانوں میں گذارے۔ انھوں نے مختلف اذیتیں سہیں۔ جلاوطن رہے، نظر بندی اور روپوشی کے دن گذارے۔ قید تنہائی، جس بے جا اور جرمانے کا بھی اُنھیں سامنا کرنا پڑا۔ ان کی کئی کتابیں ضبط کر لی گئیں اسکے باوجود وہ اپنے اصولی موقف سے کبھی بھی دستبردار نہیں ہوئے۔ اُنھیں مختلف عہدوں کا لالچ دیا گیا، انھیں چمک دمک کے راستے دکھائے گئے مگر انھوں نے نہ کبھی جاہ طلبی کا مظاہرہ کیا اور نہ دولت کی چمک دمک سے وہ متاثر ہوئے۔ میر گل خان نصیر نے اپنی وابستگی اور نظریاتی تعلق کی بناء پر جتنی اذیتیں سہی نہ ان سے پہلے کے کسی ادیب اور شاعر کے اور نہ ان کے بعد کے کسی ادیب اور شاعر کے حصے میں اتنی اذیتیں آئیں۔

"۱۹۴۱ سے ۱۹۷۳ تک مجھے کئی بار جیل جانا پڑا۔ غالباً اس عرصے میں کوئی سال ایسا نہیں گیا جس میں مجھے جیل کی زیارت نہیں کرنی پڑی۔ نوشکی، مستونگ، قلات، مچ، کوئٹہ، قلی کیمپ، کراچی، ساہیوال اور حیدر آباد کے جیل خانوں میں مجھے جو مدتیں گذارنی پڑیں ان سے اگرچہ جسمانی

بیماریاں کئی لگ گئیں، سیاسی مزاج میں یاس واُمید کے کئی دور آئے اور گزر گئے لیکن میری شاعرانہ کیفیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی''۔(65)

جیل کے ایام کسی تخلیق کار کے لئے سکون اور یکسوئی سے کام کرنے کے بہترین دن ہوتے ہیں۔ادیبوں اور شاعروں نے جتنے دن جیلوں میں گزارے انھوں نے ادب کو بہترین تخلیق سے مالا مال بھی کیا۔فیض احمد فیض کے متعلق شیخ ایاز نے کہا تھا۔

''دستِ صبا'' اور'زنداں نامہ'' کو تخلیق ہونا تھا اس لیے فیض کو جیل جانا پڑا۔(66)

ترکی نامور شاعر ناظم حکمت نے زندگی کا بہت سا حصہ جیل خانوں میں گذارا ان کی جیل کے دنوں کی تخلیقات کا ذکر کرتے ہوئے فیض احمد فیض لکھتے ہیں۔

''ناظم حکمت کا نام ہم بُہت پہلے سے جانتے تھے کہ موجودہ دور میں ترکی زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔انگریزی میں ان کی نظموں کے تراجم کا ایک مختصر مجموعہ بھی لاہور میں ہاتھ آ گیا تھا جسے بُہت سے لوگوں نے بُہت شوق سے پڑھا۔یہ مجموعہ بیشتر حبسیات پر مشتمل ہے اور ناظم کے طویل ایامِ اسیری کی یادگار ہے۔چنانچہ میں اپنے جیل خانے کے دنوں میں ناظم

جوانی کے ایام کی ایک یادگار تصویر

کے جیل خانے کے ایام کا یہ مصرعہ اکثر یاد کرتا تھا؛

آلام کچھ بھی ہوں

اپنا نگینوں بھرا دل درخشاں رکھو(67)

ناظم حکمت نے زنداں سے جو آٹھ خطوط اپنی بیوی کے نام تحریر کیے وہ آج عالمی ادب کا حصہ بن چکی ہیں اور تقریبا دنیا کی اکثر زبانوں میں انکے تراجم ہو چکے، ہیں۔ اسی طرح جیولس فیوچک کی نظمیں اور انکے خطوط، موسیٰ جلیل کی ۱۱۵ نظمیں جیل میں تخلیق کی گئی ادب کا شاہکار تسلیم کیے جاتے ہیں۔

جیل کے ایام ایک طرف اگر سخت اور مشکل ہوتے ہیں تو دوسری طرف انسان کو سوچنے، سمجھنے اور غور و فکر کرنے ہر بھی مجبور کرتے ہیں جیل کے یہ ایام گو کہ میر گل خان نصیر کے لیے بھی تلخ تھے مگر بلوچی زبان و ادب کے لیے ان کے یہ تلخ ایام انتہائی سود مند ثابت ہوئے۔ اپنے ایک انٹریو میں میر گل خان نصیر کہتے ہیں۔

"۳۳ سال سے جیل جا رہے ہیں اور ہمارے لیے تو یہ اچھا ہی رہا۔ ایک ادبی شخص کے لیے جیل تحقیقی کام کا موقع فراہم کرتی ہے اور میں نے تو اردو اور بلوچی میں جتنی بھی کتابیں لکھی ہیں وہ جیل کے دنوں کی ہی دین

(68)
ہیں" میر گل خان نصیر کو پہلی دفعہ ۱۹۴۱ء میں جیل جانا
حقیقت کے اظہار کے جرم میں

(69)
پڑا۔
کے دنوں کی یادگار ہیں۔
مندرجہ ذیل تخلیقات وتحقیقات ان کی جیل،

دوستین وشیرین:

میر گل خان
اپریل ۱۹۶۲ء میں جب روالپنڈی کے ایک سینما ہال میں
نصیر نے ترکی کے نامور شاعر ناظم حکمت کی لکھی ہوئی فلم "شیرین فرھاد" دیکھی تو انھیں اس فلم نے تحریک دی کہ وہ "دوستین وشیرین" کی داستان کو اپنے معاشرتی پس منظر کے حوالے سے منظوم انداز میں ضبطِ تحریر میں لائیں۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کیلئے انھیں تنہائی اور یکسوئی کے لمحے چاہیئے تھے جو انھیں میسر نہیں تھے۔

"من ھمے بندو بوج ءَ اتاں کہ اگست ءِ ماہ ءَ ماتی وطن ءَ من یک مرد چکاسیں ہیروپے پاداحت او ہر ہما مرد ءَ کہ آئی دیم ترینگ ءِ کوشت ءَ کرت چوست ءَ چگل دات کہ تن انگا من سیاہ ءَ تہار گیں ڈکاں، وتی ٹپاں چٹنگا انت۔ روچے من چاراں کہ مچ ءِ گڑھیں زندان ءِ برز و بزیں پسلانی

نیامءَ کپتگاں۔'' (70)

ترجمہ: میں اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے منصوبہ بندی کرر ہا تھا کہ اگست کے مہینے میں وطن میں ایک طوفان برپا ہوا۔ جس نے بھی اس طوفان کا رخ موڑنا چاہا انھیں اس طرح اٹھا کر پھینک دیا گیا کہ وہ ابھی تک اندھیروں میں پڑے اپنے زخموں کو چاٹ رہے ہیں۔ ایک دن دیکھتا ہوں کہ میں مچھ جیل کے اونچے دیواروں کے پیچھے پڑا ہوں۔

میر گل خان نصیرؔ کو مچھ جیل میں تنہائی اور یکسوئی کے وہ لمحے میسر آئے جنکی انھیں تلاش تھی۔ انھوں نے مچھ جیل میں دوستین وشیرین کی داستان کو منظوم کرنا شروع کیا اور کراچی جیل میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ (71)

داستان حمل جیند:

بلوچوں کی تاریخ میں بہادری اور شجاعت کے کارنامے رقم کرنے والوں میں حمل کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ میر گل خان نصیرؔ نے حمل کی شجاعانہ کارناموں کو منظوم انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں لکھے گے ایک ''نوٹ'' سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی ابتداء ۲۲

جون ۱۹۶۶ء کے دن سنٹرل جیل کراچی سے کی اور یہ ۱۰ مارچ ۱۹۶۷ء کو بجلی گھر پولیس تھانہ کوئٹہ کے حوالات میں اختتام پذیر ہوئی۔(72)

ھپت ھیکل:

''ھپت ھیکل'' ایک تاریخی دستاویز ہے جو نواب نوروز خان اور ان کے بہادر ساتھیوں کے کارناموں پر مبنی ہے۔ان حالات اور واقعات کو بھی میر گل خان نصیؔر نے منظوم انداز میں بیان کیا ہے۔''ھپت ھیکل'' کا بیان ۱۹۶۸ء میں مختلف جیلوں میں تکمیل کو پہنچا۔میر گل خان نصیؔر بھی ان سرمچاروں کے ساتھ جیل میں مقید تھے جو تاریخ کے عمل کو تکمیل تک پہنچانے اور تاریخ بنانے والے تھے۔بہت ساری باتیں اور واقعات انھوں نے خود میر گل خان نصیر کو بتائے۔(73)

بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی:

میر گل خان نصیر نے بلوچستان کی تاریخ کو جہاں دوسرے پہلوؤں سے دیکھا اور پرکھا وہاں انھوں نے قدیم شاعری میں بھی بلوچستان کی تاریخ کے چیدہ چیدہ حالات اور واقعات کو دیکھا اور انھیں ضبط تحریر میں لایا۔بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ کتاب میر گل خان نصیر نے ۱۹۶۸ میں ساہیوال (پنجاب) کے ڈروانے جیل میں لکھا جسے بعد میں بلوچی اکیڈمی نے چھاپا۔(74)

بلوچی رزمیہ شاعری:

قدیم بلوچی شاعری کو تحقیقی نقطۂ نظر سے میر گل خان نصیرؔ نے بہت زیادہ اہمیت دی اور اس سلسلے میں انھوں نے بنیادی کام کیے۔ ۱۹۷۳ میں جب بلوچستان کی منتخب حکومت ختم کر دی گئی تو نیپ کی قیادت کو اسیر زنداں رکھا گیا ان میں میر گل خان نصیرؔ بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کو پہلے مچھ جیل میں اور بعد میں سنٹرل جیل حیدر آباد منتقل کر دیا گیا۔

"نازک مزاج حکمرانوں کی ناراضگی اور غضب کا شکار ہو کر پچھلے چار سال سے قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہا ہوں۔ تین سال بلوچستان کے سنٹرل جیل مچھ میں بسر کیے۔ اب پچھلے سال سے سنٹرل جیل حیدر آباد میں پڑا ہوں۔ پانچواں سال جا رہا ہے لیکن قفس سے رہائی پانے کی کوئی صورت اب تک نظر نہیں آتی۔

.... پورا ایک سال ہو چکا ہے کہ ہمیں سنٹرل جیل حیدر آباد میں جمع کیا گیا ہے۔ ابھی عدالتی کاروائی کی صرف ابتداء ہوئی ہے، مقدمہ پایہ تکمیل کو کب پہنچے گا اور کب ہمیں اپنی قسمتوں کا فیصلہ سنایا جائے گا؟ یہ بہت دور کی بات ہے، ممکن ہے کہ اس میں کئی برس اور لگ جائیں۔"(75)

سنٹرل جیل مچھ اور سنٹرل جیل حیدر آباد کے ماہ وسال تحقیق وتخلیق

کے حوالے سے انتہائی اہم ثابت ہوئے۔ اس دوران میر گل خان نصیر نے

بلوچی ادب کو تحقیق کے میدان میں مالا مال کر دیا۔ ان میں بلوچی رزمیہ

شاعری بھی شامل ہے۔

''مصنف سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس تصنیف کا آغاز

مچ جیل کے چیچک وارڈ میں ۱۴ جولائی ۱۹۷۳ کو ہوا اور وہیں پر ۲۷ دسمبر ۱۹۷۳

کو اختتام پذیر ہوا۔'' (76)

بلوچی عشقیہ شاعری:

''بلوچی عشقیہ شاعری'' دراصل ''بلوچی رزمیہ شاعری'' کا تسلسل

اور اس کا دوسرا حصہ ہے۔ جو قدیم بلوچی شاعری کے عشقیہ مضامین پر مشتمل

ہے۔ یہ کتاب حیدر آباد سنٹرل جیل میں پایا تکمیل کو پہنچا۔ اس کتاب کے

دیباچے میں میر گل خان نصیر عرض حال کے عنوان سے رقم طراز ہیں۔

''جیل سے باہر کی دنیا میں شاعر اور ادیب، فرصت کی جن چند

گھڑیوں کیلئے ترستے ہیں وہ یہاں پر، زندوں کے اس گورستان میں بکثرت

حاصل ہیں۔ رات ہو کہ دن، صبح ہو کہ شام، آدھی رات کا سماں ہو کہ دوپہر کی

کڑکتی دھوپ، جب بھی جی چاہے اٹھیں، بیٹھیں یا گھوڑے بیچ کر سوجائیں، کوئی امر مانع نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں، چودہ بارہ فٹ کی ایک کھولی کی جملہ کائنات آپ کے سپرد ہے۔

"گوشے میں قفس کے ہمیں آرام بہت ہے۔" (77)

سنٹرل جیل حیدرآباد کی نسبت سنٹرل جیل مچ میں میر گل خان نصیؔر کیلئے لکھنا اور تحقیق کرنا نسبتاً زیادہ آسان تھا۔

"سنٹرل جیل مچ میں ایک لحاظ سے ہمیں نوشت وخواند کی زیادہ سہولت حاصل تھی۔ جس کتاب کی ضرورت پڑتی، کوئٹہ قریب ہونے کی وجہ سے اور اپنے عزیزوں، خویش واقارب اور دوست واحباب سے ملاقاتوں میں آسانی کے سبب جلد مل جاتی تھی لیکن یہاں حیدرآباد میں آسانیاں میسر نہیں۔ اس لئے تصنیف وتالیف کا کام خاطر خواہ طور پر نہیں ہوسکتا۔" (78)

ان تمام مشکلات کے باوجود میر گل خان نصیؔر نے خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا اور بلوچی ادب کی گود کو موتیوں سے بھرتا رہا۔

سنٹرل جیل مچھ۔1973

سیناءِ کیچگ ءَ:

''سیناءِ کیچگ ءَ'' اردو کے نامور شاعر فیض احمد فیض کے شعری مجموعہ ''سرِ وادی سینا'' کا بلوچی ترجمہ ہے۔ میر گل خان نصیر اور فیض احمد فیض میں ایک مشترک قدر یہ بھی ہے کہ دونوں نے مختلف جیلوں میں ایک مدت گزار کر اس کی صعوبتیں جھیلی ہیں۔ جیل کی یاس انگیز زندگی کے احساسات اور جذبات کی چھبن کا تجربہ دونوں رکھتے ہیں۔

''میں پانچ سال کی طویل مدت تک مچھ اور حیدر آباد کے جیل خانوں میں بیرونی دنیا سے اوجھل پڑا رہا۔ جیل کے تلخ و تاریک دنوں سے متعلق وہی شخص بہتر جانتا ہے اور بول سکتا ہے جس نے وہاں پر ایک مدت گزار کر اس کی صعوبتیں جھیلی ہوں۔ جناب فیض احمد فیض نے بھی جیل کی ایک یاس انگیز زندگی دیکھی ہے اور ان جذبات و احساسات کی چھبن کا تجربہ رکھتے ہیں جو وہاں پر ایک شاعر کے حساس دل کو ٹھیس لگاتی اور بے قرار کرتی ہے ان کے جذبات کو ابھار ابھار کر اس سے وہ تابناک و تابدار اشعار کہلواتی ہے جو ہر روح کو گرمانے اور دل کو تڑپانے کی تاب رکھتے ہیں۔

جیل کے انہی دنوں مجھے فیض احمد فیض کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے

اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کے کلام نے مجھے رفتہ رفتہ ایسا مسحور کیا اور میرے دل میں ایک ایسی امنگ پیدا کر دی جو کسی بھی شاعر کے دل کو جلا بخشتی اور گفتار کی لڑی پرونے پر مجبور کرتی ہے۔ فیض کے اشعار اور جیل کی تنہائی نے مجھے یہ ترغیب دی کہ فیض کے ساتھ روحانی طور پر ایک بلوچی کچہری میں ھمنیاد ہونے کی صورت پیدا کروں۔ اس وقت ان کے اشعار کا مجموعہ ''سر وادی سینا'' میرے زیر مطالعہ تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس سے ہی ابتداء کروں۔'' (79)

اس طرح جیل ہی میں فیض احمد فیض سے میر گل خان نصیر کی روحانی طور پر بلوچی کچہری تکمیل کے مرحلے تک پہنچ گئی جو بلوچی ادب کے لئے دو حوالوں سے انتہائی مفید ثابت ہوئی۔ پہلا حوالہ یہ کہ بلوچی تراجم میں ایک اچھے اور معیاری کتاب کا اضافہ ہوا۔ جبکہ دوسرا حوالہ یہ کہ بلوچی ادب کے لکھنے اور پڑھنے والے فیض احمد فیض کو اپنے تجربوں کی روشنی میں دیکھنے لگے، یہ اس لیے ہوا کہ فیض احمد فیض نے بلوچی ادب کے بہت سے پڑھنے اور لکھنے والوں پر اس ترجمے سے پہلے بھی اپنے اثرات مرتب کیے تھے۔

حون ءِ گوانک (لہو کی پکار):

یہ میر گل خان نصیر کا شعری مجموعہ ہے جسے اردو ترجمے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس شعری مجموعے کی تمام شاعری سنٹرل جیل مچھ اور سنٹرل جیل حیدرآباد کے ایامِ اسیری کے زمانے کی شاعری ہے۔

اس شعری مجموعے میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء سے لے کر ۳۰ مارچ ۱۹۷۶ء تک مچھ جیل کی شاعری جبکہ ۱۵ جون ۱۹۷۶ء سے لیکر ۲۴ ستمبر ۱۹۷۷ء تک سنٹرل جیل حیدرآباد کی شاعری شامل ہے۔ اس شعری مجموعے کا پیش لفظ بھی سخن ہائے گفتنی کے عنوان سے ۲۳ مارچ ۱۹۷۷ء میں سنٹرل جیل حیدرآباد سے میر گل خان نصیرؔ نے تحریر کیا۔

سنٹرل جیل مچھ میں مشاعروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ سنٹرل جیل حیدرآباد تک برقرار رہا اور ان ہی مشاعروں میں سننے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد چونکہ بلوچی زبان سے نابلد تھی اس لیے انھیں اپنے بلوچی کلام کا اردو ترجمہ بھی پیش کرنا پڑا اور اس کام کیلئے انھیں پرویز سلیم بلوچ کا خصوصی طور پر مدد و تعاون حاصل رہا۔ (80)

''میرے اشعار جہاں، میرے رنگین مزاج ہم وطنوں کو پسند نہیں آتے وہیں صاحبانِ اقتدار بھی ان سے چیں بہ جبین رہتے ہیں۔ گزشتہ تیں

چالیس برسوں سے اب تک متواتر میں ان کے جبر و ستم کا نشانہ بنا چلا آ تا ہوں لیکن مجھے ان سے گلہ نہیں ہے اور نہ ہی اس پر نادم ہوں بلکہ اس کے برعکس اس خیال سے سرشار رہتا ہوں کہ حسبِ مقدور اپنی قوم اور وطن کے کام آ رہا ہوں۔ اس وقت بھی جب یہ سطور لکھ رہا ہوں سنٹرل جیل مچھ میں تین سال گزارنے کے بعد اب سنٹرل جیل حیدر آباد میں محبوس ہوں۔ پچھلے چار سالوں سے جیل و زنداں کی صعوبتیں جھیل رہا ہوں اور شاداں ہوں کہ اس عمر میں بھی میرے حوصلے اب تک پست نہیں ہوئے ہیں۔" (81)

گلگال:

میر گل خان نصیؔر کے اس شعری مجموعے کے متعلق میر غوث بخش بزنجو اسی شعری مجموعے کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"بلوچستان کو تین مرتبہ فوجی آپریشن کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی دفعہ اسکندر مرزا کے زمانے میں، پھر ایوب خان کے دور میں اور آخری مرتبہ بھٹو کے زمانے میں ان ایام میں ہم اکھٹے تھے۔ کبھی جیل جاتے اور کبھی باہر آتے۔ ایوب خان کے زمانے میں ہم تقریباً چھ مہینے قلی کیمپ میں رہے اسکے بعد کے دو سال حیدر آباد جیل میں ہم نے اکھٹے گزارے" (82)

میر گل خان نصیر کی شاعری کے متعلق میر غوث بخش بزنجو کا کہنا ہے۔

''میر گل خان نصیؔر نے جتنی بھی جاندار اور زندہ شاعری کی ہے وہ سب جیل اور زندانوں میں تخلیق ہوئی ہیں۔ ان کی بہترین شاعری یا قلی کیمپ کے زمانے کی ہیں یا پھر کوئٹہ جیل اور منگمری کے زمانے کی۔ (83)

انکے علاوہ میر گل خان نصیؔر کے اور بہت سے تخلیقی و تحقیقی کارنامے ہیں جن کا یا تو آغاز جیل اور زندانوں میں ہوا یا پھر وہ یہیں تکمیل کے مرحلے تک پہنچے۔ مجاہد بریلوی کو اپنے ایک انٹرویو میں انھوں نے ایک اور کتاب کا ذکر کیا تھا جسکا نام انھوں نے ''بلوچستان کا تعارف'' بتایا تھا کہ جس میں بلوچستان میں بسنے والے قبائل، ان کے رہن سہن، ادب وثقافت اور قدرتی وسائل کے بارے میں تفصیل درج ہیں۔ (84)۔ یہ کتاب غالباً بعد میں ''بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں'' کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

جیل میں شیر محمد مری اور سلطان محمد خان مینگل ان لوگوں کو بلوچی بھی پڑھاتے تھے۔ جو اس زبان سے نابلد اور ناآشنا تھے۔ انکے ہاں بلوچی پڑھنے والے اکثر طالب علم پھر میر گل خان نصیؔر سے ضرور رجوع کرتے۔ (85)

جیل میں وہ اکثر مشاعروں کا اہتمام بھی کرتے وہ اپنے

ساتھیوں کے ساتھ گوکہ ایک ہی احاطے میں محبوس نہیں تھے۔ مگران کے ملنے جلنے پرکوئی پابندی بھی نہیں تھی۔ حبیب جالب کی موجودگی میں قیدی شعراء نے مشاعروں کا باقاعدہ اہتمام کیا۔ محفلِ شعروسخن کا یہ سلسلہ ہر اتوار کو سجتا۔(86)

''اگر لکھنے پڑھنے میں تھوڑی سی دلچسپی ہواور مطلوبہ کتابیں دستیاب ہوسکیں تو قیدوبند کے یہ تلخ ترین ایام بھی ہنسی خوشی گزارے جاسکتے ہیں۔ وقت کی بہتات سے خاطر خواہ استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اور زندگی کے احساسِ زیاں کو بھلایا جاسکتا ہے۔'' (87)۔

میر گل خان نصیر نے جس جدوجہد کے تسلسل کو اپنایا اس کیلئے وہ جیل جانے کیلئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ وہ چونکہ زندہ رہنا اور کام کرنا چاہتے تھے اس لیئے انھیں زندہ رہنے کی اسی تڑپ نے زندانوں کی کال کوٹھڑیوں کو آباد کرنے کی جرات دی۔ وہ اس بات کو ضروری سمجھتے تھے کہ پسِ زنداں بھی، زندگی کو جلا بخشنے اور کارآمد بنانے کیلئے کوئی کام کریں۔ انھیں وقت کی اہمیت کا احساس تھا اور اسی احساس کے پیشِ نظر وہ وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے، وہ ہمہ وقت اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہتے تھے تاکہ ان پر سستی اور کاہلی غلبہ نہ پائے اور ان کا مسلک نظروں سے اوجھل

نہ ہو جائے۔ وہ اپنے آنے والے نسلوں کیلئے کچھ آثار چھوڑ دینا چاہتے تھے ایسے آثار جو قوم اور وطن کیلئے مفید ہوں اور جن سے استفادہ کیا جاسکے۔(88)

ناظم حکمت نے ''زنداں سے ایک خط'' (مترجم: فیض احمد فیض) لکھ کر اپنے خوابوں کے ساتھ اپنی دلی وابستگی کا اظہار کیا اور اپنی عزم و ہمت سے نیند کو وہی کچھ بخشا جو اس کا حصہ تھا۔(89)

''مجھے زنداں میں پیار آنے لگا ہے اپنے خوابوں پر''

فیض احمد فیض نے ''زنداں کی ایک شام''، ''زنداں کی ایک صبح'' اور ''قید تنہائی'' میں اپنی کیفیت اور زندگی کے ساتھ اپنی تعلق کا اظہار کیا۔(90)

میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں اُمید کے جلتے ہوئے تیر

میر گل خان نصیر نے بھی لکھا ''سنٹرل جیل حیدر آباد'' اور ''زندانِ شپ'' (زنداں کی رات) سورج نکلنے کے باوجود رات کی تاریکی کے نہ ٹلنے پر وہ چودھویں کی چاند کو خوبرو بیوہ کی طرح تباہ حال دیکھتا ہے۔

انھیں اس بات کی فکر نہیں کہ حیدر آباد کے کھا جائے اور کسے باہر پھینکے کیونکہ وہ زندگی کو اللہ تعالیٰ کی دین سمجھتے ہیں۔ ''زندان ءِ شب'' (زنداں کی رات) میں وہ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

زندان کی رات:

۱۔ شبِ سیاہ رو، لیکے یادوں کے
دردھائے گراں کی ٹیس چھبن
ٹوٹ پڑتی ہے آکے زندان میں
دل، تصور کا ہمنوا ہوکر
دیکھ لیتا ہے ہر دم و لحظہ
برقِ فکرو نظر کی کوند، لپک
۲۔ یاد ان کی جو دل کو پیارے ہیں
کھرِ دراہٹ سی دل کو ملتی ہے
زندگی بے بھروسہ لمحہ ہے
اور تنہائی میں نہیں اچھی
۳۔ رات آتی ہے، پھول جیسا دل
بجھ کے پژمردہ ہو ہی جاتا ہے
گہری فکروں کے ملگجے بادل
اس پہ چھا جاتے اور برستے ہیں
اور کھو جاتا ہے خیالوں میں
ان گراں مایہ دوستداروں کے
جو بہت دور ہیں نگاہوں سے
۴۔ دل جلا دینے والے اندیشے
اور فکر و خیال کے وسواس
آرزوں کے موجزن لمحے
ساتھ لے کر، اُمڈ کے آتے ہیں

بن کے دل دوز نشتر و سوزن
آرزو دل پہ وار کرتی ہے۔
دردِ فرقت کے دھندلے گردو غبار
بن کے ارمان ، دل سے اٹھتے ہیں
۵۔ بند طوطے کی طرح پنجرے میں
دل مچلتا ہے ، پھڑ پھڑاتا ہے
جسمِ درماندہٗ و پریشاں کو
اور بھی زیادہ یوں دکھاتا ہے
جیسے کف بار موجیں دریا کی
ایک پیراک کو تھکاتی ہیں
۶۔ کبھی پوشیدہ اور کبھی ظاہر
ماژو دوست، شیر دل ساتھی
جلوے دکھلاتے ہیں مجھے اپنے
نگہ برق دم تصور میں
پھر بھی تسکین دل نہیں ہوتی
اور نہ دل کو قرار ملتا ہے
۷۔ شب سیہ ، قبر کی سی تنہائی
شکمِ اژدھائے زنداں میں
آرزوؤں کے واسطے بے شک
اک جہنم ہے، بلکہ اس سے بتر
قاتلِ روح و دشمنِ جاں ہے
۸۔ زندگی بھر قبول ہے پھر بھی
ہم کو آزادی وطن کیلئے
قید و زنداں کی، یہ تنہائی

ہم نے جو مادرِ وطن کیلئے
شرط پر رکھ دیئے ہیں سر اپنے
اس کو پایا ہے سرفروشی سے
لاج پہ اپنی کٹ کے مرجانا
شرمگیں زندگی سے بہتر ہے
اس لئے زندگی کو ہم اپنی
کرتے ہیں اپنی آبرو پہ نثار

۹۔ آج دل کھوگیا خیالوں میں
اور نصیر اس کو ، لاڈ کے باوصف
صبرو تسکین دے نہیں سکتا
گیسوئے شوق کو تصور نے
پیار کے دوش پر سنوارا ہے
اور پرکیف جام، یادوں کا
خواہشوں نے اسے پلایا ہے۔ (91)

میر گل خان نصیر، فیض احمد فیض، حبیب جالب، احمد فراز یا شیخ ایاز اور اسی طرح پابلو نرودا، ناظم حکمت، پشکن، محمود درویش، گارسیا لورکا اور موسیٰ جلیل الگ الگ زبانیں بولنے والے، الگ الگ تہذیبوں میں پلنے والے، اپنی اپنی قوم اور مٹی سے پیار کرنے والے اور اپنی اپنی جنگیں لڑنے والے لوگ تھے اسکے باوجود وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی جدوجہد میں شامل رہے اور اپنے خیالات اور نظریات کی بدولت آنے والے وقتوں میں بھی لوگ ناظم حکمت، گل خان نصیر، فیض احمد فیض اور دوسروں میں اپنا چہرہ، اپنی خوشی، اپنا غم حتیٰ کہ اپنا وجود دیکھ پائیں گے۔ بلغاریہ کے نامور شاعر نکولا واپستاروف کے بقول۔

ہم اس دکھ کی اس درد کی قیمت نہیں مانگتے
اور ہم کوئی بدلہ، صلہ یا شہرت نہیں مانگتے
اور ہم نہ کیلنڈر کی تصویر بننا چاہتے ہیں
جو ہمارے بعد آئیں گے، ان کو یہ بات بتا دینا
کہ ہم ایک زندگی، ایک خواب، ایک بت گھڑتے رہے
اور روشنی کو پانے کیلئے، اندھیرے میں لڑتے رہے

بلوچی ادب میں مقام:

میر گل خان نصیر کو بلوچی ادب اور شاعری میں ''ملک الشعراء'' کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جو ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ یہ اعزاز کسی سرکاری تقریب میں حکومتی سطح پر انھیں نہیں دی گئی بلکہ بلوچی زبان و ادب کے لئے ان کی بے پناہ خدمات کے پیش نظر شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے انھیں اس اعزاز سے نوازا۔ (92)

بلوچی ادب میں میر گل خان نصیؔر کو جو مقام اور درجہ حاصل ہے وہ شاید بلوچی ادب میں ابھی تک کسی بھی ادیب اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گل خان نصیؔر بلوچی ادب کے ایک ''پلر'' کی مانند ہیں۔ عطا شاد نے پلر کے لفظ کو بڑی سوچ بچار کے بعد استعمال کیا۔ اصل میں اگر ہم گل خان نصیر کی شاعری کو بلوچی ادب سے الگ کر دیں یا نکال دیں تو شاید ادب کا یہ محل گر تو نہ جائے مگر کمزور اور بدنما ضرور نظر آئے گی۔ (93)

میر گل خان نصیر کی فن اور شخصیت پر سب سے زیادہ مقالے لکھے گئے جو انگریزی، اُردو اور بلوچی زبان میں وقتاً فوقتاً چھپتے

رہے۔ مختلف رسالوں نے میر گل خان نصیر پر خصوصی شمارے اور نمبرز شائع کیے ان رسالوں میں ماہنامہ بلوچی کوئٹہ، ماہنامہ زمانہ کوئٹہ، ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان، تپتان کراچی ماہنامہ بلوچی زند، کوئٹہ اور ماہنامہ لبزانک حب شامل ہیں۔ اسکے علاوہ ماہنامہ چاگرد کوئٹہ اور ماہنامہ آساپ تربت میں بھی میر گل خان نصیر کی فن اور شخصیت پر مختلف اوقات میں مضامین چھپتے رہے ہیں۔ ان بلوچی ماہناموں میں ''میری پسند'' کے عنوان سے پڑھنے والے اکثر میر گل خان نصیر کے کلام سے انتخاب لیتے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھار پورے کا پورا صفحہ میر گل خان نصیر کے منتخب اشعار سے مزین ہوتا۔(94)

میر گل خان نصیر کی برسی کی مناسبت سے بلوچستان کے مختلف شہروں میں تقاریب کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ان شہروں میں کوئٹہ، تربت ،نوشکی، پنجگور، خضدار، مستونگ وغیرہ شامل ہیں۔ بلوچی زبان وادب اور خصوصاً جدید بلوچی شاعری میں میر گل خان نصیر نے سب سے بڑھ کر اثرات مرتب کیے۔ اپنے عہد میں میر گل خان نصیر سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ زبان میں خامیوں کے باوجود انکی شاعری اس عہد میں سب سے زیادہ پڑھی اور پسند کی جاتی ہے۔(95)

ان کی جدوجہد بلوچستان کی تاریخ کا ایک مکمل باب ہے

ایسا باب جسے پڑھے بغیر بلوچستان کو سمجھنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

سیاسی جدوجہد سے قطع نظر میر گل خان نصیر نے جو ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ خود ایک ایسا گراں نمایہ ورثہ ہے جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔(96)

میر گل خان نصیر نے جدید بلوچی شاعری کو ایک نئے طرز اور آہنگ سے متعارف کرایا۔ بلوچی ادب اور شاعری پر میر گل خان نصیر نے گہرے نقوش مرتب کیے ہیں جنکی چھاپ کافی عرصے تک دکھائی دے گی۔

''میں یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا کہ بلوچی میں کم از کم اس صدی میں اتنے بڑے شاعر نے جنم نہیں لیا۔''(97)

جہاں میر گل خان نصیر کی فن اور شخصیت پر بہت سارے نثری مواد موجود ہیں وہاں شعراء نے بھی میر گل خان نصیر کو ان کے بیش بہا کارناموں کے پس منظر میں خراج عقیدت پیش کر کے ان مواد میں اضافہ کیا۔ ان شعراء میں عطا شاد، صدیق آزات، امیر الملک مینگل، یوسف گچکی، ن م دانش، سید قمر ہاشمی، نجم الحسن عطا، نائلہ قادری، محمد نصیر کبدانی، آغا حضرت شاہ، نوشین قمبرانی اور بہت سے دوسرے شعراء کے نام شامل ہیں۔

میر گل خان نصیر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ بلوچی زبان وادب کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

میر گل خان نصیر نے جدید شعراء کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔

''مجھے اس بات پر فخر ہے کہ مجھے نصیر کی شاعری سے حوصلہ ملا اور آج اگر بلوچی ادب میں ادیبوں کی صف میں میرا شمار ہوتا ہے تو اس کا سبب میر گل خان نصیر کا پہلا شعری مجموعہ ''گلبانگ'' ہے کہ جسے پندرہ سال کی عمر میں، میں نے پڑھ کر حفظ کر لیا۔''(98)

لینن پرائز:

روس کی حکومت نے فیض احمد فیض کو جب ''لینن پرائز'' سے نوازا تو ان کے ساتھ ساتھ روس کی حکومت میر گل خان نصیر کو بھی ''لینن پرائز'' دینا چاہ رہا تھا۔ مگر اس وقت کی حکومت نے انھیں ماسکو جانے کی اجازت نہیں دی۔(99)

ستارہ امتیاز (صدارتی ایوارڈ):

میر گل خان نصیر اپنی زندگی میں ہمیشہ حکمرانوں کے زیرِ عتاب رہے۔ نظر بندی، جلاوطنی، جیل اور جرمانے کا انھیں ہر وقت سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کی کئی کتابیں بھی بحق سرکار ضبط کر لی گئیں۔ بالآخر حکمرانوں کو بھی میر گل خان نصیر کے کارناموں کا اعتراف کرنا پڑا۔ زندگی کے مختلف شعبوں

سے تعلق رکھنے والے ۱۲۷ ممتاز شخصیات کو یوم ِ پاکستان کے موقع پر ایوارڈز دیئے گئے، ستارہ امتیاز حاصل کرنے والوں میں میر گل خان نصیر کا نام بھی شامل تھا۔ جنھیں ادب (شاعری) کے شعبے کے لئے ان کی گراں بہا خدمات کے پیشِ نظر منتخب کیا گیا۔ ادب کے شعبے میں ستارۂ امتیاز حاصل کرنے والوں میں ڈاکٹر الیاس عشقی، پروفیسر ڈاکٹر علامہ نصیر الدین ناصر، کشور ناہید اور میر گل خان نصیر کے نام شامل ہیں۔ جبکہ صدارتی تمغہ حسن کارکردگی (پرائیڈ آف پرفارمنس) حاصل کرنے والوں میں جون ایلیا (شاعری)، مرزا محتشم علی بیگ (ادب)، ہمیش خلیل (پشتو ادب) مسٹر زوان وی زو (ادب) کے نام شامل تھے۔ (100)

خصوصی مطالعہ:

بلوچی زبان و ادب کے نامور شاعر، ادیب اور دانشور صدیق آزات نے اپنے ایک مضمون میں میر گل خان نصیر کے متعلق لکھا تھا۔

''دوسری قومیں نصیر جیسے قد کاٹ رکھنے والے اپنے شعراء پر تحقیق کرتے ہیں۔ ان پر مقالے اور کتابیں لکھتے ہیں۔ اپنے کالجز اور یونیورسٹیز میں ان کے نام کی نشست مختص کرتے ہیں''۔ (101)

مختلف جامعات میں ایم اے کے نصاب میں "خصوصی مطالعے" کے طور پر ان شخصیات کا انتخاب کرتے ہیں جن کے کارناموں کا ایک زمانہ معترف ہو۔ انگریزی ادب میں شکیپئیر جیسے شاعر اور ڈرامہ نگار، فارسی اور اردو ادب میں فردوسی، سعدی، غالب، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض جیسے شاعروں کے نام آتے ہیں۔ خصوصی مطالعے کیلئے شخصیت کا انتخاب کرتے ہیں قدیم اور جدید ادب کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جامعہ بلوچستان میں شعبہ بلوچی کے ایم اے کے نصاب کیلئے میر گل خان نصیر کو خصوصی مطالعے کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ جو سو (۱۰۰) نمبروں پر مشتمل ایک الگ مضمون (پرچہ) کی حیثیت رکھتا ہے۔ شعبہ بلوچی کے ڈیپارٹمنٹل بورڈ آف اسٹڈیز میں خصوصی مطالعے کیلئے قدیم ادب سے مست توکلی، جام درک اور ملا فاضل جبکہ جدید ادب سے میر گل خان نصیر، سید ظہور شاہ ہاشمی اور عطا شاد کے نام زیرِ غور رہے جن میں میر گل خان نصیر کے نام پر اتفاق کیا گیا۔ اس سے گل خان شناسی میں کافی مدد ملے گی۔ (102)

مین آف دی سنچری:

روزنامہ انتخاب حب بلوچستان کا ایک معروف اور معتبر اخبار ہے جسکے مدیر نامور ادیب، شاعر اور دانشور انور ساجدی ہیں۔ یہ اخبار ویسے تو پورے پاکستان اور خلیجی ممالک میں پڑھی جاتی ہے مگر بلوچستان میں اس اخبار کے پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اس اخبار نے نئی صدی

کے آغاز سے ''مین آف دی ملینئیم'' اور ''مین آف دی سنچری'' کے انتخاب کیلئے ایک سروے کا اہتمام کیا جسکی رو سے پڑھنے والوں سے رائے طلب کی گئی۔

۲۴ اپریل ۲۰۰۰ء کو اس مقابلے کے نتائج کا اعلان ہوا۔ اس اعلان کی رو سے ایک ہزار سال کی سب سے عظیم بلوچ شخصیت میر چاکر خان رند قرار پائے جبکہ صدی کی سب سے اہم ترین بلوچ شخصیت کیلئے میر گل خان نصیر کا نام سرِفہرست رہا۔ میر چاکر خان رند کیلئے ۱۶،۹۳۲ رائے دہندگان نے رائے دی تھی جبکہ میر گل خان نصیر کیلئے ۱۶،۱۶۵ رائے دہندگان نے رائے دی۔

صدی کی شخصیت کے لئے رائے دہندگان کی رائے اس طرح تھی۔

۱۔ میر گل خان نصیر	۱۶،۱۶۵
۲۔ جسٹس خدا بخش مری	۳۶۶۷
۳۔ محمد سردار خان گشکوری	۳۱۶۱
۴۔ آغا نصیر خان احمد زئی	۱۶۸۲
۵۔ میر شیر محمد مری	۱۶۰۷
۶۔ صورت خان مری	۹۰۶

۷۔عبدالحکیم بلوچ۔	۸۲۳
۸۔امان اللہ گچکی	۷۶۱
۹۔میر عاقل خان مینگل	۶۵۵
۱۰۔ملک محمد پناہ	۶۳۹
۱۱۔جان محمد دشتی	۶۳۷
۱۲۔محمد بیگ بیگل	۶۳۱
۱۳۔بابو عبدالکریم شورش	۵۳۸
۱۴۔ملک محمد سعید دہوار	۳۴۵
۱۵۔م۔طاہر (مرزا طاہر)	۳۲۷
۱۶۔بشیر احمد بلوچ	۳۱۶

اس طرح میر گل خان نصیر کا نام صدی کی اہم ترین بلوچ شخصیت کے طور پر سرِ فہرست رہا۔(103)

منسوب انتساب:

شاعر اور ادیب اپنی تخلیقات و تالیفات کو کئی دفعہ کسی ایسی شخصیت کے نام منسوب کرتے ہیں کہ جس نے مجموعی طور پر زندگی کے مختلف شعبوں

میں متاثر کن کردار ادا کیا ہو۔ بہت سے ادباء وشعراء نے اپنی تخلیقات و تالیفات کو میر گل خان نصیر کے نام سے منسوب کیا ہے۔ دو کتابوں کو بطورِ مثال پیش کرر ہے ہیں۔

پہلی کتاب براہوئی زبان و ادب کے نامور ادیب قیوم بیدار کی براہوئی زبان وادب (ایک جائزہ) کا انتساب۔

انتساب

بلوچستان

کے محقق

مورخ

شاعر

اور

اپنے

بزرگ

میر گل خان نصیر (مرحوم)

کے نام (104)

آغا میر نصیر خان احمدزئی کی کتاب The Grammar of

Balochi Language کا انتساب

I feel proud to dedicate this book to the memory of Mir Gul Khan Naseer the renowned poet and historian of the baloch people wo devoted is whole life for their betterment.105

حبیب جالب اور دوسرے احباب کے ساتھ

شاعری:

جب ہم میر گل خان نصیر کی شخصیت کیلئے ہمہ جہت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو بلاشبہ مختلف شعبوں میں ان کی کاوشوں اور کارہائے نمایاں دیکھ کر ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ شاعری اس لیے ان کا بنیادی حوالہ ہے کہ انھوں نے جس انداز میں شاعری کی ابتداء کی مرتے دم تک اس کا ساتھ بھی اسی ولولے کے ساتھ نبھایا۔ ان کی شخصیت کے دوسرے شعبوں میں مختصر مدت کیلئے یا ہمیشہ کیلئے جو خلا نظر آتی ہے وہ خلا ان کی شاعری میں کہیں نظر نہیں آتی۔ 1941ء میں سب کچھ تیاگ کر جب وہ سیاست کے میدان میں عملی طور پر سرگرم ہوئے تب بھی شاعری ان سے نہ چھوٹ سکی اور ان کی شاعری سیاست کے ساتھ ساتھ چلتی، پھلتی اور پھولتی رہی۔ (106)

بلوچی میں ان کی پہلی نظم ''بیا او بلوچ'' نہ صرف جدید بلوچ شاعری کا نقطہ آغاز ثابت ہوا بلکہ اس نظم کے وسیع کینوس سے ایک طرف گل خان نصیر کی اپنی فکری رویئوں کا تعین ہوا تو دوسری طرف اس نظم کے اثرات اتنے گہرے پڑے کہ اس وقت جس نے بھی بلوچی شعر و ادب کے میدان میں قومی سوچ اور کمٹڈ موضوعات کے ساتھ قدم رکھا وہ اس نظم کی سحر انگیزی اور وسیع اثر سے

اپنا دامن نہ بچا سکا۔

حقیقی ادب کیلئے نقاد ایک معیار بھی مقرر کرتے ہیں کہ حقیقی ادب کو اپنے عہد کے تمام مسائل و حقائق کو اُجاگر اور واضح کرنا چاہیے اور اسے صرف جمالیاتی وفنی وجود کے گنبدِ عاج میں پناہ گزین نہیں ہونا چاہیے، میر گل خان نصیر کی شاعری بہ حیثیت مجموعی بلوچی ادب کی روح، تاریخ، ثقافت اور معاشرتی تغیر وتبدل کا شاید ہے۔انھوں نے جب شاعری کو اظہار کا ذریعہ بنایا تو اس سے انھوں نے نہ صرف نازک ترین داخلی جذبات و احساسات کی عکاسی کا کام لیا بلکہ انھوں نے شاعری کے ذریعے اپنے عہد کی تاریخی سچائیوں اور معروضی صداقتوں کا احساس بھی دلایا۔دراصل یہی شاعری کی حقیقی معراج بھی ہے۔

''گل خان نصیر اپنے عہد کے شاعر تھے۔انھوں نے بلوچی شاعری کی قدیم اور کہنہ روایات کو تخلیقی انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے انھیں ایک نیا رنگ اور نئی معنویت عطا کی۔ان کی شاعری ہیت کے قدیم اور مروجہ سانچوں کو اپنانے کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی، جدت طرازی، تنوع اور حقیقت نگاری کا ایک رنگارنگ مرقع ہے۔وہ

جس عہد میں سانس لیتے تھے اس عہد کی سچائیوں کو
انھوں نے جانا، پرکھا، اپنایا اور پھر انھیں زبردست فن
کارانہ صلاحیتوں کے ذریعے دلوں میں اُتر جانے والے
فن پاروں کی شکل میں پیش کردیا۔

وہ حقیقی زندگی کی سچائیوں کے شاعر تھے۔ ان
....
کے فن کا مقصد زندگی کو حرارت بخشنا، اسے ایک نئی بالیدگی
عطا کرنا اور اسے زیادہ خوبصورت بنانا تھا۔ ان کی شاعری
گہری ایمائیت کی حامل تھی۔ (107)

میر گل خان نصیرؔ لفظوں کے شعری استعمال سے نہ صرف تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ترین شاعر ہے بلکہ انھوں نے قوم کی تہذیبی بنیادوں کے اندر سانس لینے والے اشعار بھی کہے۔ گل خان نصیرؔ کا شمار ان ہستیوں میں ہوتا ہے جو خود تاریخی عمل اور اپنے عہد کے حالات پر اثر انداز ہوئے۔ اپنی توانا فکری، کمال فن اور سچائی پر غیر متنزلزل یقین رکھنے کی وجہ سے لوگوں کی اجتماعی شعور تک دستک دینے میں وہ کامیاب رہے، اس لیے ان کی شاعرانہ شخصیت کے لیے خوبصورت ترین جملے کہے اور لکھے گئے۔

☆ ۔جدید بلوچی شاعری کا نقطہ آغاز۔

☆ ۔شعوری عہد کی ابتداء۔

☆ ۔حقیقی زندگی کی سچائیوں کا شاعر۔

☆ ۔عوامی، انقلابی اور عہد آفرین شاعر۔

☆ ۔معاشرہ ساز صلاحیتوں کے مالک۔

☆ ۔اپنے عہد کا استعارہ۔

☆ ۔بلوچی ادب کی روح۔

☆ ۔تاریخ، ثقافت اور معاشرتی تغیر و تبدل کا شاید وغیرہ وغیرہ۔

صرف یہی نہیں گل خان نصیؔر نے بلوچی شاعری میں بہت سے بنیادی حوالے متعارف کرائے۔نظم جس رنگ اور ڈھنگ میں آج اگر بلوچی شاعری میں وجود رکھتی ہے یہ میر گل خان نصیؔر کی محنتوں کا ثمر ہے۔اس سے پہلے اس شکل میں بلوچی شاعری میں نظم موجود نہیں تھی۔(108)

''..... میر گل خان نصیر اور آزات جمالدینی نے بھی غزل کی آباری کی، تاہم ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بلوچی کے شعری ادب اور جدید نظم کے ارتقاء کا فریضہ انجام دے کر اسے ایک مستقل اور توانا صنف کی حیثیت سے بلوچی شاعری کا حصہ بنادیا۔''(109)

میر گل خان نصیر کی شاعرانہ شخصیت جب اپنے معاشرے میں خود کو

شریک کرتی ہے تو یہ اس زمانے اور عہد کیلئے ایک لہر کی مانند ہوتی ہے، جس طرح ٹھہرے ہوئے پانی میں کسی نے پتھر پھینک دیا ہو اور جس طرح پورا پانی اس ہلچل کو محسوس کرے بالکل اسی طرح گل خان نصیرؔ کی شاعرانہ شخصیت نے پورے سماج میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔ ان کے شاعری کی ایک انفرادیت یہ بھی رہی کہ وہ کسی ایک مخصوص لہجے کا پابند نہیں رہا۔

''میر گل خان نصیرؔ کا بلوچی زبان و ادب اور شاعری میں ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی بلوچی شاعری میں نہ صرف ٹھیٹھ بلوچی الفاظ استعمال کیے بلکہ بروہی، فارسی اور اُردو کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ ان کی بلوچی میں، بلوچی زبان کے تینوں لہجے آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی بلوچی زبان کسی ایک لہجے کی زبان نہیں ہے۔ نصیرؔ بلوچی شاعری کی تاریخ کا وہ پہلا بلوچ شاعر ہے جس نے کسی مخصوص علاقائی یا مقامی لہجے تک اپنی شاعرانہ لغت کو محدود نہیں رکھا بلکہ بلوچستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی بلوچی زبان کے مختلف لہجوں اور بلوچستان سے باہر کی زبانوں کے الفاظ کو ہم آہنگ کر کے اپنا شاعرانہ لہجہ اور اسلوب وضع کیا۔ یہ بات ان کے ادبی نقطہ نظر کی کشادگی اور ترقی پسندانہ وسیع النظری کی دلیل ہے۔'' (110)

اپنے ہم عصر بلوچی زبان کے شعراء سے انھیں یہ بھی انفرادیت حاصل ہے کہ ان کی شاعری کی لے میں سیاسی رنگ و آہنگ کی آمیزش بھی شامل ہے۔ قوم اور وطن کیلئے جس انداز میں انھوں نے اظہارِ خیال کیا اس طرز کے وہ اولین نقیب مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ہیت کے نئے نئے تجربے کیے بلکہ بلوچی شاعری کی پرانی ہیت کو بھی نئے انداز میں پیش کیا۔ (111)

''مئے شاعرانی تہا من گل خان نصیرءُ سید ہاشمیءَ ابید وگہ کسءَ مزنیں شاعر (Major Poets) نہ لیکاں، گل خان نصیرءِ یک کمٹ منٹے بوتگءُ آئیءَ شروعءَ تا آخرءَ ہما کمٹ منٹءَ راداشتگ۔'' (112)

ترجمہ: میں اپنے شعراء میں گل خان نصیؔر اور سید ہاشمی کے علاوہ کسی دوسرے کو عظیم شاعر نہیں سمجھتا۔ گل خان نصیؔر کا ایک کمٹ منٹ تھا، وہ شروع سے آخر تک اپنے کمٹ منٹ پہ قائم رہے۔

شاعری میں میر گل خان نصیر کا اپنا ایک منفرد اسلوب ہے۔ ان کے اشعار میں وہ انفرادیت جو مقصودِ فن ہے، واضح طور پر نظر آتی ہے اور ہم بلا جھجک ان کے کلام کو ان کے نام سے منسوب کر سکتے ہیں یعنی یہ اسلوب میر گل خان نصیؔر سے مخصوص ہے اور کوئی دوسرا شاعر اس طریق اظہار پر قدرت نہیں رکھتا۔ شاعری کے لئے جس خام مواد کی ضرورت پڑتی ہے، میر گل خان

نصیر نے وہ خام مواد عوامی زندگی سے اخذ کیئے اور انھیں مثبت انداز میں، ان کے نوک پلک سنوار کر پیش کرتے رہے۔

سلاست، روانی اور بے ساختگی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ مضمون آفرینی اور معاملہ بندی میں انھیں کمال دسترس حاصل تھا۔ ان کی شاعری میں تراکیب، استعارات، تشبیہات اور علامات ان کی اپنی مٹی اور زمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں زور بیان، منظر کشی و کردار نگاری کے اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کو خوبصورت الفاظ و پیرائے میں بیان کرنے کی بجائے الفاظ کے تخلیقی استعمال پر زیادہ زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

درحقیقت میر گل خان نصیر جدید بلوچی شاعری میں ایک ایسے شعری مکتب کا درجہ رکھتے ہیں جو سماج کے مجموعی تاریخی عمل میں برابر شریک ہے انھوں نے اپنی شاعری میں ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن میں اپنے خیالات کو وہ موثر انداز میں پیش کر سکے۔

میرے ہاتھوں میں امانت یہ قلم
حسن اور عشق کے قصوں کا روادار نہیں
میں کہ شاعر ہوں مگر میرا ہنر میرا سخن
ایک نئے طرز کا، آدرش کا آئینہ ہے
میرے اشعار امانت ہیں مرے لوگوں کی (113)

داغستان کے ملک الشعراء رسول حمزہ کے افکار بھی اسی طرح کے تھے، ان کا کہنا تھا،

میرے آباء کہ تھے نہ محرم طوق و زنجیر
وہ مضامین جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم
نوک شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوک شمشیر
روشنائی سے جو میں کرتا ہوں کاغذ پہ رقم
سنگ وصحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر (114)

ان کے شعری موضوعات میں سب سے زیادہ اہمیت وطن کو حاصل ہے، وہ اتفاق، اتحاد اور یکجہتی کے داعی ہیں اور تقسیم کے خلاف ہیں۔ انھیں رجعتی اور استحصالی قوتوں سے نفرت ہے۔ وہ قبائلیت کے خلاف ہیں۔ بیرونی حکمرانوں کے سخت ترین مخالف ہیں۔ ان اقدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے

ہیں جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ وہ بزدلی کے خلاف ہیں اور بہادری کیلئے اکساتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تقدیر اور نصیب کو بدلنے کا ذمہ دار اور محرک وہ انسان کو قرار دیتے ہیں۔ انھیں وطن فروشوں اور قوم فروشوں سے انتہائی نفرت ہے۔ وہ معاشرے کی ترقی میں خواتین کے کردار کی اہمیت کے قائل ہیں۔ نوجوان ان کی شاعری میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ غلامی کے خلاف ہیں اور آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کیلئے ایک علامت ہیں۔ وہ قبائلی تفریق کے خلاف ہیں اور ایک مجموعی قومی تشکیل کے داعی ہیں۔ بین الاقوامی موضوعات کو اپنا کر اپنی شاعری میں بین الاقوامیت کا عنصر بھی شامل کر لیتے ہیں۔ غرض عام صورتحال سے لیکر خاص صورتحال تک ان کی شاعری کہیں موضوعات کا مجموعہ ہے۔ اُنھوں نے ان تمام موضوعات کو انتہائی باریک بینی اور خوش اسلوبی سے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی ترقی پسندانہ، انقلابی، مزاحمتی، قوم پرستانہ اور سیاسی موضوعات کو ان عنوانات کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ انکی طویل نظمیں عظیم شعری تجربے ہیں جن میں وحدتِ تاثر کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ واقعاتی، قبائلی، قومی، شخصی اور علاقائی تذکرے ان کے پڑھنے والوں کو تاریخ کی طرف سفر کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ان کے کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن میں ڈرامائیت کا عنصر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ کہانی، کردار نگاری، مکالمہ، منظر کشی اور ماحول کی عکاسی، فنی

اعتبار سے ڈرامے کے بنیادی عناصر شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے ڈرامے کی ان بنیادی فنی لوازمات کو فنکارانہ انداز میں اپنے اشعار میں سمویا ہے۔ ڈرامے کی کہانی میں جن تین عناصر کو اہم گردانا گیا ہے۔ ان میں ابتداء، وسط اور انجام شامل ہیں، اگر ''داستان دوستین وشیرین'' ''حمل جیند'' کی داستان کو دیکھا جائے تو ان پر ڈرامہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ''شوانگ ءُ دز''۔ ''بلک''۔ ''دل ءُ من'' (115)

''بے علمیں جنکے۔'' (116) ''بلوچ ءُ شاعر''۔ ''داستان نوشکے''۔ ''بیا وقاب کوہی'' (117)۔ ''واب ءَ دیستگاں'' ''دانشور ءُ سرمایہ دار''۔ (118) من ءُ دل''۔ (119)۔ بھی اسی طرح کی کاوشیں ہیں۔

میر گل خان نصیر کی شاعری میں عشق اور محبت کی قدریں صحت مند تقاضوں کے ساتھ چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اپنی ایک نظم ''چاہی کبوتر'' میں میر گل خان نصیر کبوتر کو پیغام دے کر اپنی محبوبہ کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ کبوتر جب اس خیمے تک پہنچ جاتی ہے جہاں میر گل خان نصیر کی محبوبہ رہتی ہے، تب وہ کبوتر سے پوچھتی ہے۔

اے چاہی کبوتر! آ اور میری ہتھیلی پر بیٹھ جا
تاکہ میں تمھیں اپنے صاف اور اجلے خیمے میں لے جاؤں

اے شیریں گفتار پرندے!

وہاں میرے ساتھ بیٹھ کر مجھے یہ بتانا کہ

میرا وہ کون دوست ہے جس کے قاصد بن کر تم یہاں آئے ہو

اور جس نے میری یادوں کو اب تک اپنے دل میں سنبھال رکھا ہے"

اور پھر میر گل خان نصیر اسی نظم میں آگے یوں گویا ہوتا ہے۔

اے کبوتر! میری جاناں سے یہ کہنا

نصیر ہی تیرا وہ دوست ہے جو تیرے لیئے دیوانہ ہے۔

اس نے مچھ کے کالے زنداں سے

مجھے اپنا قاصد بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے

تیری جدائی اور یادوں کی آگ سے

اس کا دردو غم آشنا دل جل رہا ہے

اس نے تمہیں سلام محبت اور تمھارے سرخ ہونٹوں کیلئے

اپنے پیار بھرے بوسوں کا تحفہ بھیجا ہے۔

میر گل خان نصیر اپنی محبوبہ کیلئے اپنے پیغام کو طول دیتے ہیں اور "چاہی کبوتر" کو سمجھاتے ہیں۔

اور کہنا کہ اے شیریں لب و پری پیکر، ان دنوں اور راتوں میں بھی

جو برس جتنی طویل ہوتی ہیں، تم ہر وقت میرے دل میں سمائی رہتی ہو۔

تمھاری دل نواز یادیں

میرے تاریک ایام کو سحر کی سپیدی بخشتی ہیں۔

اگر چہ شب کی تاریکی بڑی گہری ہے

مگر تیری یاد اندھیرے میں مثلِ چراغ جیسی ہے

جیل کے دن، سختی کے ایام، مظالم کی شدت اور تلخیوں کی انتہا میں رہتے ہوئے بھی میر گل خان نصؔیر اپنے خوب روجاناں کو لال و گہر جیسے آنسو بہانے سے منع کرتے ہیں اور اُسے اُمید دلاتے ہیں ''یہ کالی رات آخر کار گذر ہی جائے گی۔

اور دودھیا سحر طلوع ہوگی

سرزمین وطن اپنے غیرت مند بیٹوں کیلئے

ایک دن ضرور روشن ہوگی۔

ہجراں نصیب حسینائیں اپنے پریموں کیلئے

پہاڑی گزرگاہوں کی طرف پھر دیکھا نہیں کریں گے (120)

جان من (یارِ جانی) ایک ایسی غزل نما نظم ہے جس میں میر گل خان نصیر اپنی محبوبہ کو ایک رات خواب میں دیکھتے ہیں پھر اسی خواب کو شعری قالب

میں ڈھال لیتے ہیں۔

آفرین، صد آفرین جانِ من پر

جو راتوں کی سیاہی میں، مرے خوابوں میں آتی ہے

اس سبک خرام نازنین نے ان اندھیروں اور طوفانوں میں بھی

مجھ کو اب تک فراموش نہیں کیا ہے۔

پچھلی رات کو پھولوں کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی اس دلربا نے

بہار کے معطر ہوا کی طرح مجھ پر نشے کی سی کیفیت طاری کر دی تھی

رات میرا دیوانہ دل خوشی سے ایسا وارفتہ ہوا

جیسے شے مرید کو حاجی کا دیدار نصیب ہوا ہو

آنسوؤں کی لڑی اور گھنے گیسوؤں نے اس کے چہرے کو،

اس طرح دھندلایا ہوا تھا

جیسے کالی بدلیاں، چاندنی کو دھندلا دیتی ہیں۔

موتی جیسے دانتوں، گل انار جیسے ہونٹوں اور کاکل پیچاں نے

اسے ایک مور کی خوبصورتی ودیعت کی ہے۔

کجلائی آنکھوں اور کونج جیسی گردان نے

اسے آہوئے صحرائی کا سا حسن بخش دیا ہے۔

وہ خرام ناز میں کبک، مورت میں مور
اور قد وقامت میں سرو کی ثانی ہے (121)

میر گل خان نصیر کی شاعری یاس و اُمید کی شاعری ہے۔ وہ تکتے نہیں اور نہ ہی مایوس ہوتے ہیں۔ انسانی محرومیوں کی داستان بیان کرتے ہوئے، بلوچستان کا نوحہ کہتے ہوئے بھی وہ پُر اُمید ہیں۔

یہ کالی رات آخر گزر ہی جائے گی۔
اور دودھیا سحر طلوع ہوگی۔

میر گل خان نصیر کا اپنی شاعری کے حوالے سے ایک اور اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے بلوچوں کو قومی تشکیل کی جانب سفر میں بھرپور حرکت دی۔ جس معاشرے میں میر گل خان نصیر رہ رہے تھے وہاں قوم کا لفظ وہاں قوم کا لفظ قبیلے کے مترادف سمجھا جاتا ہے اسی معاشرے میں انھوں نے قوم پرستی کا ہمہ گیر اور صحت مند نظریہ رائج کیا۔ قبیلے سے قومیت کی جانب مراجعت میں انھوں نے زبان کو بہت اہمیت دی اسی لیئے بلوچی زبان کو ہی انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

ابھی تک ان کے بہت سارے شعری مواد منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ دو بڑے رجسٹر کی صورت میں ان کی کلیات کے دو بڑے مجموعے موجود

ہیں۔ان میں دوستین وشرین اور حملِ جیند شامل نہیں ہیں۔ان کلیات میں وہ اشعار بھی ہیں جوان کے شعری مجموعوں میں چھپ چکے ہیں اور وہ اشعار بھی شامل ہیں جوابھی تک نہیں چھپ سکے۔ان اشعار کی تعداد چھپے ہوئے اشعار سے کہیں زیادہ ہے۔پہلا مجموعہ 626 صفحات پر مشتمل ہے جبکہ کلیات کا دوسرا مجموعہ 700 صفحوں پر محیط ہے جو چھپنے کے مراحل سے نہیں گزرے۔یہ کوئٹہ میں لکھے گئے ان کے اشعار ہیں جسکے آخری شعر پر 11 جون 1983 کا تاریخ درج ہے۔گل خان نصیرؔ اس تاریخ کے چھ مہینے بعد وفات پاتے ہیں۔ان چھ مہینوں میں بھی انھوں نے یقیناً اشعار کہے ہونگے جو کلیات کے ان مجموعات میں درج نہیں ہیں جو یقیناً کہیں اور تحریری صورت میں موجود ہونگے (122)۔

ان شعری مواد کے منظر عام پر آنے کے بعد ہی میر گل خان نصیر کی شاعری پر مکمل صورت میں مکمل رائے قائم کی جاسکے گی اور یہ ان کی شخصیت کے پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کا سبب بھی بن سکیں گے۔

شعری ماخذ

میر گل خان نصیرؔ کی شاعری کو دیکھنے اور پرکھنے سے پہلے ان شعری روایتوں اور آس پاس کی تحریکات کو جاننا انتہائی ضروری ہے جو میر گل خان نصیر

کو ورثے میں ملے تھے اور جنھیں بنیاد بنا کر میر گل خان نصیؔر نے اپنی ذہنی رویوں اور شعری روایتوں کی تشکیل کر کے اپنی شاعری کی سمت کا تعین کیا۔ انھیں ورثے میں ملی ہوئی شعری روایتوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بلوچی لوک شاعری کے وہ اصناف جن میں اقدار اور روایتوں کا ذکر شجاعانہ انداز میں بیان ہوا ہے۔

۲۔ کلاسیکل بلوچی شاعری کے وہ نمونے جن میں رزمیہ اور بزمیہ رجحان متاثر کن حد تک پائے جاتے ہیں۔

۳۔ شعری داستانوں میں پسندیدہ کردار۔

۴۔ ادبی اور سیاسی تحریکات کے اثرات۔

شاعری میں اجتماعی اظہار کا وسیلہ لوگ گیت ہیں جو کہ تمام اقوام اور انکے زبانوں کے ادب میں بنیادی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لوک گیتوں کی تاریخ انسان کی ابتدائی تہذیب کی تاریخ ہے۔ یہ گیت ہر قوم کا تہذیبی ورثہ ہوتے ہیں اور انہی سے انکے تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور مذہبی عقائد کا پتہ چلتا ہے۔ قدیم بلوچی شعری ادب کے بنیادی ماخذ بھی یہی لوک گیت ہیں۔ یہ گیت نہ صرف شعریت اور موسیقیت سے بھرپور ہوتے ہیں بلکہ مخصوص طرز آہنگ میں انتہائی سادہ، سلیس، رواں اور پر لطف بھی ہوتے ہیں۔

بلوچی لوک شاعری میں بچے کی تربیت کا باقاعدہ سلسلہ لوری سے شروع ہوتا ہے۔ مائیں اپنے بچوں اور بہنیں اپنے بھائیوں کیلئے جن جذبات کا اظہار کرتی ہیں وہ دراصل معاشرے میں ان کے مقام کا تعین کر رہی ہوتی ہیں۔ لوری میں جن اُمیدوں، توقعات اور آرزوؤں کا اظہار ہوتی ہے اس کا سرا دراصل ان کے ثقافتی سرزمین میں پیوست ہوتا ہے۔ بچے کیلئے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ بڑا ہو کر ہتھیار باندھے، صبارفتار گھوڑی پر سوار ہو اور رزم گاہ میں اپنے دشمنوں دندان شکن جواب دے۔ وہ بہادر، شہ سوار، انتقام جو، غیرت مند ہو۔

ماں تجھے نصیحت کرتی ہے
جنگ کے نازک لمحات میں
تیرا سر ہو اور تلواروں کی چھاؤں
مجھے توقع ہے کہ تو اپنی جوانمردی کا
مظاہرہ کرے گا۔
جس طرح بہنوں کو بھائیوں سے
ہمدردی کی توقع ہوتی ہے
جس طرح معشوق کو،
عاشق کے محبت کا یقین ہے۔
قوم کو تیری بلوچی حمیت پر بھروسہ ہے،
مجھے یقین ہے تو میری لوری کا پاس رکھے گا۔123۔

''ھالو'' شادی بیاہ کے موقعوں پر گایا جانے والا گیت ہے۔ دولہا کیلیئے ان کے گھر والے عزیز اقارب اپنے جذبات کا اظہار کس طرح کرتی ہیں۔

ہلو ہالو بنا ہے میؔر دولہا
سجا ہے پھول سا ملبوس کتنا
مقدر ناز کرتا ہے کسی کا
ہلو ہالو بنا ہے میؔر۔ دولہا
مبارکؔ اس بہادر کو، جری کو
مبارک میؔر کی دریا دلی کو
ہلو ہالو بنا ہے میؔر دولہا
مبارک اس کی غیرت کو حیاکو
مبارک اس جواں تیغ آزما کو
ہلو ہالو بنا ہے میؔر دولہا
سلامت باد اے شاہِ بلوچاں
سلامت باد اے مہر درخشاں
ہلو ہالو بنا ہے میؔر دولہا (124)

بلوچی لوک شاعری کے اور بھی اصناف ہیں جن میں اقدار اور روایتوں کا ذکر شجاعانہ انداز میں بیان ہوا ہے۔ میر گل خان نصیرؔ کے شاعری کی تفہیم کیلئے یہ لوک گیت بنیادی حوالے کے طور پر ان کی شاعری کی پہچان بنے ہیں۔

کلاسیکل بلوچی شاعری سے میر گل خان نصیرؔ نے اچھا خاصا استفادہ کیا۔

''بلوچی کلاسیکل ادب (شاعری) پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مکران کے مشہور شعراء کے کلام ہمیشہ گل خان کی زبان پر ہوتے تھے۔ رحم علی اور مست توکلی سے وہ بہت متاثر تھے، جام درک کے اشعار سے گل خان میں ایک نئی موسیقیت ابھری تھی۔''(125)

ریکی زنگی شاہی نوشکی کے قبیلہ ذگر مینگل کا (ریزوار) قبائلی شاعر تھا انھوں نے قومی موضوعات پر بہت ہی خوبصورت نظمیں کہی ہیں۔ ''زنگی شاہی'' دراصل ایک ایسا طبقہ گزرا ہے جو بلوچوں کے مختلف قبیلوں میں رہ کران کے جنگی کارناموں پر اشعار کہا کرتے تھے، جنگ کے دنوں میں ان کا حوصلہ بڑھانے کیلئے شعر کہا کرتے تھے۔ قبیلے کے نامور اور بہادر لوگوں کے گن گاتے، ان کی تلوارزنی کی تعریف کرتے۔(126)۔

تاریخ میں بالاچ کا کردار شاعری میں قومی تشکیل کی جانب سفر کرنے

کی ابتداء ہے۔ میر گل خان نصیر نہ صرف بالاچ کی شاعری سے اثر قبول کرتے ہیں بلکہ بالاچ کی شخصیت ان کیلئے ایک آئیڈیل کردار بن جاتا ہے۔ بالاچ کا ایک مشہور شعر۔

ترجمہ۔ پہاڑیاں، بلوچوں کیلئے قلعہ ہیں
ان کی اونچی چوٹیاں امدادی فوجوں سے بہتر ہیں۔

انکی بلندیاں ہمارے ہمسایہ ہیں
ان کی دشوار گذار گہرائیاں اور غار
ہمارے صبح و شام کے ساتھی ہیں
ان کے بہتے ہوئے چشموں کا ہم پانی پیتے ہیں
پانی پینے کیلئے پیش، پیالہ کا کام دیتے ہیں
کانٹے دار کرکاوغ کی بوٹیاں ہمارے قالین ہیں
پتھریلی ناہموار زمین ہمارے لیے گدیلے کا کام دیتی ہے۔
خطانہ ہونے والے بہترین تیر
ہمیں بیٹوں جیسے پیارے ہیں
کمانوں کے تیر ہمارے بیٹے ہیں
نوکدار خنجر داماد کی طرح عزیز ہیں
اور مضبوط اور گول ڈھال میرا بھائی ہے
چوڑی تلوار میرا باپ ہے۔ (127)

میر گل خان نصیرؔ نے کلاسیکل شاعری سے اس حد تک اثرات قبول کیے کہ ان کی شاعری کے کچھ اعلیٰ نمونے انہی کلاسیکل شاعری کے گرد گھومتے ہیں۔ ''موڑی لڈتگ میرانی'' ''ہارءِ سوت''۔ ''زہیر نالی گشیت''۔ ''شوانگءُ دُز''۔ گوگو''۔ (128) ''گل ءِ ستا''۔ ھنکین ءِ پڑ'' یہ اور اس طرح کی دوسری بہت سی نظمیں ہیں جن سے میر گل خان نصیر نے قدیم شاعری سے شعری روایت اخذ کیے ہیں۔

ابتدائی شاعری میں میر گل خان نصیرؔ کے پسندیدہ کردار روایتی انداز میں ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی ابتدائی شاعری میں جن کرداروں کا وہ حوالہ دیتے ہیں بعد میں ان کی شاعری میں یہ کردار نہ صرف اپنی شناخت بدل لیتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت اور وسعت اختیار کر لیتی ہیں۔ کچھ کردار پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ بالاچ، حمل، رحم علی مری، نوری نصیر خان، محراب خان شہید، شے مُرید، جام درک، ریکی، مست توکلی، دوستین وغیرہ کچھ ایسے کردار ہیں جن کا بلوچوں کی مجموعی تاریخ کے کسی نہ کسی شعبے میں ذکر ضرور ملے گا۔ میر گل خان نصیرؔ کے لیے ان میں سے بہت سے کردار علامتی کردار ہیں جن سے میر گل خان نصیرؔ اپنے مقصد کی بات بھی کہلواتے ہیں۔ ان شخصیات کی چھاپ میرِ گل خان نصیر کے سماجی اور شعری رویوں میں جا بہ جا نظر آتے ہیں۔

وہ ادبی اور سیاسی تحریکات جن سے میر گل خان نصیر متاثر ہوئے ان میں سب سے اہم تحریک تشخص اور بقاء کے لئے جنگ کرنے کی تحریک تھی۔ قومی شناخت اور قومی تشکیل کی جانب سفر کرنے کی تحریکات تھیں اور خصوصاً برصغیر کے وہ حالات تھے جنھیں علامہ اقبال اپنا شعری موضوع بنا رہے تھے۔ بیرونی آقاؤں کے خلاف جنگ، اپنے حق اور اختیار کا خود مالک بننا، سماجی ناانصافیوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا، استحصال، لوٹ کھسوٹ اور ظلم و جبر سے پاک معاشرے کی تشکیل یہ اس وقت کے اہم رجحانات اور رویے تھے سو میر گل خان نصیر کی شاعرانہ اور حساس طبعیت نے بھی ان اثرات کو اپنے اندر جذب کرلیا، سویت یونین کے عظیم انقلاب سے بھی وہ کافی متاثر تھے اور ان اثرات کی روشنی میں اس خطے میں ترقی پسند تحریک سے بھی انھوں نے اثر قبول کیا۔ ان مجموعی اثرات کی روشنی میں میر گل خان نصیؔر نے اپنی شاعری کی سمت کا تعین کیا۔ اثر لینا زندگی کو حرکت دینے کا نام ہے۔ اس میں حرارت پیدا کرنے کا نام ہے اس لیے میر گل خان نصیؔر کی نظریں رُکتی نہیں۔ ان کی شاعری میں آفاقیت کے عنصر کا پیدا ہونا، مقصدیت کی بنیاد پر شاعری کرنا، شعری موضوعات میں وسعت آنا ان کے وسیع مطالعے اور اثر لینے کو ظاہر کرتے ہیں۔ ناظم حکمت، پابلو نرودا، پشکن، رسول حمزہ، فیض احمد فیض، حبیب جالب،

شیخ ایاز، سردار جعفری ایسے نام ہیں جن کے احساسات اور افکار سے میر گل خان نصیر نے اپنی شاعری کو وسعت دی۔

جدید شعری ادب پر میر گل خان کی شاعری کے اثرات

جدید بلوچی شاعری پر نظر ڈالتے ہی تین ایسے نام نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جنھوں نے بلوچی کے جدید شعراء کو سب سے زیادہ متاثر کیا، اُن میں میر گل خان نصیر، سید ظہور شاہ ہاشمی اور عطا شاد کے نام شامل ہیں۔ پھر ان تینوں نامور شعراء میں یہ اعزاز میر گل خان نصیر کو حاصل ہے کہ جدید بلوچی شاعری پر ان کے اثرات سب سے زیادہ اور نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

ماضی کے ساتھ مضبوط تعلق رکھنے کے باوجود اُنھوں نے قدیم بلوچی شاعری کے کچھ روایات سے انحراف کیا اور نئے اسلوب و آہنگ کی بنیاد رکھی اور یہی بنیاد عہد جدید کے فکر و احساس اور قومی سوچ کی بنیاد ہے۔ بلوچی کے جدید شعراء میں، ایک بھی شاعر ایسا نہیں جس نے میر گل خان نصیر کی رکھی ہوئی اس بنیاد سے اثر قبول نہیں کیا ہو۔ شعوری یا لاشعوری طور پر ان کا انداز سب نے اپنایا۔ ان کا انداز اپنانے اور ان سے اثرات قبول کرنے والوں میں بلوچی کے اچھے اور معتبر نام بھی شامل ہیں۔ (129)

میر گل خان نصیر کے بعد بلوچی کے دوسرے شعراء نے بھی قومی

موضوعات پر شاعری کی، انھوں نے الگ آہنگ اور اسلوب کے ساتھ اپنی شاعری کے وجود کا احساس دلانا چاہا لیکن اسکے باوجود وہ کہیں نہ کہیں ضرور میر گل خان نصیؔر سے متاثر رہے۔ (130) آزاد جمالدینی کا شمار جدید شعراء کے پہلے صف کے شاعروں میں ہوتا ہے نظم کی نئی شکل کو فنی اعتبار سے بلوچی ادب میں متعارف کرانے کا سہرا اگر میر گل خان نصیر کو جاتا ہے۔ تو اس میں آزات جمالدینی کا بھی حصہ ہے لیکن اپنی شاعری میں آزات جمالدینی بھی میر گل خان نصیر سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔

روچے کہ پہ سکی ءُ سوری بگوزیت
ناداری ءُ نازانتی ءُ کوری بگوزیت
شرات کہ بمرتیں چہ غلامیں زندءَ
عمرے کہ پہ چم جہلی ولگوری بگوزیت (131)

ترجمہ: جب دن مصائب و مشکلات میں گذر جائیں۔ ناداری، نا سمجھی اور کوری میں گذر جائیں۔ بہتر تھا غلامی کی اس زندگی سے کہ مرجائیں اگر عمر بزدلی اور بے حیائی میں گذر جائے۔

اسی صورتحال کو میر گل خان نصیؔر اپنے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں۔

روچے پہ گریاں کہ جھان تنگ بہ بیت

لاپ ھورک، بدن لوچ پہ بدرنگ بہ بیت

ھکنت چہ چشیں وارو ھرابیں زندءَ

ماڑی بسچیت، سر برونت جنگ بہ بیت (132)

ترجمہ: جب غربت کے ماروں کے لیے جہان تنگ ہوجائے، پیٹ خالی، بدن ننگی اور زندگی بدرنگ ہوجائے۔ حق بنتا ہے کہ اس طرح کی زندگی کے لیے محلات جلیں، سر جائیں اور جنگ ہوجائے۔

زندے کہ چومحتاج وگدا کنت ترا

زردارءِ چلمز یرو پدا کنت ترا

ننگ ءَ تئی کشیت وہم نان ءَ تئی بارت

موت شرتر نت۔ چے زندءَ جتا کنت ترا (133)

اکبر بارکزئی نظم کو جدت بخشنے میں ایک معتبر حوالہ ہیں۔ وہ میر گل خان نصیر کے قریب رہے ہیں اور یوں وہ ان واقعات اور حالات کے چشم دید گواہ ہیں جن میں رہ کر میر گل خان نصیر کی شاعری پروان چڑھی تھی۔ اپنا منفرد اسلوب اپنانے کی کوششوں کے باوجود ان کی خصوصاً دو نظموں۔

ا۔ من شمئے آسمان ءَ نہ لوٹاں

۲۔ روچا کئے کشت کنت

میں وہ میر گل خان نصیؔر سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ (134)

عطا شاد بے شک ایک شعری مکتب کے رہنما شاعر کی حیثیت سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ جدید بلوچی شاعری اور خصوصاً نظم میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے وہ بھی اپنی شاعری میں اپنے مخصوص انداز کے باوجود کہیں کہیں میر گل خان نصیؔر کے خیالات اور موضوعات کے سحر میں دکھائی دیتے ہیں۔ ''چوش نہ بیت''۔ ''آشوب ءِ سروک''۔ براز''۔ ''بلیں سرمچار'' اور ''گہیں گلزمین سلام'' ان کے ایسے اشعار ہیں جن میں میر گل خان نصیؔر کی فکری جھلک نظر آتی ہے۔ (135)۔

بشیر بیدار کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جو میر گل خان نصیر کی شاعری کے مخالف جانے جاتے ہیں۔ یہ معاملہ دراصل سیاسی نقطہ نظر کے حوالے سے ہے۔ یہاں بشیر بیدار کے ادبی رویئے ان کی سیاسی مقاصد کے تابع ہیں۔ دراصل بشیر بیدار میر گل خان نصیر کی شاعری سے اس لئے خوفزدہ ہیں کہ وہ جن موضوعات کو اپنانا چاہتے ہیں ان موضوعات کے حوالے سے ان کی اپنی زبان کی سلاست اور انفرادیت برقرار نہیں رہ سکتی۔ ان کے اندر شاید کوئی نئی شے بے چین نہیں ہوتی جوان کی تخلیقات میں خود تعارفی کی منزل سے اپنے آپ کو

وقتی اور پروپیگنڈہ کا نام
ہمکنار کر سکے۔ میر گل خان نصیرؔ کی شاعری کو سیاسی، وقتی اور پروپیگنڈہ کا نام دینے کے باوجود بشیر بیدار وہ شاعر ہیں جس نے میر گل خان نصیرؔ سے سب سے زیادہ اثر قبول کیا، تقلید میں وہ کس حد تک آگے بڑھے ہیں۔؟ ان کے شعری مجموعوں میں کچھ حوالے اس صورتحال کو واضح کرتے ہیں۔

۱۔ ''گور بام''

۲۔ دہقان''

۳۔ ''زورا کی''

۴۔ ''دھمبلاں''

۵۔ ''نہنگ''

۶۔ ''بیا کہ گوں کنیں مرگ ءَ مڑاھے''

۷۔ ''گوانگ''(136)

ان کے دوسرے شعری مجموعے سے ''پہ بندی جاہ ءِ باہوٹاں''۔ ''زیرات تفنگ ءَ''۔

''پندل''۔ ''کشندہ ءِ نام ءَ'' کا حوالہ خصوصی طور پر دیا جا سکتا ہے۔(137)

جب بشیر بیدار کا تیسرا شعری مجموعہ ''کریاب'' منظر عام پر آیا تو اس مجموعے میں اس طرح کے اشعار کی تعداد کچھ زیادہ نکلی۔ ''ورنا''۔ ''شوانگ''۔

''پداچیر گیجاں وتی دیدگاں من''،''دریکتیں''۔گذسری چوگان''نوکیں نوبت''
''بچاردیمادگہ پچ کنت''۔مزن ھور''۔''وطن ماتیں''۔''مۓ ءَتئ نوں باری
انت''وغیرہ ایسے اشعار ہیں جن میں میر گل خان نصیر اپنی پوری شخصیت کے
ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔(138)۔

جدید بلوچی شاعری میں منفرد مقام کے مالک جی آر مُلا، میر گل خان نصیر کو اپنا فکری استاد تسلیم کرتے ہیں۔(139) بشیر بیدار کے جزباتی ہونے کا ادبی جواز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کا پوداوہاں لگانا چاہا جہاں پہلے سے ایک تناور درخت میر گل خان نصیر کی شاعری کی صورت میں موجود تھی، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ تناور درخت کے پھیلے ہوئے جڑوں کے اُوپر کوئی پودا درخت بنتا، لیکن جی آر مُلا اس معاملے میں مختلف سوچتے ہیں وہ میر گل خان نصیر کے ان اثرات کو جو انھوں نے اپنی شاعری میں قبول کیئے، نہ صرف خوش آمدید کہتے ہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ جی آر مُلا کے شعری مجموعے سے مندرجہ ذیل نظمیں میر گل خان نصیر سے متاثر ہونے کے زمرے میں آجاتے ہیں۔

ا۔''بلوچستان''

۲۔''میریں بلوچ''

۳۔ ''پر چاپہ بلوچان انت''

۴۔ گون ءِ کاروان''

۵۔ ''اومنی راج ءِ رنگیں پُسگ''

۶۔ ''ھمبل''

۷۔ ''تو گوں دل ءِ شور ءِ من ءَ''

۸۔ ''پاداوبلیں ورنا'' (140)

اسی طرح رزاق نادر کے شعری مجموعے سے بھی ایک ایسی نظم کی مثال دی جاسکتی ہے جس سے میر گل خان نصیر کی بازگشت سنائی دے گی۔ اس نظم کا عنوان ''واب سبزنت پدا'' ہے۔ (141)۔

ڈاکٹر فضل خالق کا شمار نہ صرف جدید بلوچی کے نامور شعراء میں ہوتا ہے بلکہ تنقید نگاری، افسانہ نویسی، ترجمہ اور ڈرامہ نگاری میں بھی انھوں نے اپنے لیئے ایک مقام کا تعین کرلیا ہے۔ ان کے شعری مجموعے کی ایک غزل ''منی ڈیہہ انت'' میں میر گل خان نصیر کے اثرات نظر آتے ہیں۔ (142)

نامور شاعر، افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار ڈاکٹر علی دوست بلوچ کے ان اشعار میں جو قومی شاعری کے ذیل میں آتے ہیں یا جن سے اپنی سرزمین اور وطن کے ساتھ دلی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے وہ میر گل خان نصیر کی شاعری سے

متاثر ہیں۔ان میں،

۱۔گل زمین

۲۔ھمبل

۳۔گوانک

۴۔وطن

۵۔ماتین وطن

۶۔ڈیہہ ءِ حال

۷۔اووطن پُلیں شرترئے کلاں

۸۔''راجی صوت'' خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔(143)

اسی طرح بلوچی شاعری کو خوبصورت آہنگ سے متعارف کرانے والے شاعر اللہ بخش بزدار کے وہ اشعار جن میں میر گل خان نصیر کے اثرات دکھائی دیتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔لیلائیں وطن

۲۔بندر

۳۔تھراگھاڑت وطن ءِ گیث

۴۔انقلاب

۵۔ مۓ انڑس نمیران انت

۶۔ وڑد

۷۔ من ءَ یقین انت ضرور آس ایت۔ (144)

جدید بلوچ شاعری کی تارخ میں مبارک قاضی ایک ایسے شاعر ہیں جنھیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خوبصورت لہجے کے منفرد شاعر مبارک قاضی کے شعری مجموعے سے کچھ حوالے اسی صورتحال کو آگے بڑھاتے ہوۓ پیش کیۓ جاسکتے ہیں۔

بلوچ ءِ باریگ الم ءَ کئیت۔"

۲۔ "گواچن"

۳۔ "وطن"

۴۔ "دوجاور"۔ (145)

مبارک قاضی کی شاعری کے حوالے سے بات کو آگے بڑھاتے ہوۓ، ان اثرات کو ان کے اس قطعہ میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ہانتیں وطن ءِ مہر چہ دین ءَ شرتر

بولان ءِ تہاری چہ درین ءَ شرتر

ملک ءِ وتی سوچا کیں لوار ءِ موسم

در ملکے ءَ چہ سارتیں کمین ءَ شرتر (146)

ترجمہ: وطن کی محبت دین سے بھی سوا اور بولان کی تاریکی قوسِ قزح سے آگے۔ اپنے وطن کی چلنے والی لو، دیارِ غیر کے نسیمِ سحر سے سوا۔

اسی خیال کو پہلے میر گل خان نصیر اسطرح پیش کر چکے تھے۔

ہر چون کہ بہ بیت وش دگرءِ ملک ءُ دیار

آبات ءُ جہاں جل ءُ مزن نام وتوار

شہد ءِ بہ تچنت جو ولیکن پہ نصیر

شرتر چہ جہان ءَ انت وطن ءِ حشکیں دار (147)

ترجمہ: دوسرے کا وطن جیسے بھی ہو، آباد ہو اور بہت نامہ ور ہو، شہد کی نہریں بہتی ہوں لیکن نصیر کیلئے اس کے وطن کا خشک لکڑی ہر چیز سے سوا ہے۔

میر گل خان نصیر کی شاعری پر تنقیدی نظر رکھنے والے صبا دشتیاری، ایک شاعر ہونے کے علاوہ، بلوچی کے افسانہ نگار بھی ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی نظم ''نوکیں نوبت'' میر گل خان نصیر کے شعری اثرات کے دائرے میں ہے۔ (148)

میر گل خان نصیر کی شاعری سے بلوچی زبان کے دوسرے شعراء کو نہ صرف تحریک ملی ہے بلکہ انھیں ان خیالات اور موضوعات کو اپنے انداز میں

پیش کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔ صدیق آزات اسی بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے۔

"مجھے اس بات پر فخر ہے کہ مجھے نصیر کی شاعری سے حوصلہ ملا اور اگر آج بلوچی ادب میں ادیبوں کی صف میں میرا شمار ہوتا ہے تو اس کا سبب میر گل خان نصیر کا پہلا شعری مجموعہ "گلبانگ" ہے کہ جسے پندرہ سال کی عمر میں پڑھ کر میں نے حفظ کرلیا۔" (149)

میر گل خان نصیر کی شاعری میں سماج کے پسے ہوئے مظلوم عوام کی آواز کانوں میں گونج اُٹھتی ہے۔ ان کے احساسات کا محور ان کا وطن ہے۔ سماجی ناانصافی، ظلم اور جبر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ان کی شاعری کا ایک اہم مقصد ہے۔ اس سفر میں بعد میں بہت سے شعراء شامل ہوئے لیکن اب بھی ان کی سرکردگی کا سہرا میر گل خان نصیر کے سر ہے۔ (150)

"کوئٹہ اور حیدرآباد میں میر صاحب ہماری محفلوں کی زیب و زینت تھے۔ کوئٹہ میں ملک محمد سعید اور سردار سیف الرحمٰن مزاری، میر صاحب کی آمد پر مشاعرے منعقد کرتے تھے۔ بعض اوقات طرحی مشاعرے حیدرآباد میں حبیب جالب، قصور گردیزی، افراسیاب خٹک، رازق بلوچ اور راقم الحروف ان مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے اکثر ان مشاعروں کی صدارت میر

صاحب یا حبیب جالب کیا کرتے تھے۔ ہم سب میر صاحب کے فنِ شاعری کے مداح تھے۔ میں اکثر اپنے اشعار کی اصلاح میر صاحب سے لیا کرتا تھا۔" (151)

جس وسیع پیمانے پر میر گل خان نصیؔر نے بلوچی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے شعراء کو متاثر کیا آج تک اس پیمانے پر کوئی دوسرا شاعر نہ پہنچ سکا ہے۔ اُن کے بعد کے شعراء نے انہی کے شعری روایات سے استفادہ کیا۔ (152)۔

بلوچی کے شعراء میں میر گل خان نصیر وہ پہلے شاعر ہیں جن سے بعد کے نوجوان شعراء نے سب سے زیادہ اثرات قبول کیئے۔ (153)

گل خان نصیر کی شاعری اور ناقدین:

کسی بھی ادب کے ناقدین دراصل اس ادب کیلئے وہ کسوٹی ہوتے ہیں جن سے مثبت ادبی رویئے پروان چڑھتے ہیں۔ ناقد کا کام یہی ہے کہ وہ تخلیق کار کو بھٹکنے سے روکے۔ ناقد ہی تخلیق کار کو ایسے تخلیقات پر مجبور کرتے ہیں جنھیں شاہکار تخلیق کا درجہ دیا جاسکتا ہے لیکن بدقسمتی سے بلوچی ادب میں صورتحال کچھ خاص حوصلہ افزاء نہیں ہے۔ یہاں خصوصی طور پر ذاتی پسند و ناپسند کا خیال ہر حال میں رکھا جاتا ہے۔ میر گل خان نصیر کا پالا بھی ایسے ہی

ناقدین سے پڑا جنھیں اس گل خان نصیر سے غرض تھا جو عوامی مقبولیت کے عروج پر تھا۔ جو سیاست میں سرگرم کردار ادا کر رہا تھا۔ ان ناقدین کو اس گل خان نصیر سے غرض ہی نہیں تھا جو شاعر تھا اور جنکی شاعرانہ حیثیت ہی ان کا بنیادی حوالہ تھا۔ جس طرح دوسرے شعراء کیلئے ناقدین نے یہ ضروری گردانا کہ کسی بھی شاعر کے خانگی، معاشی اور تعلیمی حالات کو اس حد تک داخل مباحث کرنا چاہیئے جس حد تک معروضی حالات اس کی شاعری کی تفہیم کیلئے ضروری ہوں۔ گل خان نصیر کی حقیقی قدر شناسی بھی اس وقت ممکن ہوگی جب ہم ان کے فن اور شاعری کو ان کے دوسرے تمام حوالوں سے الگ کرکے دیکھیں گے۔ انھیں صرف شاعر کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ اس طرح ہم بحیثیت شاعر ان کے مقام ومرتبے کے تعین میں ان کے ساتھ انصاف کرسکیں گے۔ میر گل خان نصیر کی شاعری پر مندرجہ ذیل چیدہ چیدہ اعتراضات وقتاً فوقتاً کئے جاتے رہے ہیں۔

☆۔ میر گل خان نصیر کی شاعری اسلحہ بنانے کا کارخانہ ہے۔

☆۔ ان کی شاعری عام فہم ہے۔

☆۔ اُن کی شاعری سیاسی موضوعات کا مجموعہ ہے۔

☆۔ ان کی شاعری پروپیگنڈہ، نعرہ بازی، وقتی اور ہنگامی شاعری ہے۔

☆۔ ان کی شاعری جمالیاتی احساس سے عاری ہے۔

یہ تو میں نہیں کہتا کہ میر گل خان نصیؔر کی شاعری ہر طرح کی تنقید اور اعتراض سے بالاتر ہے البتہ یہ میں ضرور کہوں گا کہ ان اعتراضات کی روشنی میں ان کے ساتھ کہیں کہیں ناانصافی برتی جا رہی ہے۔ یہاں ایک اہم سوال یہ اُٹھتا ہے کہ انسانی رویے کس طرح تشکیل پاتے ہیں؟ اور اسی سوال کے تناظر میں دیکھنا یہ بھی ہے کہ تخلیق کار کیوں لکھتا ہے اور کس کیلئے لکھتا ہے؟ ابتدائی سوال کو اگر میر گل خان نصیؔر کی شاعرانہ شخصیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو صورتحال کو واضح کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کیونکہ جن حالات میں میر گل خان نصیر کی شاعرانہ شخصیت ابھر رہی تھی وہ حالات اتنے پیچیدہ اور حساس تھے جہاں انھیں اپنی تشخص کا مسئلہ درپیش تھا۔ ''بولان'' کی رفعت کا زمانہ بھورے گھوڑوں کے سواروں کے ساتھ گزر چکا تھا اور اس میں بادشاہ اور ان کے لیٹرے سپہ سالار بلا خوف و خطر گزر جاتے تھے۔ ''بولان'' کوہنگ کے قلعے کی طرح تباہ حال ہو چکی تھی۔ پابرہنہ چلنے والے خانہ بدوشوں کے لئے ان کا اپنا ''بولان'' غیر محفوظ ہو چکا تھا۔ (154)۔

حانیؔ کا سرسبز و شاداب وطن شۓ مُرؔید کے داغ داغ بدن کی طرح جھلسا ہوا اور ویران دکھائی دے رہا تھا۔ زور آور ظالموں نے ان کے وطن کو جلا

کرحاتی کے گیسوؤں کی طرح سیاہ اور کالی رات کی طرح بنا دیا تھا۔(155)

جب میر گل خان نصیر کا پیارا وطن بھیڑیوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ جب ان کے وطن کی سرسبز وشاداب وادیوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ جب ان کے دیہاتوں میں خوف کی لہر پھیلا دی جاتی ہے۔ جب آبادیوں میں مار دھاڑ کا بازار گرم کیا جاتا ہے۔ جب ہر جگہ چھینا جھپٹی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ جب کاہان سے اور ناچ تک سنسناتی ہوئی گولیوں کی تندوتیز بارش سے ایک طوفان اُٹھ جاتا ہے۔ جب درہ بولان کے فصیل نما پہاڑوں اور، اور ناچ کے پہاڑی سلسلوں سے آگ کے شعلے اُٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب ان کا پیغام رساں ''چاہی کبوتر'' تانی ہوئی بندوقوں کی زد میں آجاتا ہے۔ جب انھیں اپنی محبوبہ بیابانوں کی ڈری اور بدکی ہوئی ہرنی کی طرح دکھائی دینے لگتی ہے۔ تب میر گل خان نصیر سے یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ

ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ ہم زندہ رہیں

اور اپنی آنکھوں سے

اپنے وطن اور جی دار قوم کی تباہی کا تماشہ دیکھیں

اور یہ بھی نہیں ہوگا کہ

ہم اپنی آنکھیں نیچی کیئے اپنے گھروں میں

محبوب کی زلفوں کے سائے میں پناہ لے کر بیٹھ رہیں۔(156)

اس دورِ ابتلا میں جب عورتوں کے دوپٹوں کی توہین کی گئی۔ جب ان کے مادرِ گیتی کی ناموس کیلئے جیالے رہنماؤں کی جانیں چٹانوں اور گھاٹیوں میں تلف کردی گئیں۔ جب ان گنت ماؤں، بہنوں اور باپ کی آنکھوں کے اجیالے چراغوں کو بیابانوں میں بجھا کر سیلاب بلا کی لہروں میں بہا دیا گیا۔ جب قبرستانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ جب مظالم کی شدت اور تلخیوں کی انتہا یہاں تک پہنچی کہ ان کے جوانوں کو دہکتے انگاروں پر لٹایا گیا۔

کس کو تاب نظارہ ہے کہ چھوٹے بچوں اور عورتوں کو،

بدن کو چھیل ڈالنے والے کوڑوں سے پٹتا اور بلکتا و تڑپتا دیکھے

اور ان کا دل صدمہ سے پھٹ نہ جائے(157)

جب سورج ابھرتا ہے، دن نمودار ہوتا ہے لیکن رات کی دھول نہیں چھٹتی۔ جب رات کو چودھویں کا چاند ایک خوبصورت بیوہ کی طرح برباد و تباہ حال نظر آئے۔ جب نازوں میں پلی بیٹیاں اور سلیقہ شعار بہنیں اپنے عزیزوں کی جدائی میں رو رو کر نین گنوائیں۔ جب مادرِ وطن کے سر کو ڈھانپنے والی گراں قیمت شال سیاہ ماتمی رنگ میں رنگ جائے۔

کیا میں جنگ و جدال سے متعلق اشعار نہ کہوں

صرف ماہ پیکر دل رباؤں کی ستائش ہی کیا کروں

اور دار و رسن کی بات کرنی چھوڑ دوں!

اس جان بلب صورتحال میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے دوسرا راستہ تلاش کرنے کیلئے اپنی رہوار فکر کو دوڑایا مگر انھیں منزل کی طرف جانے کا کوئی ہموار راستہ نظر نہیں آیا۔ تمام راستے ان ہی گھاٹیوں سے، گرجتے بادلوں اور کڑکتی برق کی آتشیں لپکوں سے ہی شروع ہوتے تھے اور یہیں جا کر ہی ختم ہوتے تھے۔ ایسے حالات میں برف کی مانند سرد جگر رکھنا ان کیلئے، ان کی حساس طبیعت کیلئے ممکن نہیں رہا۔ یہ حالات اور اس خطے کی مجموئی صورتحال (جن کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے) میر گل خان نصیر کے فکری رویئوں کی تشکیل میں اہم اور کارگر ثابت ہوئے۔ اس تمام صورتحال کو ان ادوار اور اس عہد کے تناظر میں دیکھنے سے ہی میر گل خان نصیر کی شاعری کے متعلق رائے قائم کر کے ہم ایک بہتر نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

".......میری شاعری میں براہ راست شمشیر و سنان کا ذکر میرے بعض احباب کو پسند نہیں آتا لیکن، میں اپنے جذبات کی یورش سے اس قدر مجبور ہوتا ہوں کہ ان احباب کی ہدایات پر عمل نہیں کر سکتا۔ طبیعت میں جب روانی آجاتی ہے اور اشعار کا سیلاب اُمڈ آتا ہے تو اس میں تیر و تفنگ کی صدا

گونجنے لگتی ہے تب میں اسے روک نہیں سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ شاعری مضمون نویسی نہیں ہوتی کہ کسی موضوع پر قلم اُٹھایا اور جواب مضمون لکھ دیا۔ شاعری مضمون آفرینی کے علاوہ، جذبات کا والہانہ رو میں بہہ کر الفاظ کو صورت دینے کا نام ہے۔ شاعر کے جیسے جذبات ہونگے، ویسا ہی اس کا کلام ہوگا۔ مثلاً اگر شاعر کسی حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہے اور رات دن فراق یار میں تڑپتا رہتا ہے تو اس کی شاعری میں بھی یہی تڑپ ہوگی، جو اس کے والہانہ جذبات کا عکس ہوگی نہ کہ، تیر و تفنگ کی دھنا دھن اور میدان جنگ میں جان بلب پڑے ہوئے زخمیوں کی چیخ و پکار۔'' (158)

یہاں تک تو میر گل خان نصیر کے رویّوں کی تشکیل کی باتیں ہوئیں اب ہم اسی سوال کے تناظر میں اُٹھائے گئے دو اور سوالوں کی طرف رخ کرتے ہیں کہ تخلیق کار کیوں لکھتا ہے؟ اور کس کیلئے لکھتا ہے۔؟

تخلیق کے سرچشمے قاری کے رشتے اور مٹی کی خوشبو سے پھوٹتے ہیں اس لیئے ایک سچا تخلیق کار ادب کے رشتے کو عام زندگی سے منقطع نہیں ہونے دیتا۔ اُسے پتہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا رشتہ قاری سے کٹ جائے تو اسکا ذہین بے معنویت کا شکار ہو جاتا ہے۔ میر گل خان نصیر کی شاعری کو پڑھنے کے بعد ان کا ہر قاری آسانی سے یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ وہ لوگوں کیلئے لکھتا ہے اور انکی زندگی کو بہتر اور خوبصورت بنانے کیلئے لکھتا ہے۔

''اگر یہ کہا جائے کہ فن کار کسی قاری کا محتاج نہیں تو ایسی نظمیں یا غزلیات چھپوانے کا مقصد کیا ہے جو کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔ اشاعت خود اس بات کی دلیل ہے کہ فنکار چاہتا ہے کہ لوگ اس کی واردات کی نوعیت کو سمجھیں اور تعبیر میں لاکھ اختلاف ہو، نقاد یہ ضرور کہیں کہ فن پارہ، نظم یا غزل اچھی ہے۔ ہاں اس کیلئے نقاد کا صاحب ذوق سلیم ہونا ضروری ہے تاکہ کروچے کے الفاظ میں وہ اپنے آپ کو مصنف سے ذہنی سطح پر ہم آہنگ پائے اور اس کے تجربے کا تخلیقی اعادہ کر سکے۔'' (159)

میر گل خان نصیرؔ شاعری میں خواہ مخواہ کے ابہام کا قائل نہیں۔ علامت کے نام پر کئے گئے تجربوں سے ایک طرف اگر ادب اور شاعری کا رشتہ قاری سے کٹ گیا ہے تو دوسری طرف تخلیق اور تخلیق کار کے مابین بھی رابطے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور اس طرح کی تخلیقات کیلئے ہی میر مٹھا خان مری نے کہا تھا کہ جدید تصورات کو عوام کے قابلِ فہم زبان میں پیش کرنے کی ضرورت ہے ورنہ دور حاضر کا ادب مستقبل کیلئے تو شاید کارآمد ثابت ہو سکے لیکن دور حاضر اس سے پورا پورا استفادہ نہیں کر سکے گا۔ (160)

اس طرح میر گل خان نصیرؔ نے اپنی شاعری میں اپنی زبان کو عام فہم

بنا کر ایک طرف سماج کی عکاسی کا بھرپور حق ادا کیا تو دوسری طرف بلوچی کے اس روایتی رنگ کو بھی برقرار رکھا جس میں عوامی زبان کو اولیت کا درجہ دیا جاتا تھا۔ میر گل خان نصیر کی شاعری کو عوامی سطح پر پسند کرنے اور سراہنے میں ان کی زبان کے عام فہم ہونے کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔

''سچائی پر مبنی ہر تحریر قلم کار کے اعجاز قلم کی مرہون منت ہوتی ہے لیکن سائنسی ادارک اور شعر کی بلند سطح سے آراستہ شاعری، شاعر کی بے پناہ تخلیقی قوت کا اظہار ہوتی ہے جو شاعری اپنے سماج کے شعور، اپنے عوام سے بے پاں محبت اور اپنے دکھی محنت کشوں کے جذبات کا آئینہ ہوتی ہے وہ شاعری اپنی فکر اور تاثیر کے سبب نئی بلندیوں کو چھو لیتی ہے۔ گل خان نصیر کی شاعری کی بھی یہی خصوصیت ہے۔'' (161)

اب آتے ہیں اُن معترضین کی طرف جو میر گل خان نصیر کی شاعری پر سیاسی شاعری کا لیبل چسپاں کرتے ہیں یا پھر انھیں میر گل خان نصیر کی عملی سیاست میں شمولیت پر اعتراض ہے۔

آرکیبالڈ میکلش عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ پیرس، نیویارک اور واشنگٹن میں رہنے اور زندگی بتانے والے اس عظیم شاعر نے بہت سارے دیگر موضوعات کے علاوہ آج کے عہد اور شاعری پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا

ہے۔ان کا کہنا ہے۔

''فنکار کو سیاست میں اس حد تک ضرور شریک ہونا چاہیے۔ وہ بطور فنکار آزادی کی حرمت کا تحفظ کر سکے۔''(162)۔

یہاں معاملہ سیاسی نقطہ نظر کے حوالے سے سامنے آتی ہے۔ ان معترضین کے ادبی رویئے ان کے سیاسی مقاصد کے تابع ہیں اور اس طرح رائے رکھنا ادبی دیانت داری کے زمرے میں نہیں آتا۔ مشہور اور نامور شاعر پابلو نرودا جب سیاست کے میدان میں شریک ہوئے تو ان کو بھی اسی طرح کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا، پابلو نرودا کے بارے میں یووتے شنکو، جنکا جدید روسی شعراء میں شمار ہوتا ہے، لکھتے ہیں۔

> ''ہر چند سیاسی جدوجہد شاعر کا کام نہیں ہوتی ہے مگر جب تک ناانصافی رہے۔ ایک عظیم شاعر اس جدوجہد سے خود کو مبرا نہیں سمجھ سکتا، بلکہ انسانی اور روحانی اقدار کا تحفظ شاعر اور دانشور کا اولین فرض بن جاتا ہے۔''(163)۔

نرودا اور گل خان نصیر کے کچھ اقدار مشترک ہیں، دونوں نے اپنے

خوابوں کا شیرازہ بکھرتے دیکھا اور دونوں کے خواب ٹینکوں کے نیچے کچلے گئے ۔ دونوں میں بین الاقوامیت پسندی کا قدر مشترک ہے۔ پابلو نرودا کی طرح میر گل خان نصیر نے بھی اپنی شاعری میں بیشتر زمینی اور سماجی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ دونوں میں یہ قدر بھی مشترک ہے کہ ان کے اکثر شعری موضوعات خصوصی توجہ کی منزل تک پہنچے اور دونوں اپنے اپنے شعراء اور خطے کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔

روس کے نامور شاعر رسول حمزہ کو نہ صرف مقبول ترین شاعر تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ 1963 میں لینن پرائز پانے ۔ ان خندار شاعر نے اپنے علاقے کی تہذیبی زندگی کو خوبصورت شاعری کا لب ولہجہ عطا کیا۔ رسول حمزہ کو اپنے داغستان سے بے پناہ محبت تھی۔ (164)۔

''میرے گاؤں ، میرے پہاڑوں ، میرے داغستان ! تم میرے خیالات ، میرے احساسات کا آشیانہ، میری آرزوں کا کاشانہ ہو۔ داغستان میرا چولھا ہے، میرا جھولا ہے۔'' (165)۔

میر گل خان نصیر کا اپنی زمین اور مٹی کے ساتھ تعلق کچھ اسی قسم کا ہے۔

اے میرے وطن مقدس و درخشاں
اندھیاروں اور آندھیوں میں
تو مجھ کو بہت ہے یاد آتا
جب چاندنی رات جھولتی ہے
میں تیرے حسین تصور میں
کھو جاتا ہوں دلفگار پہروں
جب ہوتا ہے ضوفشاں سورج
تپتا ہے تیرا خیال دل میں
اور ساتھ بلوریں آنسوؤں کا
اُٹھتا ہے اُمڈ کے ایک طوفان۔(166)

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسانی مزاج کے ہر آہنگ کو شعر میں منعکس ہونا چاہئے تو سیاست بھی انسان کے مزاج کا حصہ ہے پھر اس کیلئے معترض ہونے کا کیا جواز بنتا ہے۔

''گل خان نصیر ایک انقلابی آدرشی شاعر تھے۔ وہ اصل معنوں میں عوامی شاعر تھے۔ وہ وطن دوست ادیب تھے۔ ان کی سیاست اور ان کا فن باہم دگر یک جان تھے۔ میرا خیال ہے کہ صرف اُردو، سندھی اور بلوچی زبانوں ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر کی زبانوں اور ادبیات میں ایسے ادیبوں، شاعروں اور

دانشوروں کے نام گنے چنے ہوں گے جن کے فن اور عملی زندگی میں اس قدر گہرا ربط ہو یا جن کی زندگی ان کے افکار کی تعبیر ہو۔

.... سچا عملی عوامی سیاست دان ہونا اور سچا عوامی شاعر و ادیب یا مصنف ہونا، یہ دونوں بڑی کٹھن منزلیں ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نصیر ان دونوں منزلوں میں نہ صرف حد درجہ مخلص ہیں بلکہ نہایت ذہانت کے ساتھ یہ ثابت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ سچا ادب اور سچا ادیب زندگی کا دوست، خادم اور اُستاد ہوتا ہے۔'' (167)

عملی طور پر سیاست میں حصہ لینے کے باوجود سیاست میر گل خان نصیر کا بنیادی حوالہ نہیں بن سکا۔ ان کا بنیادی حوالہ ادب ہی بنا۔

ان پر شاعری میں سیاست کو کھینچ لانے کا الزام تو لگا دیا جاتا ہے مگر ان کے متعلق یہ کبھی نہیں سوچا گیا کہ انھوں نے جس انداز میں سیاست میں ادب کو متعارف کرایا یہ اپنی نوعیت کا کم از کم بلوچ شعراء میں پہلا واقعہ ہے۔ وہ جلسوں میں بہت کم سیاسی تقریریں کرتے تھے، وہ اکثر اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ جب جیل چلے جاتے تو وہاں مشاعروں کا اہتمام کرواتے تھے۔ نیپ کی حکومت کے مختصر عرصے میں بھی ان کی پہلی ترجیح بلوچی زبان ہی رہی۔ انھوں نے ادب کو سیاست کا نہیں بلکہ سیاست کو ادب کا حصہ تصور کیا اور اسی نظریے

کے پیش نظر وہ اپنے ادبی کاذ سے ایک لمحے کیلئے بھی فراموش نہیں ہوئے۔

معترضین کے اعتراضات یہاں تک ختم نہیں ہوتے انھوں نے یہ گل خان نصیر کی شاعری میں پروپیگنڈہ کا عنصر ڈھونڈ نکالا، ان کی شاعری کو نعرہ بازی کا نام دیا اور انھیں وقتی اور ہنگامی موضوعات پر شعر کہنے والے شاعر کا درجہ دیا لیکن ناقدین اس بات سے اپنے آپ کو انجان رکھ رہے تھے کہ جو شعر ،سیاسی رابطے، زندگی اور مسائل کو منعکس کرے گا، وہ پروپیگنڈہ ہو نہیں سکتا۔

"ییٹس اس زمانے میں بڑا شاعر بنا جب کہ لوئیس میک نیس نے کہا تھا کہ ییٹس انگریزی کو تجارتی زبان کی طرح استعمال کر رہا ہے اور ییٹس نے اسی زمانے میں آئرش سیاست میں زور و شور سے حصہ لینا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنی نظموں کو اسی مقصد کیلئے استعمال کیا۔ خاص کر اسکی نظم Responsiblities اس نظم کو کسی نے پروپیگنڈہ کہہ کر رد نہیں کیا۔ اسی طرح پال الیوارڈ (فرانسیسی شاعر) بھی بطور شاعر اور سیاست دان متحکم شخص رہا ہے۔........ آندرے مالرو فرانسیسی کمیونسٹ تحریک کے دوران فاشزم کے سخت خلاف تھا۔ اس نے یہ بھی تو کہا تھا کہ مزاحمت کی تحریک کے دوران اسکی شادی فرانس سے ہوگئی تھی۔ پھر اس نے فن اور سیاست کے امتزاج سے Anti Memomaris لکھے۔"(168)

شاعری میں اس طرح کے تجربوں کو اگر پروپیگنڈہ یا نعرہ بازی کا نام دیا جائے تو عالمی سطح پر بہت سے شعراء اسکی زد میں آسکتے ہیں۔ ناظم حکمت، پابلو نرودا، محمود درویش، پشکن، رسول حمزہ، فیض اور دوسرے شعراء نے اگر دائمی اور ابدی خوبیوں پر مبنی اشعار کہے تو ان کی شاعری کا ایک اچھا خاصا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہے جو مختلف لمحوں کیلئے مخصوص ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ لمحے بھی تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں۔ میر گل خان نصیر کی شاعری میں بھی ایک مخصوص زمانے کے کچھ مخصوص لمحات قید ہیں اور جو شاعری تاریخ کے ایک لمحے کو بھی اپنے اندر قید کر سکے تو وہ سماجی جدوجہد اور تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے پھر وہ ہنگامی نہیں رہ پاتا۔

"کچھ لوگوں کو اعتراض ہے کہ نصیر کی شاعری وقتی تقاضوں کی شاعری ہے یا ابدی شاعری سے کچھ کم تر ہے اس بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق ہنگامے کی شاعری زندگی کو رونق بخشنے کی شاعری ہے۔ یہ کسی دوسری شاعری سے کم تر نہیں ہے۔ کوئی شخص لمحے یا وقت کی شاعری کر رہا ہے تو اس تناظر میں رکھ کر ہی اس شاعری کی قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لمحے تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جیسے غدر ہماری تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ غدر کے واقعے کو جو انگریزوں کے خلاف پہلی منظم بغاوت تھی، ہم نظر

اندازنہیں کر سکتے ۔اس واقعہ کے سیاق و سباق میں لکھی گئی چیزیں ہماری تاریخ کا حصہ ہیں اور یہ شاعری ہماری زندگیوں کو منور رکھتی ہے۔" (169)

انہی حالات اور واقعات کے تناظر میں میر گل خان نصیر کی دو نظموں کے حوالے پیش خدمت ہیں۔ پہلی نظم "بولان" اور دوسری نظم "آہوئے صحرائی"۔

بولان میر گل خان نصیر کی شاعری میں علامتی روپ میں سامنے آتی ہے جو میر گل خان نصیر کا وطن ہے اور جس پر قرن ہا قرن کے حال و احوال نقش ہیں جسکی کھائیوں اور گھاٹیوں پر پشت ہا پشت کا گرد و غبار پڑا ہوا ہے۔ میر گل خان نصیر کی سوچوں کی نظر میں یہ محض دور منبع رکھنے والی ایک پہاڑی ندی نہیں ہے بلکہ کہکشاں ہے جس نے زمین پر اتر کو اپنی صورت بدل دی ہے۔

چاند اور چاند کی طرح ترشی ہوئی یہ زمین، جو طرح دار بلوچوں کا وطن ہے، اس وطن نے دل کی طرح بولان کو اپنے سینے میں جگہ دی ہے جس میں بادشاہ اور ان کے لیٹرے سپہ سالار بلا خوف و خطر نہیں گزر سکتے تھے۔ اسکی اونچی اور دشوار گزار چٹانوں پر نیزہ باز اور تیغ زن دشمن یلغار نہیں کر سکتے تھے۔ میر گل خان نصیر کے اس بولان کی صورتحال جب بدل جاتی ہے۔ یعنی وہ ایک شاہراہ کی طرح تباہ مسمار ہو جاتی ہے۔ اس میں ہیلی کاپٹر اور ہوائی جہاز گدھوں کی طرح

منڈلاتے پھرتے ہیں۔ملیشیاء کے آوارہ سپاہی بھیڑیوں اور لکڑ بگھوں کی طرح اس میں پانپتے پھرتے ہیں۔اس کے کناروں کو راستے اور سرنگیں بنانے کیلئے کاٹ دیا جاتا ہے۔اس میں لاریاں اور ٹینک ریل کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے ہوتے ہیں۔اس میں سور اور ناگ بسیرا کر لیتے ہیں۔یہ اپنے پابرہنہ چلنے والے خان بدوشوں کے لیے پر امن راستہ نہیں رہتا تب اس کی چٹانوں اور گونجنے والی گھاٹیوں میں بجنے والی سیٹیوں سے میر گل خان نصیر فال نکالتا ہے۔

بولان پھر ایک طوفان کیلئے انگڑائی لے رہا ہے۔(170)۔

''آہوئے صحرائی'' میں میر گل خان شئے مُرید کو جس انداز میں وطن اور زمین کے ساتھ مربوط کر کے پیش کر رہا ہے اس سے نہ صرف تاریخی کردار اپنے روایتی منصب اور مقام پر آجاتے ہیں بلکہ شاعری کی شاعرانہ لذت میں توازن کا جواز بھی پیدا ہو جاتا ہے۔نظم کے کچھ منتخب حصے کیفیت کو یوں واضح کرتی ہیں۔

اے صحرا کی ہرنی!

آؤ، آؤ! میرے پہلو میں آجاؤ

جنت کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی حور کی طرح!

نازو انداز سے جھومتی ہوئی چلی آؤ،

میں بھی

تمھاری دید کے منتظر مُرید کی طرح

از خود رفتہ اور اپنی قوم کا شیدائی ہوں

اس صورتحال کو مزید واضح کرنا ہوتا ہے اس لیے اسی نظم کا ایک اور حصہ

یہ کا طالب بن جاتا ہے۔

اے صحرا کی ہرنی!
ہانی کا سر سبز و شاداب وطن
شئے مُرید کے داغ داغ بدن کی طرح
جھلسا ہوا اور ویران ہے،
زور آور ظالموں نے اسے جلا کر
ہانی کے گیسوؤں کی طرح سیاہ
اور کالی رات کی طرح تاریک کر دیا ہے

وہ صحرا کی ہرنی کو پیغام دے کر شہ مُرید کے پاس بھیج دیتا ہے۔

اے صحرا کی ہرنی!
لوٹ جاؤ اور پر جوش نصیر کا پیغام
شہ مُرید کو پہنچاؤ

اوران سے جا کر یہ کہنا کہ: ''ان سخت لڑائی کے دنوں میں،

جب ہم، اپنے ننگ وناموس کی حفاظت کی جنگ

اپنی پوری قوتِ بازو سے لڑ رہے ہیں

وہ ہمارا پشت پناہ بن جائے''۔(171)۔

ان موضوعات کو میر گل خان نصیرؔ نے اپنی شاعرانہ تخیل سے اتنا جاندار بنا دیا ہے کہ یہ نظمیں ابدی صداقتوں کی موثر آواز معلوم ہوتی ہیں۔

''....... حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادارک، اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے اس لیے طالب فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں۔ اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔ اس کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی اپنی توفیق واستطاعت پر ہے۔ لیکن کوشش میں مصروف رہنا بہر طور ممکن بھی ہے اور لازم بھی۔''(172)۔

میر گل خان نصیرؔ کی شاعری پر جب بھی ناقدین نے رائے زنی کی (یہاں وہ ناقدین مراد ہیں جنھوں نے ادبی انداز کے بجائے سیاسی انداز اپنایا) انھوں نے میر گل خان نصیرؔ کی شاعری کو مجموعی تناظر میں نہیں دیکھا بلکہ

ہر ایک نے ان کی شاعری میں اعتراض کرنے کیلئے اپنے اپنے مطلب کی چند چیزیں ڈھونڈ نکالیں۔ انھوں نے اس عہد کو ان اقدار اور روایات کے تناظر میں دیکھنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی جس عہد میں اور جن جن روایات و اقدار کے ساتھ میر گل خان نصیر کی شاعری پروان چڑھی تھی۔ اسی طرح میر گل خان نصیر کی شاعری کو جمالیاتی احساس سے عاری قرار دینے والے بھی یا تو دھوکہ کھا گئے یا ان اشعار سے نظریں بچا گئے جن میں جمالیاتی احساس جھلکتا اور چھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

چوش نہ انت من مہر، نہ زاناں
دروشم ورنگ ءِ نہر، نہ زاناں
چوں بکناں اے زردءِ گنوکیں
لاپ ءِ دلانی آچش ءِ روکیں
چمانی ارساں ھوریں شلوکیں
چوں بدیانش چیر، نہ زاناں
چوش نہ انت من مہر نہ زاناں
دروشم ءِ رنگ ءِ نہر نہ زاناں (173)۔

ترجمہ: ایسا نہیں کہ مجھے پیار اور محبت کا پتہ نہ ہو۔ خوبصورتی کی قدر و

قیمت مجھے معلوم نہ ہو لیکن اس پاگل دل کا کیا کروں ، سینے میں بھڑکی ہوئی آگ اور بارش کی طرح برستے آنسوؤں کا کیا کروں۔ان کو کیسے چھپاؤں۔ ایسا نہیں کہ مجھے پیار اور محبت کا پتہ نہ ہو۔خوبصورتی کی قدر و قیمت مجھے معلوم نہ ہو۔

جمالیاتی احساس کے حوالے سے جن نظموں کا خصوصی طور پر حوالہ دیا جا سکتا ہے ان میں ''موڑی لڑتگ میرانی''''ڈیوا''۔''بیا اور مُرید''۔دل ءِ چماں گوں بچار''۔''زہیر نالی گشیت''۔''اشتر''۔''بلک''۔''گورگیں گوریچ''۔''بہار اھت''۔''سہر اءِ شپ''۔''کوکو''۔(174)۔

ان کے علاوہ ''اومان''۔''توئے''۔''نیرءِ برمش''۔''گل ستا''۔ ''آزار''۔''آس زہیرانی''۔''ترانو دبیارنت''۔''مہلبانی بو''۔''نازانی''۔ ''سومری''۔''گوہر ترپیں استار''۔''مھگل''۔''پرتہ زہیراں''۔''پرنگیں مہری''۔''دیستاں پری ءَ''۔''بادشاہی آئی''۔''چمانی ٹپ''۔''توتل''۔ ''گمانانی مئیل''۔''کجائے''۔''کایاں من پدا کایاں''۔''من ءَ زہیر جنگ''۔''بیا او مہری''۔''ماہکان ءَ بگند''۔''دیدارتئی جنگ''۔''شال ءِ گوات''۔''مہرءِ کشار''۔''دھنکیں ءِ پر''۔''دل زہیرانی''۔(175)۔ ''بولان ہار کنت''۔''کونجانی رم ءَ''۔''دابانی پری''۔''یات''۔''مہر نہ

زاناں''۔ اودرینی ہمرنگ''۔ ''بے علمیں جنکے''۔ ''منی ساہ''۔ (176)۔
''آھوءِ صحرائی''۔ ''ناز کنان''۔ ''پیگام''۔ ''یار جانی''۔ ''دیم ءُ انت''۔
''پلدپ''۔ ''لاھوسگ''۔ ''تریاک لنٹ''۔ ''کرت ءُشت''۔ ''زندگی''۔
(177)۔ ''واب ءُ دیستگاں''۔ ''زندگی چم جنت''۔ ''گھمانی ھنکین''۔

''دنیاءِ دود''۔ ''زندان ءِ شپ''۔ (178)

ان اشعار کے علاوہ اور بھی ان کے بہت سے ایسے اشعار ہیں جن میں جمالیاتی احساس اپنی پوری شدت کے ساتھ قاری کو متوجہ کرتا ہے۔ بلوچی اشعار کے علاوہ اُردو میں بھی میر گل خان نصیؔر کی کئی نظمیں اور غزلیں اس پیمانے پر پورا اتر سکتی ہیں۔

کنارے دریا جیونی کے میں غم کے آنسو بہا رہا ہوں
تمھارے وعدوں کو یاد کر کے جگر کی شمعیں جلا رہا ہوں
گماں نہ تھا اس قدر بگڑ کر بنیں گے پھر نہ عزیز ہم سے
اسی تفکر میں غرق ہو کر میں سر کو اپنے جھکا رہا ہوں (179)

جس عہد اور جن حالات میں میر گل خان نصیر نے شاعری کی ان حالات کے تناظر میں ان اشعار میں جس حد تک موضوع اجازت دے سکے یا اس وقت کے شعری موضوعات برداشت کر سکے میر گل خان نصیر نے اپنی

شاعری میں جمالیاتی احساس کو برقرار رکھا وہ چونکہ وابستگی اور فکری بنیاد پر شاعری کرتے تھے اس لیے اگر ناقدین ان سے بڑھ کر جمالیاتی احساس کا تقاضا کریں گے پھر انھیں شاید مایوسی کا سامنا کرنا پڑے۔

اگر میر گل خان نصیر کی شاعری کا غیر جانبدارانہ انداز میں اور ادبی رویوں کو مدنظر رکھ کو تجزیہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ ہر طرح کی خامیوں سے بالاتر ہے۔ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے۔ان کے شاعری کی جن کمزوریوں نے مجھے متوجہ کیا ان میں ایک اہم بات زبان کی کمزوری ہے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کا بے جا استعمال ہے اور غالبًا بعد میں میر گل خان نصیر کو اس بات کا احساس بھی ہوا تھا اور وہ زبان کے حوالے سے خالصیت کی طرف سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اپنے ایک مشہور انقلابی نظم ''قدم قدم روان بہ بت'' میں بھی انھوں نے زبان کے حوالے سے خالصیت لانے کی کوشش کی اس شعر کا پہلا مصرعہ اسطرح تھا۔

گرندۂ بارۂ برقۂ بار

تہارۂ تیرہ شب بہ بیت

اور بعد میں کچھ الفاظ کے حوالے سے تبدیلی لاکر یہ مصرعہ اس طرح

تا۔

گروک ءُ گرندءُ هارءُ گوات

بختہ سیائیں شپ بہ بیت (180)

اسکے علاوہ ان کی شاعری میں تکرار کا عنصر کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ الفاظ کا تکرار، خیالات اور موضوعات کا تکرار۔ یہ صورتحال کافی اشعار میں دکھائی دیتی ہے۔

حاک ءُ وطن ءِ پہ زرءُ سیم ءَ مدئیت
گھئیرانی حریرءِ پہ، گلیم ءَ مد۔ نہت
گرآس بگواریت ءُ جہان تین بہ بیت
ننگ ءَ وتی، اچ ترس ءَ و بھیم ءَ مدئیت (181)

آگے اسی خیال کو میر گل خان نصیر اس طرح دہراتے ہیں۔

بیلاں! وطن ءِ لجءُ میارءِ دروھی
ننگانی قسم، مات ءُ گہارءِ دروھی
حاک ءُ وطن ءِ پہ زرءُ سیم ءَ مدیہت
ماتی وطن ءِ پھلیں بہارءِ دروھی (182)

اسی طرح ایک اور قطعہ میں میر گل خان نصیر اپنے خیالات کو دہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انسان، گون کائنات ءَ مڑان انت چہ ازل

ہرچی ءَ گران، دیان انت، وتی ڈول ءَ بدل

ہچ چیے دراءَ نہ روت چہ دست ءَ بشرءِ

کل بنتی گلام و بندگ بے مرگ ءُ اجل (183)

پھراسی تصور کو، الفاظ بدل کروہ یوں پیش کرتے ہیں۔

آسمان و زمین و ہرچی ایشانی تہ ءَ

استنت و بنت، کائنت من انسان ءِ رہ ءَ

پرشنت و کپنت نرمی ءَ دیما بشرءِ

کل بنتی پہ اکھتیار، بزاں بید چہ سہ ءَ (184)

الفاظ، خیالات اور موضوعات کا تکرار، ان دیئے گئے صرف دو مثالوں سے بات کو واضح کرنے کی کوشش ہے بصورت دیگر ایسی اور مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

ردیف اور قافیہ کی تلاش میں انھوں نے غالباً شعری ضرورت کے لیے بعض جگہ بے شناخت، بے معنی، گم شدہ اور غیر اہم الفاظ استعمال کیے ہیں جو بھدے اور بدصورت لگتے ہیں۔ کچھ اشعار میں یہ مقصد پورا کرنے کے لئے انھوں نے ایسے الفاظ کا سہارا بھی لیا ہے جنکے معنی اور مطالب کچھ اور بنتے

ہیں جبکہ میر گل خان نصیر نے خود ان سے اپنے مطلب اور غرض کے معنی اخذ کیے ہیں۔(185)

میر گل خان نصیؔر کو عقیدے کی نظروں سے دیکھنے کی بجائے ،تنقیدی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس سے ان کے پیغام کو مزید تقویت مل سکتی ہے۔

ان کی شاعری کو پڑھنا، سمجھنا اور پرکھنا، ان کی شاعری کے رنگ سے رنگنا، انکے استعمال کیے ہوئے الفاظ سے لذت لینا اور ان کے فکر سے راستے تلاش کرنا زندگی کا ایک با مقصد عمل ہے اور ہمیں گل خان نصیؔر کی زندگی بخشنے والی شاعری، زندہ لوگوں کی طرح پڑھنا اور سمجھنا چاہیئے اور پھر اپنی زندگی کے تجربات میں انھیں جگہ دینی چاہیئے کیونکہ انھوں نے اپنے کلام میں زندگی کے ......باوقار اور آزاد زندگی کے .... راستے پیش کیے ہیں۔آج کا تقاضا یہ ہے کہ اُنھیں ہماری طبعیت اور مزاج، عادات واطور، جزبات واحساسات ،زبان اور ادب ،فکر اور شعور کا الگ نہ ہونے والا حصہ ہونا چاہیئے۔(186)۔

باب دوئم

حواشی

1۔گل خان نصیر۔مشہدنا جنگ نامہ۔1981۔ص9

2۔گوھرملک۔''بابا''۔بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر1984۔ص15

3۔م۔ص۔آزات۔''کوھن ونوک ءِ ھواران نصیر''۔تپتان۔مئی جون 1990۔ص19۔

4۔مجاھد بریلوی۔بلوچستان مسئلہ کیا ہے (انٹریو۔میر گل خان نصیر۔1978۔کراچی)1984۔ص18

5۔ایضاً۔

6۔عبداللہ جان جمالدینی۔''گل خان نصیرءِ شاعری ءِ بارہ ءَ''۔تپتان۔مئی جون1990۔ص44۔

7۔مجاھد بریلوی۔بلوچستان مسئلہ کیا ہے۔1984۔ص99

8۔میر گل خان نصیر۔گلبانگ (طبع دوئم)1989۔ص6

9۔عبدالرحمٰن کُرد۔''بلوچستان کی ایک عظیم سرمایہ''۔میر گل خان نصیرفن اور شخصیت (مرتبین)1986۔ص82۔

10۔مجاھد بریلوی۔بلوچستان مسئلہ کیا ہے۔1984۔ص99

11۔ محمد بیگ بیگل۔ "گل خان نصیر"۔ ماہنامہ آساپ۔ تربت۔ تجم

اکتوبر 1994۔ ص 3

12۔ میر گل خان نصیر (سخن ہائے گفتنی) حون ءِ گوانک ابوکی پیلہ۔

1988۔ ص 27

13۔ عبداللہ جان جمالدینی "دوتیں ءَ شیرین ءِ داستان" ماہنامہ بلوچی۔

کوئٹہ دسمبر 1986۔ ص 12

14۔ عبداللہ جان جمالدینی۔ "میر گل خان نصیر۔ صحافی"۔ ماہنامہ بلوچی

دنیا۔ ملتان۔ دسمبر 1984۔ ص 29۔

15۔ غلام فاروق۔ "بلوچی لبزانکءِ سی سال"۔ مے بلوچستان۔

21 اگست 1980۔ ص 25۔

16۔ "کریم امن سے دوباتیں"۔ نوائے وطن۔ کوئٹہ۔ 25 اپریل 1984

17۔ نور محمد شیخ۔ "میر گل خان نصیر اور عوامی ادبی انجمن کا باہمی تعلق"۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست" (مرتبین) 1993۔ ص 130۔

18۔ لال بخش رند۔ "میر گل خان نصیر شاعر انقلاب"۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔ (مرتبین) 1993۔ ص 68۔

19۔ نور محمد شیخ۔ "میر گل خان نصیر اور عوامی ادبی انجمن کا باہمی تعلق" میر گل

خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست (مرتبین)۔ص130

20۔ایضاً۔ص۔131

21۔ایضاً۔ص132۔

22۔لال بخش رند۔ ''نصیر کی زندگی کے آخری دور کی تلخ حقیقتیں۔'' میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست (مرتبین)۔1993۔ص92

23۔بالمشافہ انٹرویو۔ کرنل (ر) سلطان محمد خان مینگل۔ 14 نومبر 2000۔کوئٹہ۔

24۔محمد بیگ بیگل۔ ''میر گل خان نصیر''۔ماہنامہ آساپ۔تربت۔ستمبر اکتوبر 1994۔ص4

25۔اے بی اشرف۔ادب اور سماجی عمل۔1980۔ص18۔

26۔میر گل خان نصیر۔گرند۔1971۔ص15۔

27۔میر گل خان نصیر۔حون ءِ گوانک۔1988۔ص28۔

28۔سید عابد علی عابد۔اسلوب۔1971۔ص9

29۔میر مٹھا خان مری۔ ''بلوچی ادب''۔ثقافت اور ادب وادی بولان میں۔1966۔ص150

30۔میر گل خان نصیر۔گرند۔1971۔ص18+19

31۔ ایضاً۔ ص 17

32۔ سجاد باقر رضوی۔ مغرب کے تنقیدی اصول۔ 1971 (طبع دوئم)۔ ص 259

33۔ یار محمد یار۔ ''جدید بلوچی شاعری کا میر کاروان'' میر گل خان نصیر فن اور شخصیت (مرتبین) 1986۔ ص 66۔

34۔ میر گل خان نصیر۔ گرنند۔ 1971 ص 18+19۔

35۔ سجاد باقر رضوی۔ مغرب کے تنقیدی اصول۔ 1971 (طبع دوئم) ص 28۔

36۔ میر گل خان نصیر۔ ''میں اور میرا فن''۔ گل خان نصیر فن اور شخصیت۔ 1986۔ ص 19۔

37۔ ایضاً۔ ص 20+21

38۔ ایضاً 19

39۔ میر گل خان نصیر۔ گرنند۔ 1971۔ ص 12۔

40۔ میر گل خان نصیر (پیش لفظ) گرنند

41۔ میر گل خان نصیر داستانِ۔ دوستین وشیرین۔ 1964۔ ص 7 تا 21

42۔ میر گل خان نصیر (مترجم) شاہ لطیف گونشیت۔ 1983۔ ص 3 تا 17

43۔ میر گل خان نصیر (مترجم) بینائی کیچگ ء۔ 1980۔ ص 2 تا 6۔

44۔ گچین۔ بلوچی ادبی دیوان۔ 1965۔

45۔بحوالہ اکبر بارکزئی

46۔سید ہاشمی۔ سستگیں دستونک۔ص75

47۔سید ظہور شاہ ہاشمی۔سید نمدی۔ص13۔

48۔عبدالصبور بلوچ(مبصر) ''سید نمدی''۔ ماہنامہ آساپ۔ تربت۔ فروری 1993۔ص44۔

49۔میر گل خان نصیر۔''مکتوبات''۔اومان۔اپریل 1951۔

50۔گوہر ملک۔''یاتانی پاھار''۔تپتان۔مئی جون 1990۔

51۔ایضاً۔

52۔ایضاً۔

53۔غیر مطبوعہ خط بنام محمد یوسف عزیز (مگسی)

54۔ایضاً۔

55۔پروفیسر عبدالغنی غنو۔بابائے پشتون کے خطوط (جلد اول) 1991 ۔ص25۔

56۔غیر مطبوعہ خط بنام گل بانو۔یکم جون 1976۔سنٹرل جیل حیدرآباد (سندھ)

57۔ غیر مطبوعہ خط بنام ملک جان (گوھر)۔5 جنوری 1977۔سنٹرل جیل حیدرآباد (سندھ)

58۔ادیب سہیل ۔''پابلو نرودا: ایک مطالعہ'' سہ ماہی ادبیات ۔ اسلام
آباد۔ 1997۔ص 270۔
59۔ایضاً۔ص 265۔
60۔انور مسعود۔''عشقی۔ایران کا ایک شاعرِ شوریدہ سر۔ سہ ماہی ادبیات۔
اسلام آباد۔ 1996 ص 781۔
61۔ایضاً۔۔ص 276۔
62۔امرتا پریتم/احمد سلیم۔ایک اداس کتاب۔ 1987۔ص 39۔
63۔ایضاً۔ص 41۔
64۔ایضاً۔ص 62۔
65۔گل خان نصیر۔''میں اور میرا فن''۔ ماہنامہ بلوچی دنیا۔ملتان۔ دسمبر
1984۔ص۔8۔
66۔آصف فرخی/شاہ محمد پیرزادہ (مترجم) دانش ایاز 1998۔ص 132
67۔فیض احمد فیض ۔''ناظم حکمت''۔ ماہنامہ اُمنگ۔ کراچی ۔ فروری
1985۔ص 50۔
68۔مجاھد بریلوی۔ بلوچستان مسئلہ کیا ہے۔ 1984۔ص 101۔
69۔ایضاً۔ص 99۔

70۔ میر گل خان نصیر۔ داستان دوستین وشیرین۔ 1964 ص 7 تا 21۔

71۔ ایضاً۔

72۔ میر گل خان نصیر۔ حملِ جیہند۔ 1969۔

73۔ میر گل خان نصیر۔ ھپت ھیکل۔ 1990 ص۔ 7۔

74۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچی عشقیہ شاعری۔ 1979۔ ص د

75۔ ایضاً۔ ص ل

76۔ محمد پناہ (تعارف نگار) بلوچی رزمیہ شاعری۔ گل خان نصیر۔ 1979۔ ص 9

77۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچی عشقیہ شاعری۔ 1979۔ ص ا+ب

78۔ ایضاً۔

79۔ گل خان نصیر۔ ''میں اور میرا فن''۔ گل خان نصیر فن اور شخصیت (مرتبین)۔ 1986۔ ص 25۔

80۔ گل خان نصیر (سخن ہائے گفتنی) حون ءِ گوانک (لہو کی پکار) پرویز سلیم بلوچ (مترجم) 1988۔ ص 30۔

81۔ ایضاً۔ ص۔ 29

82۔ غوث بخش بزنجو (پیش لفظ) گلگال۔ گل خان نصیر۔ 1992۔ ص 11

83۔ ایضاً۔

84۔ مجاھد بریلوی۔ بلوچستان مسئلہ کیا ہے۔ 1984۔ ص 101
85۔ غیر مطبوعہ خط بنام ملک جان (گوھر ملک) 6 فروری 1977 سینٹرل جیل حیدر آباد (سندھ)
86۔ گل خان نصیر (سخن ہائے گفتنی) حون ءِ گوانک۔ 1988۔ ص 30۔
87۔ گل خان نصیر۔ بلوچی عشقیہ شاعری۔ 1979۔ ص ب
88۔ ایضاً۔
89۔ فیض احمد فیض۔ نسخہ ہائے وفا (شام شہر یاراں)۔ ص 584
90۔ ایضاً۔
91۔ میر گل خان نصیر۔ شنبلاک۔ 1996۔ ص 148 تا 152۔
92۔ میر عاقل مینگل۔ ''شاعری ءِ شرگداری''۔ ماہنامہ بلوچی کوئٹہ۔ دسمبر 1987۔ ص 11۔
93۔ عطا شاد۔ ''سینائی ءِ کچگ ءَ''۔ ماہنامہ زمانہ بلوچی کوئٹہ۔ نومبر دسمبر۔ 1982
94۔ نور بلوچ غمگین ''منی پسند''۔ ماہنامہ بلوچی کوئٹہ۔ جون 1988۔ ص 81۔
95۔ عطا شاد۔ اولس گچین (حصہ دوئم) 1978۔
96۔ مجاھد بریلوی۔ بلوچستان مسئلہ کیا ہے۔ 1984۔ ص 101۔
97۔ میر غوث بخش بزنجو ''بلوچی زبان کا بہت عظیم شاعر''۔ گل خان نصیر فن

اور شخصیت (مرتبین)۔ 1986۔ ص 8.

98۔ م۔ ص۔ آزات۔ ''کوھن ءُ نوک ءِ ھواران نصیر''۔ تپتان۔ مئی جون 1990۔ ص 16۔

99۔ میر عاقل مینگل ''شاعری ءُ شرگداری''۔ ماہنامہ بلوچی کوئٹہ۔ دسمبر 1987۔ ص 11

100۔ روزنامہ انتخاب۔ حب۔ 24 مارچ 2001۔

101 م۔ ص۔ آزات''۔ کوھن ءُ نوک ءِ ھواران نصیر''۔ تپتان مئی جون 1990۔ ص 18۔

102۔ ریکارڈ شعبہ بلوچی جامعہ بلوچستان و سلیبس ایم اے بلوچی۔

103۔ روزنامہ انتخاب۔ حب۔ 24 اپریل 2001

104۔ قیوم بیدار۔ براہوئی زبان وادب (ایک جائزہ) 1996۔

105۔ آغا میر نصیر خان احمد زئی بلوچ۔ دی گرائمر آف بلوچی لینگویج۔

106۔ گل خان نصیر۔ ''میں اور میرا فن''۔ گل خان نصیر فن اور شخصیت۔ 1986۔ ص 16۔

107۔ انور احسن صدیقی۔ ''زندگی کی سچائیوں کا شاعر''۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست (مرتبین) 1993 ص 102۔

108۔ عطا شاد۔ ''سینائی ءِ کیچگ ءَ''۔ ماہنامہ زمانہ بلوچی۔ کوئٹہ۔ نومبر

دسمبر 1982 ص 21۔

109۔ یاسمین نظامی۔ "بلوچی شاعری کا ارتقاء"۔ سہ ماہی ادبیات۔ اسلام آباد بہار 1992۔ ص 100۔

110۔ لال بخش رند۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست 1993۔ ص 71۔

111۔ سلیم خان گمی۔ بلوچی ادب۔ بلوچ ثقافت۔ 1990 (طبع دوئم) ص 37۔

112۔ حکیم بلوچ۔ سنگ گراں۔ 2000 ص 220۔

113۔ میر گل خان نصیر/امداد نظامی (مترجم) سہ ماہی ادبیات۔ اسلام آباد۔ بہار 1992۔ ص 126۔

114۔ رسول حمزہ/فیض احمد فیض (مترجم) نسخہ ہائے وفا (سر وادی سینا)۔ ص 468۔

115۔ گل خان نصیر۔ شپ گروک۔ 1964۔

116۔ گل خان نصیر۔ گرند 1971۔

117۔ گل خان نصیر۔ گلبانگ۔ 1979 (طبع دوئم)۔

118۔ گل خان نصیر شنبلاک۔ 1996۔

119۔ گل خان نصیر۔ پرنگ 1988۔

120۔گل خان نصیر۔حون ءِ گوانک (لہوکی پکار)1988۔ص81

121۔ایضاً۔۔ص97۔

122۔عبداللہ جان جمالدینی۔تپتان۔مئی جون1990۔ص43+44

123۔کامل القادری۔گائے جابلوچستان۔1971۔ص49۔

124۔عطا شاد رعین سلام۔درین۔ص75۔

125۔عبداللہ جان جمالدینی۔''دوتین وشیرین ءِ داستان''۔ماہنامہ بلوچی۔کوئٹہ۔دسمبر1986۔ص12۔

126۔عبداللہ جان جمالدینی۔''جلگہیں چاگئے ءِ شکر گالیں شاعر''۔گشین (ردانک) صورت خان مری۔1969۔ص131۔

127۔جٹس میر خدا بخش بجارانی مری۔قدیم بلوچی شاعری۔1976 (طبع دوئم) ص111+112

128۔گل خان نصیر۔شپ گروک۔1964۔

129۔م۔ص آزات۔تپتان۔مئی جون1990۔ص20۔

130۔غوث بخش بزنجو (پیش لفظ) گلگال۔گل خان نصیر1993۔ص6

131۔آزات جمالدینی۔رژن۔1985۔ص92۔

132۔گل خان نصیر۔شپ گروک۔1964۔ص14۔

133۔گل خان نصیر۔گرنند۔1971۔ص 82۔

134۔عطاشاد۔گشین (شاعری)1972۔ص 93,45

135۔عطاشاد۔شپ،سحار،اندیم۔1996۔

136۔بشیر بیدار۔گوربام۔1982

137۔بشیر بیدار۔ھزام۔1990

138۔بشیر بیدار۔کریاب۔1999

139۔جی آر مُلا۔"شاعرِ نگدکار"۔ماہنامہ بلوچی۔کوئٹہ۔اپریل 1989۔ص 14

140۔جی آر مُلا۔بژن۔1981۔

141۔رزاق نادر۔واب سبزنت پدا۔1998

142۔ڈاکٹر فضل خالق۔دل گدان۔2000۔ص 17

143۔ڈاکٹر علی دوست بلوچ۔ایتکیں راہ سر۔1999

144۔اللہ بخش بزدار۔ھشکیں رکھ سوز بنت۔1988

145۔مبارک قاضی۔زرنوشت۔1990

146۔ایضاً۔ص 79۔

147۔گل خان نصیر۔گرنند۔1971۔ص 34۔

148۔صبادشتیاری۔ماہنامہ چاگرد۔کوئٹہ۔ستمبر اکتوبر 1989۔ص 22

149۔ م ص آزات۔ تپتان۔ مئی جون 1990 ص 16۔

150۔ عطا شاد۔ ماہنامہ زمانہ بلوچی۔ کوئٹہ۔ نومبر دسمبر 1982۔ ص 21

151۔ سلیم گرد "۔ ہمارے دور کا بالاچ "۔ ماہنامہ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ دسمبر 1984 ص 71۔

152۔ حفیظ حسن آبادی۔ "بے دروریں شاعر نصیر"۔ ماہنامہ بلوچی۔

153۔ الفت نسیم۔ "نوکیں نوبت ءِ مئے مستریں شاعر"۔ ماہنامہ زمانہ بلوچی۔ کوئٹہ۔ ستمبر 1982۔ ص 26۔

154۔ گل خان نصیر۔ حون ءِ گوانک (لہو کی پکار) 1988۔ ص 48۔

155۔ ایضاً۔ ص 43۔

156۔ ایضاً۔ ص 61۔

157۔ ایضاً۔ 117۔

158۔ ایضاً۔ ص 26۔

159۔ سید عابد علی عابد۔ اسلوب۔ 1971۔ ص 9۔

160۔ میر مٹھا خان مری۔ "بلوچی ادب" ثقافت اور ادب وادی بولان میں 1966۔ ص 151۔

161۔ فصیح الدین سالار۔ "میر گل خان نصیر کی شاعری اور سیاست" میر گل

خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔1993۔ص105+106۔

162۔کشور ناہید۔باقی ماندہ خواب۔1982ص283۔

163۔ایضاً۔ص39۔

164۔ایضاً۔ص101

165۔عبدالعزیز خالد (مترجم) میرا داغستان ۔رسول حمزہ ۔ ماہنامہ اسلوب۔کراچی1980۔ص316۔

166۔میر گل خان نصیر۔شنبلاک۔1996۔ص61

167۔نور محمد شیخ ۔''نصیر کا ادبی اور سماجی شعور''۔ گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔1993۔ص123۔

168۔کشور ناہید۔باقی ماندہ خواب۔1982۔ص284۔

169۔عابد حسن منٹو۔''نصیر تاریخ کی کڑیوں کو جوڑنے والا شاعر''۔میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔1993۔ص40۔

170۔گل خان نصیر۔حون ءِ گوانک (لہو کی پکار)1988۔ص48۔

171۔ایضاً۔ص41۔

172۔فیض احمد فیض (ابتدائیہ) نسخہ ہائے وفا (دستِ صبا) ص8۔

173۔گل خان نصیر۔گرند۔1971۔ص88۔

174۔گل خان نصیر شپ گروک۔1964۔

175۔میر گل خان نصیر۔پرنگ۔1988

176۔میر گل خان نصیر۔گرئند 1971۔

177۔میر گل خان نصیر۔گلگال۔1993۔

178۔میر گل خان نصیر۔شنبلاک 1996۔

179۔آغا محمد ناصر۔بلوچستان میں اُردو شاعری۔2000۔ص 104۔

180۔گل خان نصیر۔شپ گروک۔1964۔

181۔گل خان نصیر۔گرئند۔1971۔ص 30۔

182۔ایضا۔ص 180۔

183۔ایضاً۔ص 58

184۔ایضاً۔ص۔171۔

185۔م ص آزات۔تپتان۔مئی جون 1990۔ص 20۔

186۔ایضاً۔ص 19۔

باب سوئم

محقق

1۔ تحقیقی موضوعات

2۔ اسلوبِ تحقیق

3۔ تحقیق کے میدان میں کارنامے

تحقیقی موضوعات:

تحقیق کیا ہے؟ اس سوال کو جب ہم علمی اصطلاح کے طور پر جاننے اور کھوجنے کی کوشش کرتے ہیں تو نتیجہ اسطرح نکلتا ہے کہ

''یہ دراصل سچ اور حقیقت کی دریافت کا عمل ہے۔ یہ اک ایسے طرزِ مطالعہ کا نام ہے جس میں، موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مُسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے یعنی جب کسی امر کی اصل شکل پوشیدہ یا مبہم ہو تو اس کی اصلی شکل دریافت کرنے کا عمل تحقیق ہے'' (1)

اسطرح غیر موجود حقائق کی دریافت ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ موجودہ حقائق کا دوبارہ جائزہ لینے میں بھی آسانی ہوسکتی ہے۔ یہ چیزیں اگر مناسب اسلوب میں آگے بڑھتی جائیں تو اس سے حدودِ علم میں توسیع کے وسیع امکانات بھی پیدا ہونگے۔

اس صورت حال کو آگے بڑھانے اور پروان چڑھانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ زندگی اور علم کے مختلف شعبوں میں نئے موضوعات اور زاویوں کا خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔

کوئی قلمکار جب اِن تحقیقی موضوعات پر کام کرتا ہے تو

دراصل وہ تاریخ میں اپنے لئے جگہ اور مقام کا تعین بھی کر رہا ہوتا ہے۔

تحقیق کے میدان میں موضوع کے انتخاب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ میر گل خان نصیرؔ نے ایسے تحقیقی موضوعات اپنائے جن سے انھیں نہ صرف گہری دلچسپی تھی بلکہ یہ موضوعات ان کے رجحان اور مزاج کے بھی عین مطابق تھے۔

میر گل خان نصیرؔ نے قومی تہذیب و تاریخ اور ادبی تاریخی تحقیق کو خصوصیت کے ساتھ پیشِ نظر رکھا یعنی انھوں نے تہذیب کو تحقیق کیلئے وسیلہ بنایا اور اپنی قومی تاریخ مرتب کی۔ تحقیق کے میدان میں انھوں نے ادب کو مقصد کا درجہ دیا اور ساتھ ساتھ انھوں نے تاریخ اور ادب کے مشترکہ موضوعات کو بھی موضوع سخن بنایا۔

میر گل خان نصیرؔ نے بلوچوں کی قومی تاریخ دو جلدوں میں ترتیب دی۔ یہ انکا خاص موضوع تھا۔ اسکے علاوہ ''بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں'' لکھ کر اپنے تحقیق کا دائرہ اور وسیع کر دیا۔ بلوچستان کی تاریخ کا ایک اچھا خاصا حصہ اور مختلف ادوار کے حالات و واقعات چونکہ قدیم شاعری میں موجود ہیں اس لیے انھوں نے خصوصیت کے ساتھ اس شعبے کی طرف بھی توجہ دی۔ ''بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی'' اسی سلسلے

کی ایک کڑی ہے۔ اپنی مٹی اور قوم کی محبت سے سرشار میر گل خان نصیرؔ کو سائیں شاہ عبداللطیف بھٹائی سے بھی رجوع کرنا پڑا لہذا انھوں نے ''شاجور سالو'' سے متعلقہ اشعار کے کچھ ترجمے بھی کیئے جو ''شاہ لطیف گوئشیت'' کے نام سے منظر عام پر آئے۔ بلوچوں کی تاریخ کو جہاں بھی توڑ مروڑ کے پیش کیا گیا، یا کہیں لاشعوری طور پر کسی سے کوئی غلطی سرزد ہوئی میر گل خان نصیرؔ نے ان مواد کا محققانہ تجزیہ کر کے اُنھیں ترجمے کے مراحل سے گزار کر اُن میں تصحیح کر کے حاشیے کا اضافہ کر دیا۔ خصوصاً اخوند محمد صدیق اور مرزا احمد علی کے فارسی مسودے ''اخبار الابرار'' کو تاریخِ خوانینِ قلات کے نام سے اور لانگ ورتھ ڈیمز (Longworth Dames) کی (The Baloch Race) کو کوچ و بلوچ کے عنوان سے محققانہ اور عالمانہ روئیوں کے ساتھ منظر عام پر لے آئے۔

میر گل خان نصیرؔ نے تحقیق کے میدان میں جن موضوعات کا انتخاب کیا یہی موضوعات اصل میں روایات کی تشکیل و تعمیر میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اسلوبِ تحقیق:

عالموں نے جن اوصاف کو محققوں کیلئے ضروری گردانا ہے وہ تمام اوصاف میر گل خان نصیرؔ میں موجود تھے۔ کرداری اور اخلاقی لحاظ سے اُن میں حق گوئی، غیر جانبداری اور بے تعصبی، تحقیق کی طرف رغبت اور ولولہ، مزاج میں اعتدال، منکسر المزاجی، اخلاقی جرات، مزاج میں ڈٹ کر محنت کرنے کا مادہ اور صبر وتحمل جیسے اوصاف اُن میں موجود تھے۔

ذہنی طور پر اُن کا مزاج غیر مقلدانہ تھا، وہ ضعیف الاعتقاد بھی نہیں تھے، مشکک ہونے اور سائنس دان کی سی قطعیت جیسے وصف بھی اُن میں پائے جاتے تھے اچھے حافظے کے مالک اور ذہن کو سکون اور یکسوئی کے ساتھ کام پر مرکوز رکھنے کی صلاحتیں بھی اُن کا خاصہ تھیں۔

علمی نقطہ نگاہ سے ان میں نامعلوم کو معلوم کرنے اور ڈھونڈ نکالنے کی لگن تھی، اپنے ماضی سے گہری شناسائی رکھنے کے سبب انھیں تاریخ کا شعور بھی حاصل تھا۔ اپنی مادری زبان کے علاوہ اور کئی زبانوں سے اُسکی اچھی شناسائی تھی۔ ادب۔ کے میدان میں اُنھیں بہت سارے ادبی شعبوں سے براہِ راست تعلق تھا۔ اسطرح تحقیق کرتے وقت میر گل خان نصیرؔ مواد

تلاش کرنے، انھیں پرکھنے اور ترتیب دینے میں بھی اچھی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

میر گل خان نصیر نے تحقیق کو مشغلے کے طور پر کبھی بھی نہیں لیا۔انھوں نے تحقیق کو ایک ذہنی رویے کے طور پر ایک طرزِ زندگی کے انداز میں اپنایا وہ تحقیق کو سچ کا کھوج لگانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔اپنے مذہب اپنی قوم، اپنی زبان اور علاقہ وغیرہ سے تعلق اور رشتہ رکھتے ہوئے بھی وہ کہیں بھی تنگ نظری اور انتہاپسندی کا شکار نظر نہیں آتے۔

تحقیق کرتے وقت انکے مقاصد میں لالچ وتمع ، جاہ جلال، عہدہ وترقی اور دولت و انعام کبھی بھی شامل نہیں رہے۔کم نتائج حاصل کرنے کیلیئے بہت زیادہ ماخذ کی جانچ پرکھ کرتے تھے۔ دورانِ تحقیق اگر انکے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوتے تو وہ اپنی تحقیق کا دائرہ مزید بڑھا دیتے۔ جب تک وہ اپنی مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کرتے تحقیق پر تحقیق کیے جاتے۔

میر گل خان نصیر کے تحقیقی مواد کا تجزیہ کرنے سے یہ بات بھی بغیر ہچکچاہٹ کے کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے کہیں بھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا اور نہ کہیں جذباتی انداز اپنایا انھیں اگر کسی تحریر یا روایت سے

اچھی اور مفید معلومات مل جاتیں تو انھیں قبول کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ حق بات کو حق کہنے اور ناحق کو ناحق کہنے میں انھیں کبھی بھی خوف اور اندیشہ لاحق نہیں رہا۔ تحقیق کر کے وہ جو بھی رائے قائم کرتے اور بعد میں مُدلل انداز میں اگر کوئی اسے رد کرتا تو انھیں اپنا موقف بدلنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ وہ سچی لگن سے تحقیق کرتے اور اپنے مزاج میں ڈٹ کر محنت کرنے کا مادہ بھی انھوں نے پیدا کیا تھا۔

انکا مزاج تحقیق کے میدان میں کبھی بھی مقلدانہ نہیں رہا

اور نہ ہی انھوں نے کہیں بھی ضعیف الاعتقادی کا مظاہرہ کیا۔

دورانِ تحقیق میر گل خان نصیر نے ترجیحی بنیادوں پر ان تمام فن پاروں اور شعراء حضرات کو ادبی تاریخ کا حصہ بنایا جن میں ماضی بننے کی اہلیت موجود تھی۔ انھوں نے اُن شعراء اور فن پاروں کو زیادہ اہمیت دی جن کے ہاں یا جن میں عام زندگی کی عکاسی ہوتی تھی۔ جہاں جہاں ادبی تاریخ کو میر گل خان نصیر نے تحقیق کے مراحل سے گزارا وہاں انھوں نے اس تاریخ کو ادب کے مسلسل ارتقاء کے طور پر پیش کیا، اگر کہیں بھی غیر ادبی عوامل کا شامل ہونا ضروری ہوا تو ان عوامل کو میر گل خان نصیر نے ثانوی حیثیت دی۔ اسطرح وہ ادبی تاریخ نہ تو تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اور نہ

ہی سوانحی انداز اس میں غالب رہا۔ انھوں نے ادب کی تاریخ کو صرف شعراء اور انکے کلام کے آغاز و ارتقاء کی روشنی میں نہیں دیکھا بلکہ انھوں نے ادبی تاریخ کی اس تحقیق کو انسانی اور سماجی ارتقاء کے عروج و زوال سے منتھی بھی کر دیا۔ انھوں نے جن ادوار کی ادبی تاریخ پر تحقیق کی، شعوری طور پر اس دور کے تاریخی حالات و واقعات دورانِ تحقیق انکے پیش نظر رہے۔ وہ تمام تخلیقات اور رویئوں کو انسان کی سماجی تاریخ کے رشتوں سے جوڑ کر کیسے، کہاں، کیوں اور کب جیسے سوالات کو ذہن میں رکھ کر دیکھتے۔

قومی تاریخ پر تحقیق ہو یا ادبی تاریخ پر دونوں صورتوں میں میر گل خان نصؔیر کا انداز بیانیہ ہے۔

تحقیق کے میدان میں کارنامے:

میر گل خان نصؔیر نے تحقیق کو بطورِ فن بے شک کبھی بھی نہیں اپنایا لیکن اسکے باوجود انکی محققانہ کاوشیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ تحقیق کے میدان میں میر گل خان نصؔیر کے کارنامے کسی فرد کے نہیں بلکہ کسی انجمن کے کارنامے لگتے ہیں جسکے لئے یقیناً میر گل خان نصؔیر کی کاوشیں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

ذیل میں ہم سنہ کے حساب سے ترتیب وار میر گل خان نصیرؔ کے تحقیقی کارناموں کا تذکرہ کریں گے۔

تاریخ بلوچستان (جلد اول) ۱۹۵۲:

یہ نہ صرف میر گل خان نصیرؔ کی پہلی تحقیقی کتاب ہے بلکہ اس کتاب کو پہلی مستند تاریخ کا درجہ بھی حاصل ہے۔ (3) یہ کتاب جو چار ابواب اور ۳۴۰ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۹۵۲ میں منظرِ عام پر آئی۔ تاریخ بلوچستان میں بلوچوں کی ابتدائی زاد و بوم سے لیکر ان کی بلوچستان میں آمد اور میر نصیر خان (دوئم) کے ادوار تک کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ دانشور اور محققین میر گل خان نصیرؔ کی اس کاوش کو جامع مانتے ہیں۔

''میر گل خان نصیر غالباً پہلے بلوچ میں جو کئی سالوں کی مسلسل تحقیق و تجسس اور کد و کاوش کے بعد بلوچستان کی ایک جامع تاریخ پیش کر رہے ہیں۔ میر گل خان نصیر کی یہ کوشش اور عرق ریزی قابلِ قدر اور مستحق ستائش ہے''۔ (4)

تاریخِ بلوچستان (جلد دوئم) ۱۹۵۷ء:

تاریخِ بلوچستان کا دوسرا حصہ پہلی دفعہ ۱۹۵۷ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ جسے قومی کتاب گھر کوئٹہ کی جانب سے شائع کیا گیا۔ تاریخِ بلوچستان کی یہ دوسری جلد پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جو خان میر خداداد خان کے دور سے لیکر خان میر یار احمد خان ۱۹۵۵ء کے دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ جو تاریخ بلوچستان کی پہلی جلد کا تسلسل ہے۔ تاریخِ بلوچستان کی دوسری جلد کو مرتب کرتے وقت وہ مسائل اور مشکلات یقیناً میر گل خان نصیرؔ کے سامنے نہیں آئے جو تاریخ بلوچستان جلد اول کو مرتب کرتے وقت انھیں پیش آئے تھے مگر اسکے باوجود بقولِ میر گل خان نصیرؔ۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ جلد اول کی تصنیف، ترتیب وتدوین او رحالات کی جمع آوری، چھان بین اور قطع و برید میں جو مشکلات درپیش تھیں، حصہ دوئم کی تصنیف کے وقت اگرچہ ویسی نا قابلِ عبور اور نا قابل دسترس مشکلات حائل تو نہ تھیں لیکن اس سلسلہ میں بعض ایسی مشکل کڑیاں ضرور پڑتی رہیں جن کو ایک دوسرے سے جوڑنے اور ربط دینے میں دقیق غور وفکر اور احتیاط کی ضرورت تھی۔''(5)

جن ادوار کو میر گل خان نصیؔر نے اپنی تاریخ کا حصہ بنایا، ان ادوار کے حالات اور واقعات کو انھوں نے کافی محنت اور تحقیق کے بعد ترتیب دیا ہے۔ ان حالات اور واقعات کو ترتیب دیتے وقت میر گل خان نصیؔر نے نہ کہیں اپنی پسند و ناپسند کو اہمیت دی اور نہ کہیں خود سے من گھڑت روایات اخذ کیں۔

''میر گل خان نصیؔر کا اپنے مقصد کی افادیت سے مضبوط اور غیر متزلزل یقین زیرِ نظر تصنیف اور مندرج واقعات کی صحت میں معمولی سی بھی شک کی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا اور یہ بالکل درست ہے کہ پرستش کے نشے میں سرشار ہو کر انھوں نے بتانِ فخر و ناز کو جنم دینے کی قطعاً کوشش نہیں کی بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ زیرِ نظر کتاب مورخ کے ذاتی رجحانات اور پسند و ناپسند کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہے تو بھی مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔'' (6)

میر گل خان نصیؔر نے تاریخِ بلوچستان کو ترتیب دیتے وقت اتنے حوالے اور مواد سے اسے مزین کیا ہے کہ اس تاریخ کو سب سے زیادہ مستند تاریخ تسلیم کیا جاتا ہے اور اب تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

داستان دوستین وشیرین ۱۹۶۵:

اس کتاب کا ماخذ دوستین وشیرین کی عشقیہ داستان پر مبنی ہے جسے میر گل خان نصیر نے منظوم انداز میں قلمبند کیا ہے اور اسے تاریخ کے صفحوں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ بھی کر لیا ہے۔

بلوچی پبلیکیشنز کوئٹہ کی جانب سے ۱۹۶۴ء میں چھاپی گئی یہ کتاب ۱۵۹ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو زیور طبع سے زمانہ پریس کوئٹہ نے آراستہ کیا ہے۔

"............ گو کہ یہ بلوچی عشقیہ داستان ہے، مگر کیسی داستان۔" جو گزشتہ دنوں اور ادوار کی یاد دلائے، جو سچے اقدار کو متعارف کرائے اور مرجھائی ہوئی زندگی کیلئے انمول تحفہ بن کر اُبھر آئے............" (7)

دوستین وشیرین کی داستان پر مبنی اس تحقیقی کتاب کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ داستان کو منظوم کرتے وقت میر گل خان نصیر نے اپنا تعلق ماضی سے بھی جوڑے رکھا۔

اس داستان کو لکھنے اور منظوم کرنے کی تحریک کا سبب ناظم حکمت کی تحریر کردہ فلم "شیرین فرھاد" نامی داستان بنی۔ جسے میر گل خان

نصیرؔ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ انجام تک پہنچایا اور اس داستان کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے لوک ادب کا حصہ بنا دیا۔

اس کتاب میں تحقیق کا عنصر دوستین و شیرین کی رومانوی داستان کی کڑیوں کو جوڑنے کا عمل تھا اور ساتھ ساتھ اُن حالات، واقعات اور کرداروں کو منظرِ عام پر بھی لانا تھا جن سے اس داستان کی ابتداء ہوئی، آگے بڑھی اور انجام تک پہنچی۔ نظم کی صورت میں اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اسطرح کا تجربہ بلوچی ادب میں ابھی تک کسی نے نہیں کیا۔(8)

حمل وجیہند ۱۹۶۴:

اس کتاب میں تحقیق کا دائرہ حمل جیہند کے دور پر مبنی ہے۔ یہ تقریباً پانچ سو سال پہلے کی داستان ہے جسے میر گل خان نصیرؔ نے منظوم کر کے پیش کیا ہے۔

میر حمل، سردار جیہند خان ھوت کا بیٹا تھا۔ ھوت بلوچوں کا یہ طائفہ چونکہ ابتدائی دور میں بلوچستان کے ساحلِ سمندر پر کلمت کی بندرگاہ اور اُس کے نواحی علاقوں میں آباد تھے اس لیے یہ لوگ کلمتی کہلاتے تھے۔ کلمت وہ مقام ہے جسکا ذکر مشہور یونانی مورخ ھیروڈوٹس کی تاریخ میں بھی

ملتا ہے۔ ہندوستان سے واپسی پر بابل جاتے ہوئے سکندر اعظم بھی اسی
مقام سے گزرا تھا جہاں اسکی سپاہ کو پانی کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔
بعض لوگ ھوت کو یونانی نام "ھوریشی ئس" کی بگڑی ہوئی بلوچی کہتے ہیں۔
انکا خیال ہے کہ ھوت ان یونانیوں کے پسماندگان میں سے ہیں جو سکندر
اعظم کی سپاہ سے کٹ کر اس علاقے میں ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ آباد
ہوگئے تھے۔(9)

میر گل خان نصیرؔ کی تحقیق پر مبنی یہ کتاب جسے لال بخش رند نے بلوچی
پبلکیشنز کی طرف سے ۱۹۶۹ء میں چھاپا بیانوے ۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔
اس میں سات داستانیں ملک حمل کی داستان کو انجام تک پہنچاتی ہیں۔
تحقیق کرتے وقت گل خان نصیرؔ نے غیر مستند روایتوں کو
رد کر دیا مثلاً بلوچوں کے ہاں آج تک یہ روایت مشہور ہے کہ جب فرنگی حمل
کو گرفتار کر کے لے جاتے ہیں تو اُسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ کسی فرنگی سے
شادی کر لے تاکہ فرنگیوں میں حمل جیسا نڈر اور بہادر شخص پیدا ہو۔ فرنگی لڑکی
سے بیاہ کرنے سے انکار کرنے پر حمل کو قتل کر دیا جاتا ہے اور اس کا گوشت
اپنی عورتوں کو کھلائی جاتی ہے۔

روایت کرتے ہیں کہ جن جن عورتوں نے حمل کا گوشت کھایا ان کو حمل ٹھہر گیا اور ان کے ہاں بچے پیدا ہوئے اور اس وجہ سے فرنگیوں میں حمل کی نسل اب تک پائی جاتی ہے۔

میر گل خان نصیرؔ حمل کی شخصیت کو ایک علامتی روپ میں سامنے لے آتے ہیں اور واقعتاً پانچ سو سال گزرنے کے باوجود بلوچ سماج میں حمل کو ایک آئیڈیل کے طور پر یاد کیا جاتا ہے کہ جسکا سب سے اہم منصب بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا اور انھیں مار بھگانا اور اپنے وطن اور لوگوں کا دفاع کرنا تھا۔

کوچ و بلوچ ۱۹۶۹:

کوچ و بلوچ جسے بلوچی پبلیکیشنز کی جانب سے لال بخش رند نے ۱۹۶۹ء میں وفائی پرنٹنگ پریس کراچی میں چھاپ کر شائع کیا ایک سو بیانوے صفحات پر مشتمل ہے جسکے سات مختلف ابواب میں تحقیق کا دائرہ پھیلتا اور وسیع ہوتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔

تحقیق کے نقطہ نگاہ سے یہ انتہائی اہم تاریخی دستاویز ہے اس کتاب پر تنقیدی نقطہ نگاہ ڈالتے ہوئے میر عاقل خان مینگل لکھتے ہیں۔

''میر گل خان نصیر کی نئی تصنیف ''کوچ و بلوچ'' جو کہ تقریباً ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے تاریخی لحاظ سے ایک دلچسپ اور کارآمد کتاب ہے۔ مصنف نے کوچ، مہشوار اور نمرود بلوس کے بارے میں نئے انکشافات کرکے آئندہ تاریخ نویسوں کیلئے مزید تحقیقات وانکشافات کے دروازے کھول دیے ہیں۔'' (10)

''کوچ و بلوچ'' دراصل لانگ ورتھ ڈیمز (Longworth Dames) کی تاریخی و تحقیقی کتاب (The Baloch Race) کا ترجمہ ہے مگر اس میں میر گل خان نصیر نے نہ صرف اضافہ کردیا ہے بلکہ مختلف مراحل میں غلط معلومات وروایات کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی طرف سے حاشیے میں ان کی وضاحت بھی کی ہے۔ اسطرح یہ کتاب کلی طور پر ترجمہ کے زُمرے میں بھی نہیں آسکتی۔

''اسے آپ ڈیمز صاحب کی اس کتاب کی تشریح وترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ بالکل ایسا نہیں ہے کیونکہ اس کے پہلے تین باب جو کوچ، قدیم سیوائی قبائل اور نمرود بلُوس سے متعلق کوائف کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور جو کو کہ اسی سلسلہ کی بنیادی کڑیاں ہیں لیکن، ڈیمز صاحب کی نظر ان کی طرف نہیں گئی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس نے ایک خاص مقصد کے پیش

۱۹۴۰ میں جبکہ اس نے اپنا زیر بحث مقالہ
نظر ایسا کیا ہے۔ ممکن ہے کہ سنہ
متعلق یہ انکشافات نہیں ہوئے ہوں
لکھا، کوچ، مشوار اور نمرود بلوس سے
کے بعض مقامات پر مسٹر فوشے اور کئی
جوزاں بعد، افغانستان و ایران
(11)۔ ہوئے ہیں''۔
دوسرے فرانسیسی ماھرینِ آثارِ قدیمہ کے ذریعے سے
تاریخی مواد اکھٹا کرتے کرتے جب مسٹر ڈیمز کی کتاب
میر گل خان نصیرؔ کے زیر مطالعہ آئی تو اس میں انھیں بعض بنیادی غلط فہمیاں
پیدا ہونے کا اندیشہ ہوا۔ اسکے حل کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ اس کتاب
کا رد لکھا جاتا مگر میر گل خان نصیرؔ نے اس لیے ایسا نہیں کیا کہ اصل کتاب اس
وقت جب میر گل خان نصیرؔ کوچ و بلوچ پڑھ رہے تھے، ناپید ہو چکی تھی۔ اس
طرح قاری کو موازنہ کرنے کا موقع بھی نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے میر گل
خان نصیرؔ نے دوسرا راستہ اختیار کیا یعنی اصل کتاب پر وضاحتی نوٹ لکھ کر،
اور کوچ و بلوچ سے متعلق بنیادی مسائل پر جداگانہ تفصیلی بحث کی تاکہ قاری
کو مطالعہ و موازنہ میں آسانی ہو۔ (12)

لانگ ورتھ ڈیمز کی تحقیق کو بنیاد بنا کر میر گل خان نصیرؔ نے
کوچ و بلوچ میں جو اضافے کیے اس کیلئے انھیں کافی مواد ڈھونڈنے پڑے
ہونگے اور جس انداز میں محنت اور وضاحت کے ساتھ انھوں نے اس کتاب

میں زیمیم کی بقول میر عاقل خان جدید طرزِ تاریخ نویسی یعنی سائنٹیفک انداز کا یہ ایک بہترین نمونہ ہے۔(13)

لانگ ورتھ ڈیمز کی کتاب (The Baloch Race) کا ترجمہ جناب کامل القادری (مرحوم) نے بھی کیا ہے۔ جو بلوچی دنیا کے ایک خصوصی شمارے کے صورت میں اور مابعد کتابی صورت میں بھی چھپ چکا ہے۔ ترجمے کی باریکیوں پر جناب کامل القادری نے بھی اچھی خاصی محنت کی ہے۔ لیکن میر گل خان نصیؔر نے اس میں بڑے تفصیلی اور معلوماتی حواشی تحریر کیے ہیں۔(14)

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ مذکورہ کتاب کو ایک دفعہ پھر تدوین و طبع کے مراحل سے گزارنا چاہیئے کیونکہ یہ کتاب تحقیق کے اعتبار سے انتہائی مفید اور معلوماتی کتاب ہے جو اب تقریباً ناپید ہو چکی ہے۔

بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی (1976)

یہ کتاب بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے مئی ۱۹۷۶ میں شائع کی گئی۔ تین سو چھبیس (۳۲۶) صفحات پر مشتمل اس کتاب کے پانچ مختلف تاریخی و تحقیقی ابواب ہیں۔

بلوچستان کی تاریخ کے متعلق ہمارے اکثر محققین ؛

مورخین اس رائے سے مکمل طور پر اتفاق کرتے ہیں کہ انکے بنیادی ماخذ

قدیم بلوچی اشعار ہیں جو سینہ درسینہ چلتے ہوئے ترتیب کے مرحلے تک پہنچے

ہیں۔ غیر بلوچ محققین میں میجر موکلر سے لیکر ڈینز برے تک اور بلوچ

مورخین میں سردار خان گشکوری سے لیکر آغا نصیر خان احمدزئی تک جن جن

لوگوں نے بلوچستان یا بلوچوں کی تاریخ مرتب کی انھوں نے بلوچی کے قدیم

اشعار سے ضرور استفادہ کیا، اسی طرح میر گل خان نصیر نے بھی ان اشعار کو

تاریخ کے حوالے سے کافی اہمیت دی جسکی مثال ''بلوچستان کی کہانی

شاعروں کی زبانی'' ہے۔

اس کتاب میں میر گل خان نصیر رزمیہ اور عشقیہ داستانوں

کے ساتھ ساتھ مختلف کرداروں کے حوالے سے تاریخ کو بیان کرتے ہیں۔

انکے علاوہ اقدار جو کسی بھی قوم کی عروج وزوال میں اہم کردار ادا کرتے ہیں

اس نقطے کو بھی میر گل خان نصیر نے نظر انداز نہیں کیا۔

''میر گل خان نصیر کی اس تالیف کے بارے میں، میں پورے وثوق

اور اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے سیاسی کردار ونظریات کے تضاد

کے باوجود یہ ایک ایسی کتاب ہے جو ہر قسم کی ذہنی اور سیاسی تعصبات سے

پاک ہے‘‘(15)

جسطرح ہم پہلے محقق کے اوصاف پر بات کر چکے ہیں، اس کتاب میں بھی میر گل خان نصیؔر انہی اوصاف پہ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ صاف گوئی، جرات، دلیل کے ساتھ اپنی بات کو آگے بڑھانا، تعصّبات سے اپنے آپ کو بالاتر رکھنا، خامیوں پر تنقیدی نگاہ ڈالنا یہ تمام اوصاف اس کتاب میں میر گل خان نصیؔر کی شخصیت کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔

’’زیرِ نظر تالیف میں کسی قسم کے اختلاف یا تضاد کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، جہاں انھوں نے مختلف نظموں میں کارفرما کرداروں کی اچھائیوں کو اجاگر کیا ہے، وہاں بعض برائیوں پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ جبکہ آج تک ان موضوعات پر لکھنے والے بیشتر اہل علم حضرات نے صرف مثبت اور روشن پہلو کو ہی نمایاں کرنے پر زورِ قلم صرف کیا ہے۔‘‘(16)

’’بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی‘‘ دراصل ایک منفرد زاویئے سے تاریخ کو ٹٹولنے کی کوشش ہے جو ایک نئے انداز میں دوسرے محققین کو تحقیق کرنے کیلئے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔

بلوچی رزمیہ شاعری (مئی ۱۹۷۹):

اس کتاب کی ابتداء میر گل خان نصیر نے مچ جیل کے چیچک وارڈ میں ۱۴ جولائی ۱۹۷۳ سے کی اور وہیں دسمبر ۱۹۷۳ کو اس کتاب کا اختتام ہوا۔ (17)

جیل کے سخت اور تنہائی کے ایام میر گل خان نصیر کی تحقیقی کاموں کے سلسلے میں بڑے کارآمد ثابت ہوئے ہیں یہ کتاب بھی انہی دنوں کی دین ہے۔

بلوچی رزمیہ شاعری مئی ۱۹۷۹ کو زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ اس کتاب کے پبلشر ہیں۔

جہاں کہیں اور جس قوم کی بھی تاریخ مرتب کی گئی وہاں قدیم اشعار سے یقیناً استفادہ کیا گیا ہوگا کیونکہ ان قدیم اشعار سے ہی قوموں کی زندگی اور ثقافت وتہذیب کے عروج وزوال کا پتہ چلتا ہے۔ میر گل خان نصیر بہ یک وقت دو طرح کا کام کرتے تھے ایک طرف وہ اپنی قدیم اور کلاسیکل شاعری کا کھوج لگاتے، انھیں ڈھونڈتے تو دوسری طرف وہ ان اشعار سے اپنی تاریخ بھی مرتب کر رہے ہوتے۔ بلوچی رزمیہ شاعری بھی

اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

اس تحقیقی کتاب میں بلوچی شاعری کی پشت پر پچھلی صدیوں کی ادبی تاریخ مرتب کرنا میر گل خان نصیرؔ کا منتہا نہیں تھا بلکہ اس کتاب میں ان رزمیہ اشعار کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی طرح بلوچستان اور بلوچوں کی تاریخ پر اثر انداز ہوتے آئے ہیں۔

پہلے باب میں ''بلوچستان، بلوچ اور بلوچی'' کے عنوان سے میر گل خان نصیرؔ نے زمین، قوم اور زبان کے حوالے سے تاریخ کی اُن کڑیوں کو ملانے کی کوشش کی جو تشکیل و تکمیل کے مراحل سے گزر کر ان اشعار کی تخلیق کا سبب بنیں۔

دوسرا باب بلوچی کی رزمیہ شاعری پر مشتمل ہے جسے مصنف زمانی تقسیم کے لحاظ سے تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

پہلا دور: اسے مصنف نے متقدمین کا دور کہا ہے۔ جو میر چاکر خان رند اور میر گواہرام لاشاری کے ادوار یعنی پندرھوں صدی کے اواخر سے شروع ہو کر پنجاب اور سندھ کی طرف ان کی نقل مکانی پر ختم ہوتا ہے جو سولھویں صدی کے نصف اول کے دور میں آتا ہے۔

دوسرا دور: مصنف اسے متوسطین کا دور کہتا ہے جو میر چاکر رند اور میر گواہرام لاشاری کی بلوچستان سے نقل مکانی (۱۵۵۰) کے بعد سے شروع ہوکر بلوچستان کی سرحدات پر انگریزوں کی آمد (۱۸۳۰) تک کے زمانے پر پھیلا ہوا ہے۔

تیسرا دور: اس دور کو مصنف متاخرین کا دور قرار دیتے ہیں۔ جو ۱۸۳۰ سے ۱۹۲۰ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور کو بلوچستان میں انگریزوں کی حکومت کا دور بھی کہتے ہیں۔ (18)

میر گل خان نصیر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے بلوچی رزمیہ شاعری پر پہلی دفعہ تحقیق کی اور آنے والے محققین کو ایک بنیاد فراہم کیا۔

بلوچی عشقیہ شاعری (اکتوبر ۱۹۷۹)

بلوچی عشقیہ شاعری دراصل مصنف کی کتاب بلوچی رزمیہ شاعری کا تسلسل ہے۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے یہ کتاب ۱۹۷۹ میں طبع ہوئی۔ یہ کتاب تین سو ستائیس (۳۲۷) صفحوں پر محیط ہے۔

جنگ وجدال اور ہجرت سے فارغ ہوکر جب بلوچوں کو

ہموئی کے ساتھ کہیں بیٹھنے اور مکمل طور پر سکونت پذیر ہونے کا موقع ملا تو اس کے نتیجے میں بلوچی شاعری میں عشقیہ رنگ بھی سامنے آنے لگی جو مختلف عشقیہ داستانوں سے اخذ کی گئی تھیں۔ حانی اور شے مرید، دوستین اور شیرین، شہداد اور مہناز، بیبگر اور گراناز کی عشقیہ داستانیں اس رجحان کو آگے بڑھانے میں انتہائی معاون ثابت ہوئیں۔

کتاب میں عشقیہ شاعری کے ان عنوانات کو مندرجہ ذیل موضوعات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ محبوبہ کے سراپا کے بیان میں

۲۔ ہجر و فراق کی کیفیت کے بیان میں

۳۔ خواہش وصل کے بیان میں

۴۔ قاصد سے خطاب میں

۵۔ صفاتِ یار کے بیان میں

۶۔ دیدارِ یار کے بیان میں

۷۔ یار سے تشبیہات کے بارے میں

۸۔ عاشقانہ بانکپن کے بیان میں

۹۔ داستان یا داستانگ کے بیان میں

۱۰۔ڈیہی کے بیان میں

ان موضوعات میں محبوبہ کے سراپا کے بیان سے لیکر عاشقانہ بانکپن کے بیان تک کے زیادہ تر ماخذ یہی عشقیہ داستانیں ہیں۔ جبکہ آخری دو موضوعات ''داستان یا داستانگ کے بیان میں'' اور ''ڈیہی کے بیان میں'' بلوچی کے لوک گیتوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔اس کتاب میں تحقیق کا دائرہ صرف ایک علاقے یا ایک قبیلے تک محدود نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ دورانِ تحقیق جتنے بھی مواد اور جن جن علاقوں کے شعراء کے کلام میر گل خان نصیرؔ کو دستیاب ہوئے ان سب سے میر گل خان نصیرؔ نے استفادہ کیا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے یہ پہلی اور بنیادی تحقیقی کتاب ہے۔اس سے پہلے مختلف مصنفین اور مولفین نے حوالے کے طور پر چند ایک اشعار کا ذکر ضرور کیا ہے مگر اس وسیع پیمانے پر کام کرنے کا اعزاز میر گل خان نصیرؔ کو حاصل ہے۔کم وسائل اور محدود ذرائع کے باوجود میر گل خان نصیرؔ کی انتھک محنت اس کتاب میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔

''اس سے پہلے بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی اور بلوچی رزمیہ شاعری چھپ کر قبولِ عام کرچکی ہے۔لیکن میری ذاتی رائے میں زیرِ

نظر تصنیف سابقہ تصانیف پر اس لئے فضیلت کی حامل ہے کہ اس میں مصنف نے زیادہ غور وفکر اور فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ موضوعات کے انتخاب اور ترتیب کے علاوہ بلوچی اشعار کا ترجمہ جس حسین ودلکش پیرائے میں کیا گیا ہے اور ان کی تشریح جس خلاقانہ انداز میں کی گئی ہے، اس کا تقابل سابقہ تصانیف سے نہیں کیا جا سکتا'' (19)

مشہدنا جنگ نامہ (۱۹۸۱)

''مشہدنا جنگ نامہ'' خانِ قلات نوری نصیر خان کی اُس داستان پر مبنی ہے جسے تاریخ میں جنگ مشہد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ کتاب براہوئی اکیڈمی کوئٹہ کی انیسواں مطبوعاتی سلسلہ ہے جو ۱۹۸۱ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ مجموعی طور پر چھبیس (۲۶) مختلف عنوانات پر مشتمل اس کتاب کے چار مندرجات ہیں جو اس ترتیب سے ہیں۔

ا۔ حمد باری تعالیٰ

ب۔ نعتِ رسولؐ

ج۔ ثنائے چار یار

د۔ مدحِ بادشاہ

نوری نصیر خان کی جنگی داستان پر مبنی براہوئی زبان میں یہ پہلی کامیاب منظوم رزمیہ کوشش ہے جس میں تاریخی واقعات کا علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

ماخذ کے طور پر میر بٹے خان مینگل کی بیان کردہ روایات سے استفادہ کرتے ہوئے میر گل خان نصیرؔ نے ان تاریخی واقعات کو قلمبند کر کے ہمیشہ کیلئے تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے۔

داستان دوستین و شیرین اور حمل جیہند جنکا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے، اسی طرح کی منظوم کاوشیں ہیں۔ اس کتاب میں روایتی بلوچی داستانوں کا فنی طور پر بھی خیال رکھا گیا ہے۔ بلوچی کے قدیم شعراء اکثر داستانوں کی ابتداء حمدیہ کلام سے کرتے تھے رسول کریمؐ کی تعریف و ثناء سے اپنے شعری سلسلے کو آگے بڑھا کر چار یاروں کی ثناء تک پہنچاتے تھے اور پھر اپنے اصل مضمون کو بیان کرتے تھے۔ یہاں میر گل خان نصیرؔ بھی اپنے اسی کلاسیکل روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔

حمل جیہند اور بالاچ کی طرح نوری نصیر خان بھی میر گل خان نصیرؔ کے آئیڈیل تھے۔

یہ ان دنوں کی داستان ہے جب افغانستان پر احمد شاہ ابدالی حکومت کیا کرتے تھے اور نوری نصیر خان بلوچستان کے خان تھے۔ نوری نصیر خان اپنی لشکر کے ساتھ احمد شاہ ابدالی کی مدد کو پہنچتے ہیں۔(20)

اس داستان کو بیان کرتے ہوئے میر گل خان نصیرؔ نے تحقیق کے فنی لوازمات کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا کیونکہ تحقیق کا مقصد اُس کے پیش نظر بھی نہیں تھا۔ لہٰذا انھوں نے اس بات کا خود اعتراف کیا ہے کہ شعری ضرورتوں کے پیش نظر انھوں نے کچھ چیزیں اپنی طرف سے اور مبالغے کی حد تک اس داستان میں شامل کردی ہیں۔(21)

ان تحقیقی کمزوریوں کے باوجود مشہد کے جنگی واقعے پر جب بھی کوئی محقق و مورخ لکھنے بیٹھے وہ اس تخلیق کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں (۱۹۸۲)

گیارہ ابواب اور تین سو اکسٹھ (۳۶۱) صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۸۲ کو منظرِ عام پر آئی اسکے پبلشر نساء ٹریڈرز ہیں۔

مصنف کی تاریخ بلوچستان (اول دوئم) سے یہ کتاب اس لئے منفرد ہے کہ اس میں کچھ ایسے اہم تاریخی اور تحقیقی مواد بھی شامل ہیں جنھیں تاریخ بلوچستان مرتب کرتے وقت مصنف نظر انداز کر چکے تھے۔ گیارہ ابواب میں سے سات ابواب ایسے ہیں جو تاریخ بلوچستان (اول دوئم) میں شامل نہیں ہیں یا جنکا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے۔اس کتاب میں ان موضوعات کو نئی تحقیق کی روشنی میں اور تفصیل کے ساتھ شامل اشاعت کیا گیا ہے۔قدرتی تقسیم (تیسرا باب) ذرائع زیست (چوتھا باب)، مشہور قبائل (پانچواں باب) ، زبان و ادب (چھٹا باب) مذہب (ساتواں باب)، کھیل اور رسوم و رواج (آٹھواں باب)، تاریخ سیاسی (دسواں باب) کچھ ایسے ابواب ہیں جن سے تاریخ تکمیل کے مرحلے تک پہنچتی ہے اور شاید میر گل خان نصیر نے ''بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں'' لکھ کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخ میر گل خان نصیر کا خاص موضوع تھا، انھیں بچپن سے ہی اپنی قوم اور وطن کی تاریخ کے ساتھ گہرا شغف رہا تھا وہ جب بھی کوئی تاریخی کتاب پڑھتا یا کسی بوڑھے بزرگ سے کوئی تاریخی روایت سنتا انھیں فوراً ضبط تحریر میں لاتا۔(22)

اس کتاب میں اپنے موقف کو مستند بنانے میں میر گل خان نصیرؔ نے اہم تاریخی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جن میں تاریخ افغانستان (جلد دوئم) از احمد علی کوہزاد، تاریخ بلوچ و بلوچستان از سردار خان بلوچ، تاریخ بلوچستان از نیٹو ھتورام، بلوچ نسل از لانگ ورتھ ڈیمز، بابلِ عظیم کا زوال از رونالڈ اے ناکس، بلوچستان گزیٹیر، ریڈرز آف دی سرحد از جنرل ڈائر وغیرہ جیسی کتابیں خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

میر گل خان نصیرؔ ذہنی طور پر کھوجنے، پرکھنے کے قائل تھے وہ تاریخ میں جھوٹ اور سچ کی تلاش پر یقین رکھتے تھے تب ان کیلئے مستند رائے قائم کرنا مشکل نہیں تھا۔(23)

بحرحال بلوچوں یا بلوچستان سے متعلق تاریخی تحقیق پر مبنی اس کتاب میں شامل مواد تاریخ کے پڑھنے والوں اور تاریخ سے استفادہ کرنے والوں کیلئے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

تاریخِ خوانینِ قلات (۱۹۸۲)

تاریخِ خوانینِ قلات دراصل دو مختلف فارسی مسودوں پر مبنی ہے جنھیں اخبار الابرار کے نام سے بالا ترتیب آخوند محمد صدیق اور مرزا

احمد علی احمد نے تحریر فرمایا ہے۔

میر گل خان نصیؔر نے اخبار الابرار میں جہاں بھی تاریخی اسناد کے خلاف کوئی واقعہ بیان ہوتے دیکھا یا بعض اشخاص و مقامات کے ناموں یا واقعات کی وضاحت کی ضرورت محسوس کی، ان سے متعلق انھوں نے تصیحی اور توضیحی نوٹ لکھے۔ جنکا ماخذ زیادہ تر مترجم کی کتاب تاریخ بلوچستان جلد اول و دوئم ہیں۔

جسطرح ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ تاریخ میر گل خان نصیؔر کا خاص موضوع رہا ہے اس لیے انھوں نے ایسی نایاب کتابوں کے ترجمے کو بھی اپنی ترجیحات میں شامل کر لیا تھا جن میں بلوچوں سے متعلق یا بلوچی اور بلوچستان کے بارے میں کوئی اہم مواد شامل ہوتا۔

بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار (۱۹۹۰ طبع دوئم) بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُسے مختلف شعراء کے کلام میں بھی اپنے من پسند موضوعات مل جاتے ان کو بھی ترجمے کا جامع پہناتے اس سلسلے میں شاہ لطیف گونشیت (۱۹۸۳) بھی ان کی انہی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ میر گل خان نصیؔر نے تحقیق کے میدان میں جتنے کام کیے اس

سے پہلے اور نہ ابھی تک کسی شخص یا ادارے نے اتنے کام کیے ہیں۔ تحقیق کے فنی نقطہ نگاہ سے گو کہ میر گل خان نصیر کا طریق تحقیق، تحقیق کے جملہ فنی لوازمات کو پورا نہ کر سکتے مگر ان کے اتنے سارے تحقیقی مواد کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور خصوصاً وہ لوگ جوان موضوعات پر کام کرنا چاہیں گے وہ میر گل خان نصیر کی ان تحقیقی کاوشوں سے ضرور استفادہ کر سکیں گے۔

باب سوئم

حواشی

1۔ڈاکٹر گیان چند۔ تحقیق کا فن۔ مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد۔ 1994۔ ص 01

2۔ایضاً۔ص 39۔

3۔اشیر عبدالقادر شاہوانی۔ ''میر گل خان نصیر''۔ ماہنامہ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ دسمبر 1984۔ ص 56۔

4۔غوث بخش بزنجو (دیباچہ نگار) تاریخ بلوچستان (جلد اول و دوئم) میر گل خان نصیر۔ 1986 (طبع سوئم)

5۔میر گل خان نصیر (دیباچہ) تاریخ بلوچستان (جلد اول و دوئم) 1986۔ (طبع سوئم) ص ف۔

6۔غلام محمد شاہوانی (دیباچہ نگار) تاریخ بلوچستان (جلد اول دوئم) میر گل خان نصیر۔ 1986 (طبع سوئم)۔

7۔آزاد جمالدینی (مقدمہ نگار) داستانِ دوستین و شیرین۔ میر گل خان نصیر۔ 1964۔ ص 6۔

8۔میر گل خان نصیر۔ داستان دوستین و شیرین۔ 1964۔ ص 7۔

9۔میر گل خان نصیر بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی۔ 1976 ص 227۔

10۔ اے کے بلوچ۔ "کیا بلوچ نسلاً سامی ہیں؟" بلوچی دنیا ملتان۔ اگست
1971۔ ص20۔

11۔ میر گل خان نصیر۔ کوچ و بلوچ۔ ص الف۔

12۔ ایضاً۔ ص ب۔

13۔ اے کے بلوچ "کیا بلوچ نسلاً سامی ہیں؟"۔ بلوچی دنیا۔ ملتان۔
اگست 1971۔ ص20۔

14۔ محمد پناہ (تعارف کنندہ) بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی۔ میر گل
خان نصیر۔ 1976۔ ص ج

15۔ ایضاً۔ ص د+ ھ۔

16۔ ایضاً۔ ص د۔

17۔ محمد پناہ (تعارف نگار) بلوچی رزمیہ شاعری۔ میر گل خان نصیر۔ 1979۔ ص9۔

18۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچی رزمیہ شاعری۔ 1979۔ ص32۔

19۔ محمد پناہ (تعارف نگار) بلوچی عشقیہ شاعری۔ میر گل خان نصیر۔ 1979۔

20۔ میر گل خان نصیر۔۔ مشہد نا جنگ نامہ۔ 1981۔ ص۔8۔

21۔ ایضاً۔

22۔ ایضاً۔ ص7

23۔ ایضاً۔ ص9

باب چہارم

صحافی

1۔ بلوچستانی صحافت ایک جائزہ

2۔ میر گل خان نصیرؔ بطورِ صحافی

3۔ صحافتی رجحانات و نظریات

بلوچستانی صحافت ایک جائزہ:

۱۸۷۶ میں جب نظامِ حکومت میں تبدیلی آئی تو اس علاقے کی اسٹریٹیجک اہمیت کے پیش نظر انگریزوں کی طرف سے اس علاقے کیلئے کچھ اقدامات ناگزیر تھے۔ ان اقدامات میں ریل کی پٹری کا بچھایا جانا، سڑکوں کی تعمیر اور محدود سطح پر آمدروفت کی سہولیات کی فراہمی شامل تھے۔(1)

انگریزوں نے یہ اقدامات اپنی سیاسی اور جغرافیائی ضروریات کیلئے اٹھائی تھیں۔ ان سہولتوں سے براہ راست یہاں کے لوگ مستفید نہیں ہورہے تھے۔ انگریز حکمران یہاں کے لوگوں کو شعوری طور پر ہر طرح سے پسماندہ رکھنا چاہتے تھے کیونکہ انھیں آداب حکمرانی کے گر اچھی طرح آتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ترقی دینے اور سہولیات بہم پہنچانے کا مقصد اپنی حکمرانی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا ہے لہذا وہ ایسے اقدامات سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ محدود پیمانے پر آمدروفت کی جو سہولیات دی گئی تھیں اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ یہاں چھاپہ خانے بھی پہنچ گئے۔

بیسویں صدی کے آغاز پر یہاں تین چھاپہ خانے کام

کر رہے تھے۔ وکٹوریہ پریس جو مارچ ۱۸۸۸ء میں قائم ہوا۔ البرٹ پریس
جس کی بنیاد تین سال بعد یعنی دسمبر ۱۸۹۱ء میں رکھی گئی اور کرزن پریس جس
نے ستمبر ۱۹۰۲ء میں کام کرنا شروع کیا۔(2)

چھاپہ خانے کے پہنچتے ہی یہاں اخبارات نکلنے بھی شروع
ہوئے۔ پہلا اخبار یکم نومبر ۱۸۸۸ء میں ''دی منتقلی بلوچستان ایڈورٹائزر''
کے نام سے نکلا۔

۲۳ اگست ۱۸۸۹ء میں اسکا نام تبدیل کر کے ''بارڈر
ویکلی نیوز'' رکھ دیا گیا۔ اب یہ ماہنامہ کے بجائے ہفت روزہ بن گیا۔

چار مہینے بعد یعنی یکم جنوری ۱۸۹۰ء کو اس ہفت روزہ اخبار کا
نام ایک دفعہ پھر تبدیل کر کے ''بلوچستان گزٹ'' رکھا گیا۔ یہ اخبار وکٹوریہ
پریس سے چھپتا تھا۔ اس کے علاوہ بارڈر ویکلی ایڈورٹائزر، ٹائمز آف
بلوچستان، ڈیلی گزٹ، راست گو وغیرہ بھی یکے بعد دیگرے وقتاً فوقتاً چھپ
کر شائع ہوتے رہے۔

گو کہ ان اخبارات کے اجراء سے بلوچستان میں صحافت
کا آغاز ہوتا ہے لیکن یہ تمام تر اخبارات انگریز حکمرانوں کی سیاسی، سماجی اور

انتظامی ضروریات کے پیشِ نظر نکلے۔ان میں عوام الناس کی خواہشات اور ضروریات کا کہیں بھی عمل دخل نہیں تھا۔ان میں اشتہارات ،فوجی افسروں کے تقرر وتبادلے، ترقی وتنزلی کے احکامات درج ہوا کرتے تھے اور جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ان نام نہاد اخباروں سے صرف جنگی پراپگنڈے کا کام لیا جاتا تھا اور بس۔(3)

''اخبارات میں خبریں نہ ہونے کے برابر تھیں۔تبصرہ سرے سے مفقود اور زیادہ تر اشتہارات ہوتے تھے۔............اخبارات میں شائع ہونے والے سرکاری اشتہارات واعلانات میں سول اور فوجی افسروں کے تقرو تبادلے، انگریز شہریوں کی شادی، اموات اور پیدائش، ریلوے، اسٹیمر سروس، ڈاک کی ترسیل کے اوقات وغیرہ شامل تھے۔............

اشتہارت زیادہ تر جم خانے میں ہونے والی ریسوں، برقی آلات، گاڑیوں، وائرلیس سیٹوں، شراب کی مختلف اقسام، ریڈی میڈ گارمنٹس، ڈانس پارٹیوں اور ایسی اشیاء اور خدمات کی تشہیر کیلیے تھے جو اُس دور کی مغربی طرز زندگی کی ضروریات کی عکاس تھیں............اس دور میں نکلنے والے اخبارات میں سے کوئی بھی بلوچستان کی کسی قومی زبان میں نہیں نکلا۔''(4)

ان مذکورہ مقاصد کے حصول کیلئے جو اخبارات نکلتے تھے وہ یقیناً حقیقی صحافت سے کوسوں دور ہوتے ہونگے۔ ان اخبارات کو عوام کے اجتماعی مسائل اور مفادات کا لحاظ بھی نہیں رہا ہوگا۔ ان سے بس انگریز حکمران اپنے دوررس مقاصد کے حصول کا کام لیتے تھے۔ جو سیاسی اور جغرافیائی لحاظ سے ان کیلئے اہم تھے۔

''اس دور میں ایجنٹ ٹو گورنر جنرل کے دفتر سے اخبارات کو جاری ہونے والے اجازت ناموں کی فائلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریونیو کمشنر کے دفتر سے صرف ان اخبارات کیلئے اجازت نامے جاری کرنے کی سفارش کی جاتی تھی جنکے بارے میں یہ کامل اطمینان ہو کہ اخبار کا مزاج سیاسی نہ ہوگا بلکہ صرف تجارتی یا پھر کسی حد تک سماجی ہوگا اور یہ کہ اخبار کے ناشر و مدیر کی تاج برطانیہ کے ساتھ وفاداری ہر شک و شبے سے بالاتر ہوگی۔ (5)

اس دور میں جس اخبار نے بھی انگریزوں اور انگریزی حکومت پر نکتہ چینی کی اس کے ناشر و مدیر ضرور حکمرانوں کے زیر عتاب رہے۔ انھیں ڈاک سے اخبار بھیجنے کی رعایت ختم کردی جاتی جو کہ مدیر اور ناشر کیلئے نہایت ہی تکلیف دہ ثابت ہوتا تھا۔ اگر وہ باز نہ آتے اور اس نقصان کو برداشت کر لیتے تب اُنھیں جلاوطن بھی ہونا پڑتا جس نے اخبار

خود بخود بند ہو جاتا۔

ہندوستان کے دوسرے شہروں سے جو جو اخبار آتے تھے مثلاً زمیندار، سیاست، انقلاب، ویر بھارت، تیج، پرتاب وغیرہ ان کے پڑھنے والے بھی سی آئی ڈی کی نظروں میں رہتے تھے۔ شہر میں تقسیم کرنے سے پیشتر ان اخباروں کی پڑتال کر لی جاتی تھی۔ بعض دفعہ اخبار ضبط بھی کر لیے جاتے تھے۔ سی آئی ڈی کیلئے کسی شخص کو اخبار پڑھتے دیکھ لینا بہت بڑی خبر ہوا کرتی تھی۔ (6)

بلوچستان میں صحافت کے آغاز کا جائزہ لینے سے جو صورتحال اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ انتہائی مایوس کن ہے لیکن اسکا ارتقائی مرحلہ خاصا حوصلہ افزاء دکھائی دیتا ہے۔

بلوچستان میں انڈیا پریس ایکٹ ۱۸۶۷ کا نفاذ نہیں تھا بلکہ اخبارات کو نوٹیفکیشن نمبر ا............۲۶۵۱ مورخہ ۲۵ جون ۱۸۹۱ کے تحت اشاعت کی اجازت دی جاتی تھی۔ بلوچستان میں اس ایکٹ کا اطلاق ۱۹۳۸ میں ہوا اور اس کے بعد یہاں کے باسیوں کو باقاعدہ پریس اور پلیٹ فارم کا حق ملا۔ (7)

کمال الدین احمد اپنی کتاب ”صحافت وادی بولان میں“

میں رقمطراز ہیں۔

"انگریز کو تو اخبار جاری کرنے کی اجازت تھی مگر کسی ہندوستانی کو اجازت نہیں تھی اور جن انگریزوں نے ابتداء میں اخبار جاری کئے وہ دراصل ایسٹ انڈیا کمپنی کے راندہ درگاہ تھے.........

۱۹۳۷ تک یہاں پریس ایکٹ لاگو ہی نہیں تھا چنانچہ زلزلے کے بعد خان عبدالصمد خان اچکزئی نے جب استقلال جاری کرنے کیلئے منظوری مانگی تو اُنھیں بتایا گیا کہ یہاں پریس ایکٹ لاگو نہیں چنانچہ اُنھوں نے پنجاب جا کر اس کیلئے جدوجہد کی اور پریس ایکٹ آیا" (8)

۱۹۳۵ میں جب کوئٹہ شہر زلزلے کی تباہ کاریوں سے ملیا میٹ ہوا تو اس وقت رائج صحافت بھی اسکی زد میں آ گئی۔ پچاس ہزار آبادی کے اس شہر میں زلزلے سے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پینتیس سے چالیس ہزار افراد لقمہ اجل بن گئے۔ بچے کچے، لٹے پٹے لوگوں میں سے زیادہ تر ہندوستان چلے گئے جہاں سے وہ روشن خیالی اور سیاسی بیداری کی لہر ذہنوں میں لے کر واپس لوٹے۔ تب کوئٹہ تعمیرِ نو کے عمل سے گزر رہا تھا۔ سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اور ساتھ ساتھ صحافت میں بیداری اور مقصد سے وابستگی کے رویئے بھی در آئے۔ اسطرح بلوچستان میں اصولی صحافت کا

بے باک لب ولہجہ ۱۹۳۵ کے زلزلے کے بعد نمودار ہوتا ہے۔ جب یہاں کے باسی آس پاس اور ہمسایہ ممالک کی سیاسی اور فکری تحریکوں سے اثر قبول کرتے ہیں۔ مقصد سے وابستگی اور تعلق انسان کو اظہار کیلئے مجبور کرتی ہے لہذا یہاں کے باسیوں نے بھی اس شعبے سے استفادہ کرنا چاہا تا کہ آگاہی اور بیداری کیلئے اپنے حصے کا حق ادا کر سکیں۔

انہی نظریات پر عمل پیرا یہاں سے پہلا اخبار استقلال (۱۹۵۱-۱۹۳۸) منظرِ عام پر آیا جسکے پہلے ایڈیٹر قدوس صہبائی تھے۔ کچھ عرصے خان عبدالصمد خان اچکزئی نے اس کی ادارت کی۔ یہ ہفتہ وار اردو اخبار تھا جسے عزیز پریس سے تدوین وطبع کے مراحل سے گزارا جاتا تھا۔ اس اخبار نے روشن خیال لوگوں یعنی انجمنِ وطن اور نیشنل پارٹی کی ترجمانی کا بھرپور حق ادا کیا۔

یہاں سے نکلنے والے اخباروں سے پہلے ۱۹۳۰ کے اوائل میں بلوچ اخباروں کی اشاعت شروع ہوئی اور کئی زیرِ زمین بلوچ سیاسی گروپ تشکیل دیئے گئے۔ جن میں ایک اہم پلیٹ فارم عبدالعزیز کرد کی ''انجمن اتحاد بلوچاں'' ہے۔ ۱۹۳۳ میں کراچی سے نکلنے والے اس تنظیم /تحریک کے اخبار ''البلوچ'' نے ایک نقشہ شائع کیا جس میں عظیم تر

بلوچستان کے طول و عرض اور سرحدوں کی نشاندھی کی گئی تھی۔

۱۹۴۰ کے اواخر میں کوہستان کے نام سے خان آف قلات نواب میر احمد یار خان نے ایک ہفتہ وار اخبار اردو میں جاری کیا تھا جسکے ایڈیٹر محی الدین قائد تھے۔ اس کے صرف چند پرچے شائع ہوئے اور پھر یہ اخبار بند ہوگیا۔ یہ اخبار ریاستِ قلات کا سرکاری ترجمان تھا۔

ان کے علاوہ بعد میں یکے بعد دیگرے اور بھی اخبارات نکلنا شروع ہوئے جن میں الحق، دولت، زمانہ، میزان، پکار، کلمتہ الحق، رھبرِ نسواں، بولان، تعمیرِ بلوچستان، ساربان، اتحاد، نوائے وطن، میثاق الحق، نوائے بولان، نوکیں دور، بلوچستان جدید وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان اخبارات میں بہت سارے بند ہو گئے۔ لیکن کچھ نام ابھی تک صحافتی میدان میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ (9)

استقلال، نوائے بولان، نوائے بلوچستان، نوائے وطن اور نوکیں دور نے اپنے اداریوں، مضامین اور خبروں کی اشاعت کے سلسلے میں بے باک صحافت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ لوگوں میں شعور اجاگر کرنے، سماجی تبدیلیوں کیلئے انھیں تیار رکھنے اور ہمسایہ ممالک میں جاری تحریکوں سے انھیں آگاہ کرنے میں ان اخبارات کا بہت ہی اہم کردار رہا ہے۔ (10)

صحافتی محاذ پر بہت سارے لوگ ''جہاد'' میں مصروف تھے۔ یہ ایسے لوگ تھے کہ جو اپنی مٹی اور لوگوں سے واضح پاسداری رکھتے تھے۔ ان میں عبدالعزیز کرد، غلام محمد شاہوانی، یوسف عزیز مگسی، عبدالصمد خان اچکزئی، میر گل خان نصیر، نسیم تلوی، حسن نظامی، قدوس صہبائی، ملک محمد رمضان، کریم شورش، عبدالرحمٰن غور، زمرد حسین، محمد حسین عنقا، عبدالرحمٰن کرد، اسلم اچکزئی وغیرہ شامل تھے۔ ان لوگوں اور ان کے اخبارات نے بے پناہ مصائب و مشکلات کا سامنا کیا۔ ان میں سے اکثر کو جیل، جرمانے اور جلاوطنی کے دن بھی دیکھنے پڑے مگر ان کے پیروں میں لغزش نہیں آئی۔ اخبار نکالنا اور اُسے روشن فکر طبقے کا ترجمان بنانے کا مقصد اپنے آپ کو بے پناہ مصائب و مشکلات میں ڈالنا تھا لہذا کبھی کبھی اپنے مقصد کے حصول کیلئے ان کو بلوچستان سے باہر جا کر بھی صحافتی محاذ پر لڑنا پڑتا۔ عالی جاہ ملک فیض محمد یوسفزئی اپنے ایک مضمون ''رفیق اور دوست گل کی یادیں اور باتیں'' میں رقمطراز ہیں۔

''چونکہ بلوچستان میں اخبار نکالنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے مرحوم محمد حسین عنقا صاحب اور پیر محمد عرف نسیم تلوی نے پارٹی کے ایما پر کراچی سے ''بلوچستان'' اور ''بلوچستان جدید'' کا اجراء کیا اور بابو عبدالکریم شورش

جیکب آباد میں اخبار ''الحنیف'' سے منتھی ہو گئے۔ اب تحریک میں قدرے دم آ گیا۔ پھر مرحوم اسلم اچکزئی نے جو ایک انتہا پسند مخلص نوجوان تھا ساتھیوں کے مشورے سے ایک اخبار نکالا جسکا نام ''شعلہ و شرارہ'' تھا۔ جیکب آباد میں ہمارا قیام اسلم کے ہاں تھا۔ وہ بھی فقر و فاقے کا شکار تھا۔ لیکن اسکے حوصلے کی بلندی آسمان سے باتیں کیا کرتی تھی۔ اسلم اچکزئی کا اخبار ہاریوں کے حقوق کا ترجمان تھا۔ وہ نصیر آباد میں جاگیرداروں سے بالکل دست بہ گریبان تھا اور جاگیردار اس کو قتل کرنے کے درپے تھے''۔ (11)

ان اخبارات اور ان سے وابستہ لوگوں نے بلوچستان میں صحافتی تاریخ کو ایک مضبوط اور مستحکم بنیاد فراہم کر دی، ایک ایسی بنیاد کہ جسے تاریخ کبھی بھی بھلا نہ پائے گی۔

محترمہ یمی نغمانہ طاہر اپنے غیر مطبوعہ مقالے میں لکھتی ہیں۔

''ابلاغیاتی روایات کا کھوج لوک، کلاسیکل اور عہد جدید کے حوالے سے ثقافت، فنون و ہنر، جغرافیائی صورتحال اور عالمی تبدیلیوں کے تناظر میں کرتے ہوئے جب ہم تحریک آزادی کے دور میں داخل ہوتے ہیں تو دراصل ہم قدیم قبائلی نظام سے سرداری نظام کے عبوری عائلی قوانین کے دور تک اور پھر ریاست اور ریاست سے متعلق اداروں کے ادراک کے دور میں آتے

ہیں۔ جہاں سیاسی، جمہوری عمل اور جدو جہد مختلف سطحوں پر نظر آتی ہے۔ جس پر قوم پرست سیاست کا گہرا اثر ہے۔ ان سیاسی تحریکوں کی نمائندہ صحافت اور صحافیوں کی زبان چاہے کچھ بھی رہی ہو لیکن ایک بات تحقیق میں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ بلوچستان میں صحافت کا بے باک لب ولہجہ ہے۔ جس میں مزاحمت اور دلیل دونوں خوبیاں موجود ہیں۔"(12)

یہی خوبیاں اور رویئے اُس دور کی صحافت کا غالب رجحان رہی ہیں۔ جنکا پڑھنے والے آج بھی تقاضا کرتے ہیں۔

بطورِ صحافی:

میر گل خان نصیر کی ہمہ جہت شخصیت میں صحافت سے وابستگی کا پہلو بھی ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح صحافت میں بھی وہ اپنے کاز اور مقصد سے گہری کمٹمنٹ کے قائل تھے۔ زندگی کے دوسرے متحرک شعبوں میں جسطرح انھوں نے اپنا مطمع نظر عوام کو بنایا، جس طرح انھوں نے عوام کے دکھ درد اور مسائل کو اہمیت دی اسی طرح صحافت میں بھی وہ اپنے انہی رہنما اصولوں پر مستقل مزاجی سے کار بند نظر آتے ہیں۔ وہ

صحافت میں حق گوئی کے قائل تھے۔ اپنے مقصد سے لگاؤ اور اپنے قوم کی شعوری سطح کو بلند کرنا ان کا سب سے بڑا مشن تھا۔ بلوچستان کی صحافت میں میر گل خان نصیؔر ایک ایسے منفرد کردار کے طور پر اُبھرے جس سے ان کی صحافتی زندگی مختلف حلقوں کیلئے ایک علامت اور مثال بن گئی۔ صحافت سے مختصر عرصے کی وابستگی کے باوجود بلوچستان کی صحافتی تاریخ میر گل خان نصیؔر کے تذکرے کے بغیر تشنہ اور نامکمل نظر آئے گی۔

''نوائے بلوچستان'' سے میر گل خان نصیؔر نے اپنی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا جسکے وہ مدیر تھے۔ اس اخبار کے مالک بلوچستان کے نامور صنعت کار میر نبی بخش خان زہری تھے۔ یہ ہفتہ وار اخبار فروری ۱۹۴۹ کو جاری ہوا جسکے ایڈیٹر کمال الدین احمد بھی رہ چکے تھے۔ اس اخبار میں غلام محمد شاہوانی نے بھی میر گل خان نصیؔر کے ساتھ مل کر معاون مدیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ اسطرح غلام محمد شاہوانی کے افکار اور میر گل خان نصیؔر کے نظریات جب باہم گھل مل گئے تو یہ ہفتہ وار اخبار حقیقی معنوں میں عوام کی آواز بن گئی۔

میر گل خان نصیؔر کا اندازِ سیاست اور ان کے نظریات، صحافتی رویئے اور رجحانات نے بہت سارے حلقوں میں اس بات کو موضوع

بحث بنایا کہ میر گل خان نصیر نے کیسے اور کیونکر میر نبی بخش خان زہری کے ساتھ کام کرنا مناسب سمجھا۔ ان دونوں کے اندازِ سیاست اور فکری رویئے ،دونوں کے سیاسی ونظریاتی حلقے ایک دوسرے سے یکسر جدا تھے۔ منزلوں کا تعین بھی الگ الگ تھا۔ پھر یہ میل کیسا؟ اسی بات کی وضاحت میں جناب عبداللہ جان جمالدینی صاحب اپنے ایک مضمون میں میر گل خان نصیر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میر گل خان نصیر سے اکثر پوچھا جاتا میر نبی بخش زہری سرمایہ دار اور وہ (میر گل خان نصیر) سرمایہ داری کے مخالف ، انھوں نے کیونکران کی ملازمت قبول کی تھی؟

تو میر گل خان نصیر اپنا موقف یوں بتاتے :

ہمارا ملک ابھی ابھی نو آبادیاتی نظام سے آزاد ہوا ہے مگر بلوچستان میں سرداری نظام اور جرگہ سسٹم بدستور قائم ہے۔ ہمارا فوری مقصد ان فرسودہ باقیات کے خلاف اور ایف سی آر (فرنٹیر کرائمز ریگولیشن) کے کالے قوانین کو ختم کرنے کے لئے لڑنا ہے۔ سرداروں کا طبقہ روبہ زوال ہے جبکہ نبی بخش زہری جیسا سرمایہ دار ابھی ابھر رہا ہے وہ بھی سرداروں کے خلاف ہے اور سماج میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کی کوشش میں لگا ہے ہمیں

اُس کی ضرورت ہے اور اُسے ہماری لہذا ہمیں اس کے ساتھ محاذ بنانا چاہئے اس لیے میں نے ''نوائے بلوچستان'' کی ادارت قبول کی ہے''۔(13)

میر گل خان نصیر کی وضاحت اپنی جگہ پر لیکن یہ بات سب پر عیاں تھی کہ ان دونوں کا زیادہ وقت کیلئے ساتھ چلنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ اخبار کا ایڈیٹر پالیسی بنانے میں اپنے مخصوص دوستوں کی رائے کو اہمیت دیتا تھا اور وہ صحیح معنوں میں اس ہفتہ وار اخبار کو عوام کی زبان بنانا چاہتا تھا۔ اسی اخبار کے توسط سے ان کے چیدہ چیدہ مسائل کو اجاگر کرنا چاہتا تھا۔ اسی اخبار کے اداریوں اور کالموں میں معاشرے کے بالادست طبقوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتا تھا لیکن دوسری طرف اخبار کا مالک ایک مخصوص طبقے کی نمائندگی میں ان تمام رویوں کو آگے بڑھانے کے حق میں نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح نقش تھی کہ میر گل خان نصیر اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر نہیں چل سکتا اور نہ ہی اسکے مقاصد کی تکمیل میں اس کا ساتھ دے سکتا ہے۔ میر نبی بخش خان زہری اخبار نکال کر جو مقاصد اور فوائد حاصل کرنا چاہتے تھے میر گل خان نصیر اسکے پیمانے پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ نتیجتاً اُسے اپنا ہفتہ وار اخبار ''نوائے بلوچستان'' بند کرنا پڑا۔

میر گل خان نصیر حالات سے سمجھوتہ کرنے اور عوام کے

مسائل سے نظریں چرا کر خاموش بیٹھنے کے عادی نہیں تھے۔ وہ کسی نہ کسی محاذ پر اپنے عوام کے کاز کیلئے اور ان کے دکھ درد بانٹنے کیلئے لڑنا چاہتے تھے۔ صحافتی محاذ کا انتخاب بھی ان کی انہی ترجیحات میں شامل تھا۔

''نوائے بلوچستان'' کے چھن جانے کا حوالہ دیتے ہوئے جناب عبداللہ جان جمالدینی صاحب اپنے ایک مضمون ''میر گل خان نصیر۔ صحافی'' میں رقمطراز ہیں۔

''میر گل خان نصیر نہایت ہی مغموم ہوئے وہ شاعر آدمی تھے۔ خوشی کے موقع پر اڑتے نظر آتے مگر جب غم کا سماں ہوتا تو نڈھال ہو جاتے۔ آخر غلام محمد شاہوانی کے قہقہے کام آئے۔ ان دنوں غلام محمد شاہوانی بلوچستان کے پہلے روزنامہ ''اتحاد'' کے نیوز ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے ''نوائے وطن'' کی اجازت مانگی تھی۔ اتفاق سے ''نوائے بلوچستان'' کے ہاتھ سے چلے جانے کے بعد نوائے وطن کے اجراء کی منظوری مل گئی اور غلام محمد نے وہ اجازت نامہ گل خان نصیر کے حوالے کر دیا۔ گل خان نصیر کی جان میں جان آئی۔ ''نوائے وطن'' نہایت ہی آب وتاب سے بلوچستان کی صحافت کے افق پر نمودار ہوا۔ اب میر گل خان نصیر کو اپنی پالیسی کو بروئے کار لانے میں کوئی تامل نہ تھا۔ انھوں نے بڑے جوش اور ولولے سے نوائے وطن کو نکالنا شروع

کیا۔"(14)

اسطرح میر گل خان نصیر کو ایک مرتبہ پھر اپنے خیالات اور نظریات کو اجاگر کرنے کا پہلے سے بہتر موقع ہاتھ آ گیا۔ میر گل خان نصیر ہمیشہ سے ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے تھے کہ انھیں اپنے خیالات اور تصورات کو آگے بڑھانے کا موقع ملے لہذا اس موقع سے بھی انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

۱۹۵۳ء میں نوائے وطن کا اجرا ہوا۔ عبداللہ جان جمالدینی صاحب ۱۹۵۴ء میں معاون مدیر کی حیثیت سے نوائے وطن کی مجلسِ ادارت میں شامل کر لئے گئے۔

میر گل خان نصیر اور جناب عبداللہ جان جمالدینی کی کاوشوں نے بہت جلدی اثر دکھانا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ "نوائے وطن" کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہر جگہ، ہر محفل میں نوائے وطن کا تذکرہ چل نکلا۔ صحافتی حلقوں میں بھی اسکی اچھی خاصی پذیرائی ہوئی لوگ اس اخبار کے منتظر رہنے لگے۔

ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ گل خان نصیر جس شعبے کا انتخاب کرتے تھے وہ نہایت ایمانداری، خلوص، لگن اور کھرے جذبات کے ساتھ کام کرتے تھے اور اس شعبے کے تکنیکی تقاضوں کا

اچھی طرح خیال رکھتے تھے۔

''لالہ بلوچستان'' کے پیش لفظ میں واجہ عبداللہ جان جمالدینی صاحب کے مطابق ۱۹۵۳ سے جون ۱۹۵۴ تک ایک سال کے عرصے میں نوائے وطن کو میر گل خان نصیر نکالتے رہے اور پھر ۱۹۵۴ میں غلام محمد شاہوانی نے خود اس اخبار کی ادارت سنبھال لی۔(15)

''نوائے وطن ہفت روزہ تھا اور اس شان سے نکالا گیا کہ صحافت کی آبرو قائم ہوگئی۔اس وقت استقلال دم توڑ رہا تھا اور اس کے علاوہ جو اخبارات تھے وہ اپنی حیثیت اور نصب العین سے بالکل ناآشنا تھے۔اس اخبار کے ذریعے لوگوں کی فکر اور ذوق میں بہت زیادہ تبدیلی آئی۔''(16)

اسٹینڈرڈ ہوٹل کا کمرہ نمبر ۲۴ میر گل خان نصیر اور ان کے رفقاء کا صحافتی مرکز تھا۔یہیں سے ''نوائے بلوچستان'' کے بعد نوائے وطن کا اجراء بھی ہوا تھا۔غرض یہ کمرہ مخصوص فکری نقطہء نگاہ کے لوگوں کا محور تھا۔

''کوئٹہ کے مشن روڈ پر اسٹینڈرڈ ہوٹل کے ایک کمرے کے کونے میں میز پر ایک ٹیبل لیمپ اور ریڈیو، چھوٹا سا آئینہ اور شیونگ بکس، سامنے ایک عدد کرسی اور لکھنے کیلئے کچھ سادہ کاغذ۔کمرے کے دوسرے کونے میں ایک چارپائی جس پر بستر بچھے ہیں یہ ابا کا کمرہ ہے۔کہتے ہیں ریڈیو کرائے کا ہے اور میں

نے ریڈیو والے سے کرائے پر لیا ہوا ہے۔ میں اس کا اشتہار اخبار میں چھاپتا ہوں اور اس سے پیسہ نہیں لیتا۔ بابا نے اپنا اخبار نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں ہو سکا۔ نوائے بلوچستان نبی بخش زہری کا ہے۔ بابا کو مہینے کے دو سو روپے ملتے ہیں۔ پھر غلام محمد شاہوانی کا نوائے وطن لیکن بابا کا اپنا اخبار نکالنے کا ارمان دل ہی میں رہا۔'' (17)

اس وقت کسی بھی اخبار کو جملہ مراحل تک پہنچنے کیلئے بہت سے مشکلات کا سامنا تھا۔ یہی مشکلات ''نوائے وطن'' اور اس کے عملے کو بھی درپیش تھے نوائے وطن کے دفتر میں چند ایک کرسیاں، میر گل خان نصیر کا بستر اور ایک لپٹی ہوئی چٹائی ہوتی تھی جو اخبار کے آنے پر بچھا دی جاتی تھی۔ ایک چپراسی بھی مدد کیلئے رکھا گیا تھا۔ عملے کیلئے ایک سائیکل بھی تھی جو کبھی میر گل خان نصیر، کبھی عبداللہ جان جمالدینی اور کبھی دفتر کا چپراسی پریس اور ڈاکخانے میں اخبار لانے اور لے جانے میں اپنے استعمال میں لاتے تھے۔

''نوائے بلوچستان'' کی طرح ''نوائے وطن'' بھی اسلامیہ پریس میں چھپتا تھا۔ مالک حاجی محمد یوسف تھے جو مالی مشکلات کے باوجود اخبار کی اشاعت میں اپنی طرف سے مکمل تعاون کرتے تھے۔

''نوائے وطن'' کو سرکاری اشتہارات نہیں دیے جاتے

تھے۔ اسکے باوجود میر گل خان نصیؔر چندہ یا فیس کی غرض سے کبھی بھی کوئٹہ سے باہر نہیں گئے۔ میر گل خان نصیؔر کے دوست اور خصوصاً میر غوث بخش بزنجو مالی معاونت کیلئے ہمیشہ کمر بستہ تھے۔(18)

تندہی سے کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ غلام محمد شاہوانی اور میر گل خان نصیؔر میں بعض امور اور اخبار کی پالیسی کے حوالے سے اختلافات پیدا ہو گئے جسکے نتیجے میں غلام محمد شاہوانی نے اتحاد کو خیر باد کہہ دیا اور خود نوائے وطن کی ادارت سنبھال لی۔ عبداللہ جان جمالدینی بدستور معاون مدیر کی حیثیت سے نوائے وطن سے وابستہ رہے۔

ماہنامہ اومان کراچی کے ایک شمارے میں میر گل خان نصیؔر اپنے اور لالہ غلام محمد شاہوانی کے مابین اختلافات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''نوائے بلوچستان'' بند ہوا اور ہم پھر کچھ مہینوں کیلئے الگ رہے لیکن بعد میں نوائے وطن کے نام سے مرحوم غلام محمد نے ایک ہفت روزہ اخبار نکالا اور مجھے پھر مرحوم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ بات جلد ہی مجھ پر آشکارہ ہوئی کہ اس دفعہ ہمارے سیاسی اصولوں میں کچھ اختلافات جنم لے چکے ہیں۔ میرا لحاظ رکھتے تھے اس نے نوائے وطن چھوڑ دیا اور روزنامہ

''اتحاد'' کی ادارت میں شامل ہوئے لیکن ہماری پالیسیوں میں جو بنیادی اختلاف پیدا ہو چکا تھا وہ دن بہ دن بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت تک جب مجھے نوائے وطن میر غلام محمد و واجہ عبداللہ جمالدینی کے سپرد کرنا پڑا۔ مرحوم سے یہ میرا پہلا اور آخری اختلاف تھا جو بلوچستان کے اس وقت کے سیاسی حالات کے تناظر میں پیدا ہو چکا تھا۔

میر غلام محمد اور اس کے ہم خیال ساتھی یہ چاہتے تھے کہ نواب گورمانی کی تجویز کے مطابق ریاستِ قلات کو تقسیم کر کے اُسے صوبہ بلوچستان کے ساتھ شامل کیا جانا چاہیے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ خان اور سردار اب نا قابلِ اصلاح ہیں۔ بلوچستان اور بلوچ قوم کا مفاد اسی میں ہے کہ پہلے ان کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔

لیکن ہم اس عمل کو بلوچستان اور بلوچ قوم کیلئے تباہ کن تصور کرتے تھے۔......... ہمارا خیال تھا کہ اس صورت میں بلوچستان کے پشتون ہمیشہ کیلئے یہیں رچ بس جائیں گے، دوسری بات یہ کہ قدیم بلوچستان کی تاریخی سرحدوں اور ۱۸۷۶ کے معاہدے اور دستاویزات سے جو برطانوی حکومت اور خانِ قلات کے مابین طے پائے تھے کے ملنے والے بنیادی حقوق سے محروم رہ جائیں گے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر ہم یہ چاہتے تھے کہ بلوچستان

کے بلوچ علاقوں کو قلات میں شامل کر کے قلات کو بلوچستان کا نام دیا جائے۔ بہر حال اس بنیادی نقطے پر ہمارے اختلافات تھے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اختلافات کے دوران بھی مرحوم میر غلام محمد نے دیانت اور شرافت کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑا جس سے ہمارے دلوں میں انکی عزت اور وقار مزید بڑھ گیا۔" (19)

میر گل خان نصیرؔ کی صحافتی زندگی نے ان کی سوچ کے زاویوں کو وسعت دی۔ صورتحال کو دیکھنے، پرکھنے اور بھانپنے میں انھیں مزید ذہنی پختگی عطا ہوئی۔ ان کے نظریات کی پختگی میں اور نکھار آ گیا۔ ترقی یافتہ، خوشحال اور روشن مستقبل پر ان کا یقین اور پختہ ہو گیا۔ غرض میر گل خان نصیرؔ کی سیاسی زندگی کے رخ اور محور کا تعین کرنے میں بھی ان کی صحافتی زندگی نے اہم کردار ادا کیا۔

"جب ہم چھوٹے تھے ان دنوں صحافت میں تھے۔ پہلے استقلال پھر نوائے بلوچستان اور بعد میں نوائے وطن سے وابستہ رہے۔ اپنا اخبار نکالنے کی اجازت نہیں ملی۔" (20)

میر گل خان نصیرؔ کی صحافت سے وابستگی نے انکی شخصیت کو ابھرنے میں کافی مدد دی۔ اگر وہ اپنا اخبار نکال سکتے تو یقیناً اسے بھی عوام کا

ترجمان بناتے اور کھل کر بہتر انداز میں اپنا مدعا بیان کر سکتے تھے۔ مگر حالات نے انھیں اجازت نہیں دی اور ان کی یہ خواہش دل ہی میں رہی۔

صحافتی رجحانات ونظریات:

میر گل خان نصیر کی صحافتی زندگی اپنے عہد کے لحاظ سے گو کہ اتنی طویل اور وسیع نہیں لیکن اسی مختصر سے دور میں بھی انھوں نے صحافت میں نظریات و رجحانات کے حوالے سے ایک مخصوص طبقہ فکر کی نمائندگی کی اور اپنا تعلق اس گروہ یا طبقے سے جوڑا جو ترقی یافتہ اور روشن خیال ذہن کا مالک تھا جسے اپنے اجتماعی شعور کی سطح کو بڑھانے کا پوری طرح احساس تھا، جو جبر کی ہر شکل کے خلاف تھے۔

میر گل خان نصیر کا ''نوائے بلوچستان'' میں کام کرنا دراصل ایک بڑے دشمن کے خلاف چھوٹے دشمن کے ساتھ اتحاد کرنے کے فارمولے پر عمل کرنے کے مترادف تھا۔ میر نبی بخش خان زہری جن کا اپنا ایک طبقاتی کردار تھا اور صحافت کو بھی اپنے طبقے کے نفع ونقصان کی نظر سے دیکھتے تھے۔ میر گل خان نصیر جنھیں نہ اپنے نفع کی فکر اور نہ نقصان کا احساس کہ جنکا تعلق براہ راست عوام سے تھا جو اپنے نفع ونقصان کو بھی اسی نظر سے

دیکھتے تھے۔ اسطرح دو مختلف نظریات کے نمائندوں نے اپنے اپنے مقاصد کے حصول کیلئے ساتھ چلنے پر وقتی آمادگی ظاہر کی تھی۔ میر نبی بخش خان زہری کو میر گل خان نصیرؔ جیسے باصلاحیت نوجوان کی ضرورت تھی کیونکہ انھیں احساس تھا کہ میر گل خان نصیرؔ کی ادارت میں نکلنے والا ہفت روزہ نہ صرف ان کے کاروبار کے بڑھاوے کا باعث بن سکتا ہے بلکہ بڑے ایوانوں تک اسکی رسائی کا بھی باعث بن سکتا ہے جبکہ میر گل خان نصیر اسی اخبارؔ کے توسط سے اپنے نظریات اور رویوں کو پھیلانا چاہتے تھے۔

نوآبادیاتی نظام سے چھٹکارا پانے کے بعد انھوں نے اپنا ہدف قبائلی اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف استوار کیا ہوا تھا۔ ''نوائے بلوچستان'' کے توسط سے وہ لوگوں کو جاگیرداری اور قبائلی نظام کے خلاف متحد کر کے منظم جدوجہد کیلئے راستہ ہموار کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ اپنے خیالات اور نظریات سے ثابت کر رہے تھے کہ اس فرسودہ نظام میں انکی ترقی کے امکانات معدوم ہیں۔

جاگیرداری اور قبائلی نظام کے رکھوالے چونکہ مملکت اور حکومت کی نمائندگی کر رہے تھے اور انھیں ان اداروں کی مکمل سرپرستی حاصل تھی اس لیے ان کو یہ بات بہت ناگوار گذری اور حکومتی سطح پر ایجنسیوں کے

ذریعے گل خان نصیرؔ کو نوائے بلوچستان سے الگ رکھنے کے منصوبے شروع ہو گئے۔ دوسری طرف میر نبی بخش زہری نے میر گل خان نصیرؔ اور ''نوائے بلوچستان'' سے جو توقعات وابستہ کر رکھے تھے نتائج اسکے برعکس سامنے آ رہے تھے نتیجتاً مالکِ اخبار نے نوائے بلوچستان کو بند کرنے ہی میں عافیت جانی۔

اپنے نظریات کے حوالے سے جن طبقوں کے ساتھ ان کے مخاصمانہ تضادات تھے وہ مستقل مزاجی اور ڈھٹائی کے ساتھ ان کی مخالفت کرتے رہے۔ وہ ہر قدم پر صحافتی تقاضوں کا بھرم رکھنے والے صحافی کے طور پر ابھرے۔ انہوں نے صحافت کو کبھی بھی بلیک میلنگ کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ ہی نام و نمود کیلئے کبھی بھی اس پیشے کو استعمال کیا۔

میر گل خان نصیرؔ کو عوام کی بالادستی پر پختہ یقین تھا۔ عوام کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی حقوق کے حصول کیلئے انھوں نے ڈٹ کر لکھا۔ صحافت میں ہمت، پر عزمی، جرات، بہادری اور بے باکی اُن کا طرۂ امتیاز تھی۔ ان نظریات کے پیش نظر ایک طرف انھوں نے کچلے ہوئے طبقات کو اپنا گرویدہ بنالیا تو دوسری طرف معاشرے کے بالادست طبقوں کی دشمنی بھی مول لی۔ حکومت کی طرف سے بھی مختلف ایجنسیاں میر گل خان نصیرؔ کی نقل و

مل پر کڑی نظرے رکھے ہوئے تھیں۔ انہی دنوں میں اس پر کمیونسٹ ہونے کا بھی الزام لگا۔ (21) پیشیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میر گل خان نصیؔر کو اپنی صفائی پیش کرنی پڑی۔ عوام نے بھرپور انداز میں ساتھ دیا۔

میر گل خان نصیؔر کو اپنے نظریات سے ہٹانے کیلئے معاشرے کے بالادست طبقوں نے طرح طرح کے حربے اور ہتکھنڈے استعال کیے۔ ڈرانے دھمکانے پر جب انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے انعام واکرام وآسائشوں اور آلائشوں کا رستہ بھی میر گل خان نصیر کو دکھایا مگر ان کے کسی بھی قسم کے مکروفریب ولالچ سے میر گل خان نصیؔر پر کوئی اثر نہ پڑا۔ وہ عوام سے اپنے تعلقات اور توقعات کا بھرم رکھنے میں ہمیشہ کامیاب رہے۔

''میر گل خان نصیؔر کا اندازِ فکر واضح تھا۔.......... وہ اپنی تمام توانائی اور قابلیت کو عوام کی خدمت میں لانے کا عزم کیے ہوئے تھے۔.......... اخبار کو اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے.......... میر گل خان نصیؔر کی رائے تھی کہ جو اخبار وہ نکالیں اسے عوام کا ترجمان ہونا چاہیے۔''(22)

میر گل خان نصیؔر نے ہمیشہ اخبار کے اداریوں، کالموں اور اپنے دوسرے مضامین میں عوام کے سیاسی، معاشی، سماجی اور معاشرتی مسائل کو موضوع بحث بنایا۔

۲۴ جون ۱۹۶۶ کے شمارے میں ''نوائے وطن ایک اخبار......ایک تحریک'' کے عنوان سے اخبار کے اداریے میں تحریر ہے۔

''اس ہفت روزہ اخبار نے جہاں ملک کے سیاسی مزاج، اقتصادی ترقی اور معاشرتی نشونما و ارتقاء اور تطہیر کیلئے گراں بہا خدمامت سرانجام دی ہیں۔ وہاں بلوچی اور براہوئی زبانوں اور علاقائی تہذیب اور تمدن کے تعارف نیز نکھارنے اور سنوارنے میں بھی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔''(23)

میر گل خان نصیر اپنے رویے اور نظریات پر ہمیشہ کھل کر بولتے اور لکھتے تھے۔ نظریاتی تعلق داری میں ان کا موقف ہمیشہ واضح ہوتا تھا۔ ان کی صحافت سے متعلق دوست اور احباب بھی واضح فکر رکھنے والے تھے جن میں لالہ غلام جان شاہوانی، میر عبداللہ جان جمالدینی، ملک محمد پناہ، آزات جمالدینی، عبدالکریم شورش، میر عبدالرحمان کرد وغیرہ شامل تھے۔

میر گل خان نصیر اور انکے ساتھی نہ صرف بلوچستان کے صحافتی محاذ پر اپنے مخصوص رویوں اور ایک مکتبِ فکر کی صورت میں سامنے آئے بلکہ بلوچستان کی سیاست اور ادب پر بھی انہوں نے دوررس اثرات مرتب کیے، جنھیں آج تک محسوس کیا جارہا ہے۔

باب چہارم

حواشی

1۔یمی نغمانہ طاہر۔ بلوچستان میں ابلاغ عامہ کی تاریخ ترقی اور نشونما (مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔1988)ص 27۔

2۔ایضاً۔ص104۔

3۔کمال الدین احمد۔صحافت وادی بولان میں۔ص61۔

4۔یمی نغمانہ طاہر۔ بلوچستان میں ابلاغ عامہ کی تاریخ ترقی اور نشونما۔ص 113+114۔

5۔ایضاً۔ص175۔

6۔کمال الدین احمد۔صحافت وادی بولان میں۔68+69۔

7۔ یمی نغمانہ طاہر۔ بلوچستان میں ابلاغ عامہ کی تاریخ ترقی اور نشوونماص176۔

8۔کمال الدین احمد۔صحافت وادی بولان میں۔ص68۔

9۔سلیگ ھیریسن رمسعود بخاری (مترجم) بلوچ قومی تحریک۔ص40۔

10۔کمال الدین احمد۔صحافت وادی بولان میں۔ص۔85۔

11۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست (مرتبین) 1984۔ ص 30
12۔ سیمی نغمانہ طاہر۔ بلوچستان میں ابلاغ عامہ کی تاریخ ترقی اور نشونما۔ ص 175۔
13۔ میر گل خان نصیر فن اور شخصیت (مرتبین) ص 46۔
14۔ ایضاً۔ ص 47۔
15۔ نادر شاہوانی۔ لالہ بلوچستان۔ ص 15+16۔
16۔ سیمی نغمانہ طاہر۔ بلوچستان میں ابلاغ عامہ کی تاریخ ترقی اور نشونما۔
17۔ گوہر ملک۔ یاتانی پاھار۔ تپتان۔ ص 63۔
18۔ میر گل خان نصیر فن اور شخصیت (مرتبین) ص 50+51۔
19۔ میر گل خان نصیر ''یک یاتے''۔ ماہنامہ اومان۔ کراچی۔ مارچ 1959۔
20۔ گوہر ملک ''بابا''۔ ماہنامہ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ دسمبر 1984 ص 16۔
21۔ عبداللہ جان جمالدینی ''۔ میر گل خان۔ صحافی'' گل خان نصیر فن اور شخصیت (مرتبین) 1984۔ ص 53۔
22۔ عبداللہ جان جمالدینی۔ ''میر گل خان نصیر۔ صحافی''۔ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ دسمبر 1984۔ ص 35۔
23۔ نادر شاہوانی۔ لالہ بلوچستان۔ ص 204۔

باب پنجم

مورخ

1۔ بلوچستان میں تاریخ نویسی

2۔ تاریخ سے دلچسپی کی وجوہات۔

3۔ طرزِ تاریخ نویسی

بلوچستان میں تاریخ نویسی:

بلوچستان اور بلوچوں کی تاریخ پر کام کا آغاز سب سے پہلے باہر کے مورخین نے کیا۔ اُن کے مطمع نظر اپنے سیاسی، سماجی اور معاشی مقاصد تھے۔ انھیں یہ دلچسپی نہیں تھی کہ بلوچوں یا بلوچستان کو دنیا میں متعارف کرائیں یا بلوچوں کو اُن کے اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرائیں۔

"ان تحریروں اور کتابوں کا مقصد اس علاقے سے متعلق اس وقت کے غیر ملکی حکمرانوں کو معلومات فراہم کرنے تھیں تاکہ وہ اپنی حکمرانی کو مضبوط کرنے کی پالیسی وضع کرسکیں۔ یہ تمام باتیں ایک قسم کے گائیڈ کی حیثیت رکھتی تھیں کہ کس طرح ان بدقسمت، غریب اور منتشر بلوچ قبائل کی نا اتفاقی، قبائلی رقابتوں اور جھگڑوں اور اخلاقی اقدار سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور کس طرح سرداروں کی غلامی کو خان بلوچ کے خلاف استعمال کرکے اس کے زیادہ سے زیادہ علاقے کو اپنے قبضہ میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ کتابیں جن کو ہم بلوچ قوم کی تاریخ کی بنیاد تصور کرتے ہیں دراصل یہ تاریخی بدعنوانیوں کی کتابیں ہیں اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بلوچ

قبائلی جھگڑوں سے خلاصی حاصل نہیں کر سکتے۔'' (1)

تاریخ بلوچستان کے دیباچے میں میر غوث بخش بزنجو بھی اسی صورتحال کو سامنے رکھ کر تاریخی تسلسل کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''بعض بیرونی مورخین بالخصوص انگریزوں نے چند ایسی کتابیں ضرور چھوڑی ہیں جن سے بلوچستان اور بلوچ قوم سے متعلق بعض واقعات اور حالات پر روشنی پڑتی ہے لیکن ان کتابوں کو ہم بلوچستان کی قومی تاریخ کا درجہ نہیں دے سکتے اُن میں سے بہت بڑی حد تک سیاسی اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا۔ اسکے علاوہ یہ غیر ملکی مصنفین بلوچوں کے خصائل، قبائلی نفسیات اور رسم و رواج سے کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس میدان میں قدم قدم پر خطرناک ٹھوکریں کھائی ہیں۔'' (2)

اب بھی اگر انگریز حکمران کسی بھی خطے میں اپنے مفادات و مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں تو وہ اپنے دانشوروں سے رجوع کرتے ہیں جو حکمرانوں کیلئے مختلف خطوں میں مختلف قسم کی حکمت عملی مرتب کرتے ہیں جن پر حکمران سختی سے عمل درآمد بھی کراتے ہیں۔ یہی صورتحال اُس وقت بھی اُنکے پیش نظر تھی۔

بلوچستان چونکہ اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے اُس وقت

بھی نہایت اہمیت کا حامل خطہ رہا تھا اس لیے اس وقت کے دانشوروں کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ اس علاقے پر تحقیق کریں، یہاں کے باسیوں کے متعلق معلومات جمع کریں، ان کے طور طریقوں، قبائلی نظام، رسم ورواج کا مطالعہ کریں تاکہ ان کی تحقیق کے نتیجے میں حکمران اس خطے کیلئے اپنی حکمرانی کیلئے حکمت عملی وضع کر سکیں۔

''پاک وہند کے انگریز سامراجی حکمرانوں نے ہند میں اپنی سلطنت کے دوام کے سلسلے میں ہر علاقے کی تاریخ پر تحقیقات کر کے کتابیں لکھ ڈالیں۔ بعض جگہ تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کے بیان کیا تاکہ ان کے سامراجی مفادات کو دوام حاصل ہو...... بعض جگہ حقائق سے چشم پوشی کر کے اپنی طرف سے حقائق کو نیا رنگ دیا تاکہ ایک ہی علاقے کے لوگوں میں نفاق پڑ جائے''(3)

بلوچستان کی تاریخ لکھتے وقت ان بیرونی مورخین نے واقعات تو بیان کر دیئے مگر ان واقعات کے پس منظر میں اسباب اور علل سے انھیں کوئی سروکار نہیں رہا کہیں اگر کسی واقع کی وجہ بتانے کی انھیں ضرورت بھی پڑی تب بھی اُن کے مخصوص مقاصد اس واقع کو بیان کرنے میں اُن کے زیرِ نظر ضرور رہے۔ اس طرح تاریخ اپنی افادیت کھو دیتی ہے اور نمائندہ

حیثیت تک نہیں پہنچ پاتی۔

انہی بیرونی مورخین کی تقلید کرتے ہوئے، حالات و واقعات کا گہرائی اور گیرائی سے تجزیہ کیے بغیر ہمارے اپنے بعض مورخین بھی اسی طرح کے غیر منطقی مفروضوں سے اپنے آپکو بچانے میں ناکام رہے۔

''اگر ہمارے تاریخ نویس ایک ٹھوس اور حقیقت پسندانہ راستہ اختیار کرتے تو بلوچوں کی گم گشتہ تاریخ کب کی دھندلکوں سے باہر نکل آئی ہوتی۔اس میں ہمارے ملکی تاریخ نویسوں کا قصور نہیں، قصور تو ان غیر ملکی نیم ملاؤں کا ہے۔جنھوں نے وقتاً فوقتاً بلوچ و بلوچی زبان پر قلم اٹھا کر بے تحاشہ فتوے جاری کیے ہیں اور ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایک ماہر لسانیات یا ماہر تواریخ ہو مثلاً ڈیمز، برائنٹ، یو بلو، موکلر، گلبوٹ سن، مئیر، گریرسن وغیرہ جنکے غیر جامع و مانع تصنیفات دلچسپ و کار آمد صحیح مگر قطعاً مستند نہیں......ان صاحبان کی غیر مستند تصنیفات میں جو انکشافات ہیں ان کو جب تک علم التواریخ کی کسوٹی پر نہ پرکھیں اور نہ جانچیں اُس وقت تک انہیں مستند نہیں سمجھا جاتا۔''(4)

ان بیرونی مورخین نے بلوچوں کو جس انداز میں بھی دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہا کیا لیکن کئی جگہوں میں انھیں بلوچوں کی بہادری، قول کی پابندی اور راست بازی کا اعتراف بھی کرنا پڑا۔

''بلوچستان میں انگریزوں کی آمد کے ابتدائی ادوار سے جب بلوچوں کے ساتھ ان کا واسطہ پڑا اور اس وقت انھوں نے بلوچستان کے اس حصے پر جسے ریاستی اور برطانوی بلوچستان کا نام دے کر اپنا تسلط قائم کیا، کسی بھی انگریز سوانح نگار یا روزنامچہ نویس نے جن میں پوٹنجر، میسن، نیپئیر، جان جیکب اور رابرٹ سنڈیمن خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں بلوچوں کو بد قول مکار اور عہد شکن جیسے مذموم خطابات سے یاد نہیں کیا بلکہ...... انہیں قول وقرار کا پابند، راست باز اور بہادر دشمن کی صفات سے متصف قرار دیا ہے۔ جنرل ڈائر جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ واحد انگریز آفیسر ہیں جنھوں نے بلوچوں کو بدقول کہہ کر اپنی مکاریوں اور چالبازیوں کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (5)

تاریخ سے دلچسپی کی وجوہات:

میر گل خان نصیر شعوری طور پر اس بات سے آگاہ تھے کہ

بلوچ من حیث القوم اپنی قومی تشکیل کے ابتدائی مرحلے سے گزر رہے ہیں۔

انھیں اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ اس مرحلے پر بلوچوں کی قومی تاریخ مرتب کر کے وہ تشکیل کے اس مرحلے کو بہت آگے لے جا سکتے ہیں اسی فلسفے اور خیال کو سامنے رکھ کر میر گل خان نصیرؔ نے تاریخِ بلوچستان ترتیب دی۔

میر گل خان نصیرؔ کی تاریخ میں دلچسپی کا سبب بتاتے ہوئے عبداللہ جان جمالدینی لکھتے ہیں۔

''گل خان نصیرؔ بچپن سے بہت ذہین اور حساس تھے۔انھیں اپنے ماحول اور آس پاس کے حالات نے بہت تیزی سے متاثر کرنا شروع کیا۔ خاص طور پر بزرگوں کی ان داستانوں نے جن میں، خوانینِ قلات کے زوال اور انگریز نو آبادکاروں کی بلوچستان میں پیش قدمی اور خوانینِ قلات کو حکمت عملی سے اپنے زیر تسلط لانے کیلئے منصوبوں کا ذکر تھا، انہیں بہت متاثر کیا۔خان محراب خان کی شہادت کے واقع اور بعدازاں خان خدائیداد خان کی گرفتاری کی داستان نے گل خان نصیرؔ کو بلوچ تاریخ کی طرف متوجہ کیا چنانچہ شاعری کے ساتھ ساتھ اُنھیں بلوچستان کی تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔''(6)

ایک مورخ کے طور پر ابھرنے میں انھیں ملازمت اور قدیم اشعار اکھٹا کرنے کی مہم نے بھی کافی مدد دی۔(7)

پروفیسر بہادر خان رودینی میر گل خان نصیرؔ کی تاریخ نویسی کے پس منظر میں بلوچ قوم کی ایکا اور اتحاد کے جذبے کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میر گل خان نصیرؔ کی تاریخ نویسی کے پس منظر میں بلوچ قوم کا ایکا اور اتحاد کا عنصر کارفرما تھا۔ میر گل خان نصیرؔ جنگی تمام زندگی اسی جدوجہد میں گزری کہ بلوچ قوم متحد ہو اور بلوچ قومیت مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہو سکے۔''(8)

ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میر صاحب سچے محب وطن تھے اپنی قوم اور وطن کے ساتھ محبت کے اسی جذبے نے ان کو بلوچ قوم کی تاریخ لکھنے کی ترغیب دی۔

ان کے قوم پرستانہ جذبات نے انھیں مورخ بننے کی طرف راغب کر دیا۔ ان کے جذبہ حب الوطنی نے انھیں اس مشقت طلب کام کیلئے آمادہ کیا۔(9)

وہ انگریزوں کی مرتب کی ہوئی مسخ شدہ تاریخ بلوچستان

کے مقابلے میں ایک جامع، صحیح اور مبنی بر حقائق تاریخ لکھنا چاہتے تھے۔

میر گل خان نصیر نے اپنی بساط کے مطابق پوری پوری کوشش کی ہے کہ منتشر اور بکھرے ہوئے بلوچ قبائل کو ایک بڑی اور قابل عمل بلوچ قومیت میں بدل دیں۔ انھوں نے یہ کوشش کی کہ ان کی یہ خواہش تاریخ بلوچستان سے شاید حاصل ہو۔ تاریخ بلوچستان ان کی انہی مخلصانہ اور دیانت دارانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔(10)

اب ہم تاریخ بلوچستان کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ جس کے دیباچہ میں میر گل خان نصیر خود اس تاریخ کو مرتب کرنے کی کیا وجوہات بیان کرتے ہیں۔

"............ میں اپنے عزیز ابنائے وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ اس عظیم کام کی بنیاد ڈال کر سالہا سال کی کد و کاوش کے بعد اُسے دو حصوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میرا بنیادی نظریہ یہ رہا ہے کہ بلوچوں کو ان کے آباو اجداد کے سرفروشانہ کارناموں سے روشناس کر کے قومی اتحاد و اخوت اور سرفروشی کی ایسی فضاء تیار کی جائے جس میں پرورش پا کر ہمارے نوجوان اپنی قوم اور وطن کی آزادی و سربلندی کیلئے ایک مرکز پر جمع ہو کر کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں"(11)

محرک کچھ بھی ہوں لیکن بقول رینائر فرد کو اپنے ماضی

سے دلچسپی ہوتی ہے۔ گزرے ہوئے

لمحات اُس کے لیے خوشی و مسرت یا رنج واندوہ کی متحرک

تصویریں ہوتیں ہیں۔ اس کا ایک ایک نقش اسکے ذہن پر ثبت ہوتا ہے۔

جب وہ اپنے ماضی سے نکل کر اپنی قوم اور معاشرہ کے ماضی میں آتا ہے تو

اس وقت بھی اسکی دلچسپی برقرار رہتی ہے کیونکہ اس وسیع و عریض اور گنجلک

ماضی میں اس کا ماضی بھی شامل ہوتا ہے۔ معاشرے کی اقدار، روایات اور

رادے اسکی ذات کی وسعت ہوتے ہیں اور ان ہی کے ذریعے وہ ماضی کے

خزانوں سے متعارف ہوتا ہے اسی لیے کسی نے کہا ہے کہ۔

''تمام ماضی میرا ماضی ہے اور میں تسکین کی خاطر اسے

دیکھنا چاہتا ہوں'' (12)

میر گل خان نصیر کی ماضی سے محبت یا لگاؤ محض ماضی کی

خاطر نہیں تھی بلکہ حال کیلئے بھی تھی۔ ماضی کے خزانوں سے انھیں جو کچھ بھی

حاصل ہوا اُن کی مدد سے وہ مستقبل کو بہتر، محفوظ، مضبوط اور پائیدار بنانا

چاہتے تھے۔ یہ ایک اہم قومی ذمہ داری تھی جو انھوں نے پوری کی اور آنے

والے مورخین کیلئے تحقیقات کے دروازے کھول دیئے۔

تاریخ نویسی کو میر گل خان نصیؔر نے جس سانچے میں دیکھا اور پرکھا اس سے پہلے کے محققین و مورخین نے تاریخ کو اس انداز میں نہ کبھی دیکھا نہ ابھی تک کسی نے تاریخ کے اتنے پہلوؤں پر طبع آزمائی کرنے کی کوشش کی۔

''تاریخِ بلوچستان'' میں جب میر گل خان نصیؔر کو چند اہم قومی مزاج کے تاریخی موضوعات کی کمی محسوس ہوئی تو انھوں نے ''بلوچستان قدیم اوز جدید تاریخ کی روشنی میں'' لکھ ڈالی۔ تاریخ کے حوالے سے یہ دونوں کتابیں انتہائی اہم ہیں اور یقیناً ان میں جتنا مواد موجود ہے کسی دوسری تاریخ کی کتاب میں قارئین کو اتنا مواد ملنا انتہائی مشکل ہے۔ اسکے علاوہ ان تصانیف میں واقعات اور حالات کے ایسے گوشوں پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے، جنھیں اب تک بیشتر مورخین و محققین سامنے لانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد کے مورخین نے بھی میر گل خان نصیؔر کی لکھی ہوئی تاریخ سے واقعات اور نتائج مستعار لیے ان کی تقلید کی اور ان سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا۔

''اس وقت بلوچستان کی یہ تاریخ مستند سمجھی جاتی ہے۔......اس تاریخ کے لکھنے کے بعد آج تک ان تاریخی واقعات کو میر گل خان نصیر مرحوم نے اپنی تاریخ بلوچستان میں بیان کیے ہیں ابھی تک دیگر مورخین انھیں رد نہیں کر سکے بلکہ بعد کے بعض مورخین نے انھی حوالوں سے بلوچستان کی تاریخ لکھی ہے۔'' (13)

ان دونوں تواریخ کے علاوہ میر گل خان نصیر نے اُن تاریخی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا جن میں بلوچوں یا بلوچستان سے متعلق مواد موجود ہے ان تاریخی کتب میں انھیں اُن فرسودہ روایات غیر منطقی نظریات، غیر فطری حالات اور واقعات کی تردید کرنی تھی جو خواہ مخواہ بلوچوں یا بلوچستان سے متعلق منسوب کر دیئے گئے تھے۔

''کوچ و بلوچ'' دراصل لانگ ورتھ ڈیمز (Longworth Dames) کی کتاب بلوچ نسل (The Baloch Race) سے ماخذ ہے۔ جسے حواشیوں اور فٹ نوٹ کے ساتھ لکھ کر میر گل خان نصیر نے ترجمہ کیا۔

اس کتاب میں موجود کچھ واقعات و نظریات ایسے تھے جنھیں میر گل خان نصیر جیسے مورخ ذہنی طور پر قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھے

اور جن سے بعض بنیادی غلط فہمیاں بھی پیدا ہونے کے امکانات تھے۔ میر گل خان نصیر نے ان کا ازالہ ضروری جانا۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ کتاب کا رد کیوں نہیں لکھا؟

''اس کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں ایک یہ کہ ڈیمز صاحب کی کتاب بلوچ نسل کا رد لکھا جاتا اور اُسے جداگانہ حیثیت سے شائع کیا جاتا۔ لیکن اس میں جو خامی رہتی وہ یہ کہ عام قاری کیلئے ڈیمز صاحب کی اصل کتاب سے جو اب تقریباً ناپید ہو چکی ہے، اسکا موازانہ کرنا مشکل ہوتا۔ دوسری صورت یہی تھی جو ہم نے مناسب سمجھ کر اختیار کی، یعنی اصل کتاب پر وضاحتی نوٹ لکھ کر اور کوچ و بلوچ سے متعلق بنیادی مسائل پر جداگانہ تفصیلی بحث کر کے، تاکہ قاری کو مطالعے و موازنے میں آسانی ہو۔'' (14)

ترجمے کے حوالے سے ایک اور اہم کتاب ''تاریخِ خوانینِ قلات'' یا ''تاریخ احمد زئی خوانینِ قلات'' ہے۔ جو ''اخبار الابرار'' کا اردو ترجمہ ہے۔

یہ ترجمہ آخوند محمد صدیق کے قلمی نسخے اور مرزا احمد علی کے تاریخچے پر مشتمل ہے۔ یہ مواد میر گل خان نصیر نے کیسے اور کہاں سے حاصل کیئے اس کا تذکرہ وہ کتاب کے دیباچہ میں کرتے ہیں۔

''اخوند محمد صدیق کی تاریخ الابرار کا جو ترجمہ قارئین کے مطالعے کیلئے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ اسی فارسی مسودے پر مشتمل ہے۔ جسے جناب نیٹو ہتورام نے اپنی تالیف ''تاریخ بلوچستان'' میں من و عن فارسی میں درج کیا ہے۔ البتہ اس مسودے کے دو تین ابتدائی صفحات مفقود تھے۔ اس لحاظ سے ''اخبار الابرار'' کا اردو ترجمہ نامکمل رہ جاتا اگر آغا میر نصیر خان احمد زئی اس ضمن میں ہماری مدد نہ کرتے۔ ان کے پاس اصل مسودے کی ایک نقل موجود تھی۔ جو انہوں نے قاضی محمد جلال الدین سابق وزیر اعظم ریاستِ قلات کے کتب خانے سے حاصل کی ہے۔ ان کی عنایت سے ہم اس قابل ہو سکے کہ مکمل ''اخبار الابرار'' کا اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کر سکیں۔''(15)

جہاں تک مرزا احمد علی صاحب کے مسودے کا تعلق ہے اس کا ترجمہ بھی میر گل خان نصیر نے ہتورام کی تاریخ بلوچستان سے کیا ہے جو فارسی مسودے کی صورت میں اس کتاب (تاریخِ بلوچستان) میں موجود ہے۔ اس مسودے کے اچانک اختتام کو سامنے رکھ کر میر گل خان نصیر اس خدشے کا اظہار کرتے ہیں کہ شاید یہ مسودہ بھی آخری چند صفحات کے رہ جانے کی صورت میں نامکمل رہا ہو ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ مرزا احمد علی، خان میر خدائیداد

خان کے تختِ قلات سے معزولی اور میر محمود خان دوم کی تختِ نشینی کا ذکر نہ کرتے۔(16)

اس کتاب میں خوانینِ قلات کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے مگر میر محراب خان اور میر خدائیداد خان کے ادوار کو اور ان عہد کے واقعات اور حالات کو زیادہ تفصیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

خان میر محراب خان دوم ۱۸۱۷ء میں خان منتخب ہوئے اور ۱۳ نومبر ۱۸۹۳ء کو اپنے پایہ تخت قلات میں انگریزوں کی حملہ آور فوج کے خلاف لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

خان میر خدائیداد خان ۱۸۷۵ء میں قلات کے تخت پر مسند نشین ہوئے اور ۱۸۹۳ء میں انگریزوں نے انھیں گرفتار کرلیا۔ پہلے انھیں لورالائی میں نظر بند رکھا اور بعد میں پشین منتقل کر دیا۔ وہیں ۱۹۰۲ء میں خان میر خدائیداد خان وفات پا گئے۔(17)

آخوند محمد صدیق اور مرزا احمد علی تاریخی طور پر مشکوک کردار کے حامل رہے۔ جن ادوار کے حالات اور واقعات کو انہوں نے قلمبند کیا ان ادوار کے واقعات میں وہ خود ملوث و معتوب رہے ہیں۔ ان ادوار کو تفصیلی بیان کرنے کا ان کا مقصد و مدعا صرف اپنی صفائی اور بریت

پیش کرنا رہا ہے۔ ان کا ہر گز یہ مطلب و مدعا نہیں رہا کہ وہ میر محراب خان اور میر خدائیداد خان کے مظالم و ستمرانیوں کے واقعات کا غیر جانبدارانہ انداز میں تجزیہ و تحلیل کریں۔(18)

اس کتاب کو بھی ترجمہ کرتے وقت مترجم نے بعض اختلافی امور پر حاشیہ آرائی کی ہے جس سے کتاب کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

متذکرہ بالا تواریخ میں جہاں جہاں تاریخی اسناد کے خلاف واقعات بیان ہوئے ہیں۔ یا بعض اشخاص و مقامات کے سوں یا واقعات کی وضاحت ضروری محسوس کی گئی ہے ان سے متعلق مترجم نے تصیحی اور توضیحی نوٹ لکھے ہیں۔ نوٹ لکھتے وقت مترجم نے زیادہ تر حوالے اپنی تالیف تاریخ بلوچستان (جلد اول ودوئم) سے اخذ کیے ہیں۔

بریگیڈیئر جنرل آر،ای، ایچ ڈائر کی کتاب "Raiders of the sarhad" کا ترجمہ بھی میر گل خان نصیر نے ''بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار'' کے نام سے کیا ہے۔

یہ کتاب ۱۹۱۶ء کے ان حالات و واقعات پر مبنی ہے جو ان علاقوں میں اُس وقت پیش آئے۔ جنھیں جنگِ عظیم اول کے تناظر میں دیکھا

جا سکتا ہے یہ کتاب اُس مہم کی روئیداد ہے جسے جنرل ڈائر سر کرنے آئے تھے جو شمال مغربی سرحد کے بلوچوں کے خلاف روبہ عمل آئی تھی۔ یہ کون سے علاقے تھے؟ میر گل خان نصیر لکھتے ہیں۔

''بلوچستان، جیسا کہ ظاہر ہے اس وقت پاکستان، ایران اور افغانستان کی مملکتوں میں بٹا ہوا ہے۔ لیکن جن دنوں حکومتِ ہند کے احکام کی تعمیل میں جنرل ڈائر نے اپنی یہ مہم شروع کی، ان دنوں سرحدوں کا باضابطہ تعین نہیں ہوا تھا۔ ایران اور افغانستان کی جنوب مشرقی اور جنوب مغربی سرحدوں پر کلیتاً بلوچ قبائل اپنے اپنے سرداروں کے زیرِ اقتدار اور اپنے قبائلی رسم ورواج کے مطابق تقریباً ایک آزاد زندگی بسر کرتے تھے اور یہ علاقے بلوچستان میں شامل تھے۔

ایران کے جنوب مشرق میں سیستان کے ایرانی علاقے سے متصل اور افغانستان کے جنوب مغرب میں گرم سیل اور کوہ مَلِک سیاہ تک اور اس وقت کے ہندوستانی بلوچستان کی شمال مغربی سمت میں پھیلا ہوا، بلوچ قبائل کا جو علاقہ پڑتا تھا اُسے عرفِ عام میں ''سرحد'' کہا جاتا تھا۔''(19)

حکومت ہند کو اس وقت جس چیز نے زیادہ پریشان کیے رکھا وہ ان قبائل کا جرمن ایجنٹوں کے ساتھ روابط تھے۔ شہسوار سے منسوب خطوط کے

علاوہ نہ اُس وقت جنرل ڈائر کو اور نہ بعد میں کسی دوسرے انگریز آفیسر کو ایسی کوئی ٹھوس شہادت ان بلوچ قبائل کا جرمن ایجنٹوں کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں ملی جن کو بنیاد بنا کر ان پر الزام عائد کیے گئے تھے۔(20)

جرنل ڈائر کی اس مہم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ایک مقامی ایجنٹ عیدو خان ریکی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ''ایک جائزہ'' کے نام پر میر گل خان نصیر رقمطراز ہیں۔

''عیدو کے کردار سے اس حقیقت کو مزید تقویت ملتی ہے کہ کسی ملک یا علاقے کا ایک چالاک مقامی غدار، اپنے ہم وطنوں کو کیسی کیسی مصیبتوں میں مبتلا کر سکتا ہے۔ ان کی خودداری، شجاعت، ایثار، قربانی اور سرفروشی کے جذبات کو کسی طرح اپنی چالبازیوں اور مکاریوں سے خوف، بزدلی، تذلیل اور ندامت میں بدل دیتا ہے اور اُن کی آزادی کا گلہ گھونٹ کر غلامی کا طوق ان کے گلوں میں ڈالنے کا باعث بنتا ہے۔''(21)

مذکورہ بالا تینوں کتابوں کو میر گل خان نصیر نے براہِ راست ترجمے کیے۔ کوچ و بلوچ اور بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار انگریزی سے جبکہ تاریخ خوانینِ قلات فارسی سے اردو زبان میں منتقل کر دیئے۔ ان تینوں کتابوں میں ترجمے کی زبان انتہائی سلیس اور عام فہم ہے۔ اس سے اندازہ

لگتا مشکل نہیں کہ میر گل خان نصیر کو انگریزی، اردو اور فارسی زبان پر بھی کمال دسترس حاصل تھا۔ ترجمہ سے یہ تینوں زبانیں میر گل خان نصیر کیلئے بالکل اجنبی معلوم نہیں ہوتیں۔

طرزِ تاریخ نویسی:

ابنِ خلدون (۱۳۳۲-۱۴۰۶) کے مطابق دو اہم وجوہات ہیں جن کی وجہ سے تاریخ میں مبالغہ آمیزی اور جھوٹی روایات داخل ہوتی ہیں پہلی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ جب مورخ ہر واقعات اور صورتحال کو مذہب کے دائرے اور حدود میں رہ کر دیکھے کیونکہ مذہب کی مکمل گرفت میں رہ کر ذہن کا اعتدال جواب دے جاتا ہے اور انسانی ذہن کا اعتدال جب ختم ہو جائے تو کسی بھی بات کو پرکھنے، جانچنے، اُسکے جھوٹے اور سچے ہونے کیلئے تحقیق و تصدیق کا معیار ختم ہو جاتا ہے۔ ذہن پر مذہبی غلبہ کی وجہ سے وہ ہر اُس خبر اور واقعے کو فوراً صحیح تسلیم کر لیتا ہے جو اُس کے مذہب و عقائد کے مطابق ہوتی ہے۔

دوسری وجہ کہ جس سے غلط روایات اور مبالغہ آمیزی کا عنصر تاریخ میں شامل ہوتا ہے بادشاہوں، صلاطین اور اُمراء کی بے جا خوشامد

اور تعریف ہے۔ انہی لوگوں کو خوش کرنے کیلئے مورخ جھوٹی خبروں کو بھی کبھی کبھار تاریخ کا حصہ بناتی ہیں۔(22)

میر گل خان نصیر تاریخ نویسی میں ان دونوں صورتحال سے بالاتر نظر آتے ہیں۔ انھیں اپنے مذہب سے بے شک ایک تعلق تھا لیکن وہ اس تعلق کو اعتدال میں رکھتے تھے اور اسی طرح ان کے دل میں اپنے خوانین کیلئے احترام کا جذبہ بھی موجزن تھا لیکن وہ اس جذبے کو بھی متوازن رکھتے تھے بلکہ کئی جگہ وہ خوانین کی غلط پالیسیوں پر تنقید بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ تاریخ بلوچستان کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''تاریخ نویسی کی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اس میں کوئی شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت خان معظم کی قابلِ احترام ذات گرامی کو بعض مقامات پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے جس کے لئے میں اعلیٰ حضرت سے معذرت کا طالب ہوں اور انھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس تنقید سے ان کی قابلِ احترام ذات پر انگشت نمائی کرنا مقصود نہیں بلکہ قوم کے سامنے صحیح حالات رکھ کر اسے قومی بقاء کی جدوجہد میں واضح راہِ عمل کے تعین میں مدد دینا ہے جو یقیناً خان معظم کے جزبہ قوم پرستی کے خلاف نہیں''۔(23)

ہیگل (۱۷۷۰-۱۸۳۱) جسکی تصانیف نے انیسویں صدی

کے فلسفہ، سیاست اور عمرانی علوم کو بہت متاثر کیا اپنی عمر کے آخری حصے میں اس نے ''فلسفہ تاریخ'' پر بہت اہمیت کے حامل لیکچر بھی دیئے۔ اُس کے فلسفہ تاریخ کے مطابق واقعات کا انبار، اُن کی تراش خراش، کانٹ چھانٹ اور ترتیب، معلومات کا ایک ذریعہ تو ہو سکتے ہیں لیکن محض واقعات کوئی تاثر اور کوئی شعور واحساس پیدا نہیں کرتے۔ اس لیے شعور واحساس پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ واقعات کے پس منظر میں جو اسباب، وجوہات اور حالات ہوتے ہیں اُن کا جائزہ لیا جائے، ان پر تنقید ورائے زنی کی جائے، ان کی اصل روح کو سمجھا جائے اور پھر واقعات کے سلسلہ اور ترتیب کو دیکھا جائے تو اسی صورت میں تاریخ افادیت کی حامل ہوسکتی ہے۔ (24)

اس نظریئے اور فلسفے کو بنیاد بنا کر اگر میر گل خان نصیر کی ''تاریخ بلوچستان'' کو دیکھا اور پرکھا جائے تو یقیناً ایک طرف اگر وہ واقعات کی بھرمار سے معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے نظر آئیں گے تو دوسری طرف وہ ان واقعات کے عوامل اور اسباب کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ واقعات کے ترتیب اور تسلسل کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ میر محراب خان دوئم (شہید) کی ناکامیوں کو وہ صرف واقعاتی حوالوں سے نہیں دیکھتے بلکہ وہ عوامل بھی بتاتے ہیں جن سے لوگ میر محراب خان سے متنفر ہو گئے اور انھوں

نے میر احمد یار خان کا ساتھ دیا۔

''میر محراب خان طبعاً ایک بہادر اور غضبناک شخص تھا۔ درشتی اور تندی اس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میر محراب خان ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح رعب داب اور تشدد سے حکومت کرنا چاہتا تھا۔ بادل کی طرح گرج کر شبنم کی طرح برستا تھا۔ اس سے اس کے مخالفین کے حوصلے اور زیادہ بلند ہو جاتے تھے۔ میر محراب خان کو عقل و تدبر سے حکومت کرنے کا سلیقہ نہ تھا یہی وجہ تھی کہ اسی سال کچھی میں جہاں اس نے میر محمود خان کی وفات کے بعد صرف چند مہینے گزارے لوگ اسکی سخت گیری سے تنگ آ گئے۔ کچھی کے لوگوں کو اب تک میر مصطفےٰ خان کی حکومت بھولی نہیں تھی۔ وہ پھر اسی طرح امن و چین کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے جو میر مصطفےٰ خان کے عہد میں اُنھیں نصیب ہوئی تھی۔ میر محراب خان کی روش کو اپنی توقعات کے خلاف پا کر انھوں نے میر احمد یار خان کی طرف دیکھا۔ میر احمد یار خان نے ان کا ساتھ دیا اور اسطرح اوائل میں ہی میر محراب خان کی سخت گیریوں نے کچھی کے لوگوں کا رخ میر احمد یار خان کی طرف پھیر دیا۔'' (25)

صورتحال کو اسطرح پیش کرنے سے حالات اور واقعات کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے اور ساتھ ساتھ رائے قائم کرنے اور نتیجہ نکالنے میں بھی قاری کو آسانی رہتی ہے۔ واقعات کا اس طرح بیان کرنا اس واقع

کے داخلی پہلو سے بھی پردہ اٹھاتا ہے اور ساتھ ساتھ اس فکر کا بھی پتہ لگ جاتا ہے جو ان واقعات کی تہہ میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ بے شک یہ کام مورخ کیلئے انتہائی تکلیف دہ اور دشوار ہے لیکن انھیں اس کا احساس تھا کہ کسی واقع کو سمجھنے اور سمجھانے کیلئے مورخ کیلئے یہ ضروری ہے وہ اپنے آپ کو اُسی صورتحال میں ڈھال لے اور اپنی شخصیت کو اس شخصیت میں ضم کردے جسکا وہ بیان کر رہا ہو۔

فلسفہ تاریخ بیان کرتے ہوئے ہک ہارڈٹ (۱۸۹۷-۱۸۱۸) مورخوں کیلئے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ وہ تاریخ میں روپوش اور گمنام آرٹ، ادب اور شاعری کو تلاش کریں کیونکہ تاریخ ایک سلسلہ ہے اور انسانی تاریخ کے ذہنی سلسلے میں جگہ جگہ خلا ہیں، انھیں بھرنا مورخ کا کام ہے کیونکہ یہ تسلسل انسانی ذہن کو ترقی کی جانب رواں دواں رکھتا ہے۔ اس لیے کھوئی ہوئی چیزوں اور نوادرات کی تلاش، ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنا، انسان کی شدید خواہش ہے۔(26)

شعوری یا لاشعوری طور پر میر گل خان نصیر تاریخ کے اس خلا کو سمجھتے تھے اسی لیے انھوں نے داستانِ دوستین وشیرین (۱۹۶۴)، جمل جیہند (۱۹۶۹) بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی (۱۹۷۶)، بلوچی رزمیہ

شاعری (مئی ۱۹۷۹)، بلوچی عشقیہ شاعری (اکتوبر ۱۹۷۹) مشہد ناجنگ نامہ (۱۹۸۱) اور ھپت ھیکل (1990) لکھ کر ذہنی سلسلہ کے اس خلا کو بھی بھر دیا۔

میر گل خان نصیرؔ کی تاریخ پر کچھ حلقوں کو یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے اپنی تاریخ بلوچستان میں ریاستِ قلات اور خوانین قلات کو ضرورت سے زیادہ جگہ دی ہے۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے میر غوث بخش بزنجو "تاریخِ بلوچستان" کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ میر گل خان نصیرؔ کی زیرِ نظر تصنیف بظاہر تاریخِ بلوچستان کے بجائے تاریخِ قلات معلوم ہوتی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو قلات ہی بلوچستان کا دوسرا نام ہے۔ بلوچستان کی تاریخ میں قلات اور خوانینِ قلات کو جو مرکزیت حاصل رہی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا قلات کی تاریخ ہی درحقیقت بلوچستان کی تاریخ ہے۔ اس سے جہاں خوانینِ قلات کے دورِ حکومت پر بالتفصیل روشنی پڑی ہے، وہاں بلوچستان کے دوسرے گوشے بھی نظر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس لیے زیرِ نظر تاریخ میں ان تمام بلوچ خطوں سے متعلق بھی معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے جو اس وقت قلات یا بلوچستان سے باہر ہیں۔" (27)

اعتراض کی اس کیفیت کو اگر ''فلسفہ تاریخ'' کی روشنی میں دیکھا جائے تو یقیناً اس کا جواب بھی ہمیں دستیاب ہوگا۔ ہیگل کے نزدیک ریاست وہ شے ہے جس میں فرد پوری طرح آزادی سے فیض یاب ہوتا ہے۔

...... تاریخ میں ریاست کا وجود انسانی مقصد کی انتہائی تکمیل ہے۔ انسان جن خصوصیات کا مالک ہے وہ سب اسے ریاست کی بدولت ملتی ہیں۔ ریاست ایک الہیاتی دستور ہے جو اس سرزمین میں عملی شکل میں موجود ہے۔ اس لیے ریاست میں تاریخ کے مقصد کو پایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں آزادی اپنا مقصد پورا کرتی ہے۔ (28)

میری نظر میں میر گل خان نصیرؔ کی تاریخ میں جو سقم باقی رہ گئے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ تاریخِ بلوچستان (جلد اول و دوئم) میں وہ بلوچوں کی تاریخ کو تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں ان حالات اور واقعات سے منسلک و مربوط نہیں کرتے جنھیں وہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ اس تناظر پر بھی روشنی ڈالتے تو یقیناً یہ تاریخ کئی حوالوں سے ایک مکمل تاریخ بنتی ۔ اس بات کا احساس شاید میر گل خان نصیرؔ کو رہا ہو اس لیے ''بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں'' رقم کر کے انھوں نے شاید اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ ان دونوں تالیفات کو سامنے رکھ کر بلوچ معاشرے کی

طرزِ زندگی اور اُن کے فکر و احساس کا بہتر انداز میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور ان کے حال اور مستقبل کے امکانات کا مطالعہ و مشاہدہ کر کے بہتر نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

ایک اور موضوع جو اپنی اہمیت کے پیشِ نظر تواریخ میں اکثر جگہ پاتا ہے وہ آثارِ قدیمہ کے نقطۂ نگاہ سے تاریخ کی جانچ پرکھ ہے۔ میر گل خان نصیر کی ''تاریخِ بلوچستان'' اور ''بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں''، میں بھی اس کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جاتا ہے۔ البتہ ''بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی'' میں براہوئی یا بروھوئی کے عنوان سے براہوئیوں کو آثارِ قدیمہ کے جدید تحقیقات کی روشنی میں دیکھنے کی ایک مختصر سی کوشش کی گئی ہے۔ (29)

کولنگ وڈ (؟-۱۸۸۹) دو چیزوں کو تاریخ کی بنیاد قرار دیتے ہیں ایک یادداشت اور دوسرا اتھارٹی۔

''بعض اوقات تاریخ کا انحصار نہ تو اتھارٹی پر ہوتا ہے اور نہ ان یاد داشت پر، کیونکہ مورخ تک تاریخ اس صورت میں پہنچتی ہے کہ نہ تو کوئی بیان ہوتا ہے اور نہ شہادت و روایت اب مورخ کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آیا یہ واقعات ہوئے بھی تھے یا نہیں۔ یہ فیصلہ وہ اس تحقیق کے بعد کرتا ہے، جس

میں آثارِ قدیمہ کے نشانات اور نوادرات تشکیل دیتا ہے اور واقعات کو جوڑ کر ان سے تاریخ بناتا ہے۔(30)

البتہ ملک محمد سعید بلوچ نے تاریخ کو آثارِ قدیمہ کے تناظر میں دیکھ کر "بلوچستان ماقبل تاریخ" رقم کر کے اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی ہے۔(31)

تاریخ کیلئے تخیل بھی ضروری ہے۔ اسی تخیل سے تاریخ میں جگہ جگہ شگاف یا خلا کو بھرنے کا کام سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ اس سے تاریخ کی رکاوٹیں دور ہوتی ہیں اور وہ واضح اور صاف شکل میں وجود میں آسکتی ہے

تاریخ میں کس قسم کے خلا ہوتے ہیں؟ اس بات کی وضاحت کولنگ وڈ مثال دے کر کرتے ہیں کہ اگر تاریخ میں یہ لکھا ہے کہ سیزر ایک دن روم میں تھا اور چند دن بعد گال (Gaul) میں، تو مورخ کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ آخر ان بقیہ دنوں میں وہ کہاں تھا؟ جو روم اور گال کے درمیان آتے ہیں۔ اب مورخ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے تخیل کی مدد سے اس خلا کو پر کرے کہ ان دنوں سیزر نے کیا کیا؟ وہ کن کن مقامات سے گزرا؟ ان سوالات کے جواب سے وہ اس خلا کو بھر سکے گا جو تاریخ میں

موجود ہے۔(32)

میر گل خان نصیر کی تاریخ میں جو خلا یا شگاف نظر آتے ہیں۔ان سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ میر گل خان نصیر نے تخیل سے کام نہیں لیا ہے۔شاید اسطرح انھیں ضرورت سے زیادہ مبالغہ آرائی کا اندیشہ رہا ہو۔

باب پنجم

حواشی

1۔ پروفیسر بہادر خان رودینی ''میر گل خان نصیر۔ مورخ''۔ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ دسمبر 1984۔ ص 33

2۔ غوث بخش بزنجو (دیباچہ نگار) تاریخ بلوچستان (اول و دوئم) 1986 (طبع سوئم)۔

3۔ آغا میر نصیر خان احمد زئی بلوچ ''میر گل خان نصیر بحیثیت مورخ''۔ بلوچی دنیا۔ دسمبر 1984۔ ص 20۔

4۔ اے کے بلوچ۔ ''کیا بلوچ نسلاً سامی ہیں؟''۔ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ اگست 1970۔ ص 23۔

5۔ جنرل ڈائر/ میر گل خان نصیر (مترجم) بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار۔ 1990 (طبع دوئم) ص 19+20

6۔ عبداللہ جان جمالدینی ''میر گل خان نصیر کی شاعری''۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔ 1993۔ ص 43۔

7۔ آغا میر نصیر خان احمد زئی بلوچ ''میر گل خان نصیر بحیثیت

مورخ''۔ بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر 1984۔ص19۔
8۔پروفیسر بہادر خان رودینی''میر گل خان نصیر۔مورخ''۔بلوچی دنیا۔
ملتان۔دسمبر 1984۔ص32۔
9۔آغا نصیر خان احمدزئی بلوچ۔''میر گل خان نصیر بحیثیت مورخ''۔بلوچی
دنیا۔ملتان دسمبر 1984۔ص22۔
10۔پروفیسر بہادر خان رودینی''میر گل خان نصیر۔مورخ''۔بلوچی دنیا۔
ملتان۔دسمبر 1984۔ص35۔
11۔گل خان نصیر۔تاریخ بلوچستان (اول و دوئم) 1986۔(طبع سوئم) ص ع۔
12۔ڈاکٹر مبارک علی۔تاریخ کے نظریات۔ص142۔
13۔آغا نصیر خان احمدزئی بلوچ''۔میر گل خان نصیر بحیثیت مورخ''۔
بلوچی دنیا۔ملتان۔دسمبر 1984۔ص22۔
14۔گل خان نصیر (مترجم) کوچ و بلوچ۔لانگ ورتھ ڈیمز 1969۔ص ب
15۔میر گل خان نصیر (مترجم) تاریخ خوانین قلات۔1982۔ص15
16۔ایضاً۔
17۔عابد بخاری (عرض ناشر) تاریخ خوانینِ قلات۔ص4۔
18۔میر گل خان نصیر۔تاریخ خوانینِ قلات 1982۔ص18۔

19۔میر گل خان نصیر (مترجم و دیباچہ نگار) بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار۔1990 (طبع دوئم) ص14۔

20۔ایضاً۔

21۔ایضاً۔ص18۔

22۔ڈاکٹر مبارک علی۔تاریخ کے نظریات۔ص3۔

23۔میر گل خان نصیر۔تاریخ بلوچستان (اول ودوئم) ص ق۔

24۔ڈاکٹر مبارک علی۔تاریخ کے نظریات۔ص49۔

25۔میر گل خان نصیر۔ تاریخ بلوچستان (اول ودوئم) ص107۔

26۔ڈاکٹر مبارک علی۔تاریخ کے نظریات۔ص95۔

27۔میر گل خان نصیر۔تاریخ بلوچستان۔1986۔

28۔ڈاکٹر مبارک علی۔تاریخ کے نظریات۔ص51۔

29۔میر گل خان نصیر۔بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی 1986 ص2

30۔ڈاکٹر مبارک علی۔تاریخ کے نظریات۔ص133+134۔

31۔ملک محمد سعید بلوچ۔بلوچستان ماقبل تاریخ۔1971۔

32۔ڈاکٹر مبارک علی۔تاریخ کے نظریات۔ص135۔

باب ششم

سیاستدان

1۔ بلوچستان کا سیاسی پس منظر

2۔ سیاسی سرگرمیوں کا آغاز

2.1۔انجمنِ اسلامیہ ریاستِ قلات

2.2۔قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی

2.3۔استمان گل

2.4۔پاکستان نیشنل پارٹی

2.5۔پاکستان نیشنل عوامی پارٹی

3۔سیاسی نظریات

4۔سیاسی جدوجہد میں کامیابی اورناکامیاں

بلوچستان کا سیاسی پس منظر:

اس سے پہلے کہ بلوچستان کی سیاسی پس منظر کا جائزہ لیا جائے مناسب ہوگا اور سیاسی پس منظر کو سمجھنے میں مددگار بھی کہ بلوچ کیسے اور کہاں سے اس خطے میں آ کر آباد ہوئے۔ اس سلسلے میں بنیادی طور پر مورخین مختلف ادوار میں تین مختلف طائفوں کی آمد کا ذکر کرتے ہیں۔

پہلا طائفہ اس خطے میں اُس وقت آباد ہوا جب نوشیرواں عادل (۵۳۱) ایران میں برسر اقتدار تھے۔ شاہنامہ فردوسی میں بلوچوں کی ہجرت سے متعلق ایک واقعہ درج ہے کہ ان کی تاخت سے تنگ آ کر ایرانی دہقان عاجزی سے نوشیرواں کے پاس فریاد لے کر گئے۔ ان واقعات کا اتنا اثر ہوا کہ نوشیرواں خود اپنی سپاہ کے ساتھ بلوچوں کی سرکوبی کو نکلا۔ شاہ نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ ان کیلئے بھاگنے کے تمام راستے بند کر دیئے جائیں اور ان کا قتلِ عام کیا جائے۔ حکم ملتے ہی ایرانی سپاہ ان پر ٹوٹ پڑی بوڑھے، جوان، مرد، عورت اور بچے جو بھی ان کی سپاہ کی نظروں میں آئے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بلوچوں کی اچھی خاصی تعداد اس لشکر کشی کی بھینٹ چڑھ گئی بچے کچھے اور لٹے پھٹے اپنے گھر بار اور مال مویشیاں چھوڑ کر وہاں سے فرار ہو گئے۔

بچ نکلنے والے سردار میر قمبر کی سرکردگی میں سیستان، رود بار، چاغی
اور خاران سے ہوتے ہوئے ماراپ، سیاہ کنب اور جھالاوان کے پہاڑوں
میں آ کر رُکے۔ چونکہ یہ لوگ کوہ البرز کی گھاٹیوں سے ہجرت کرکے یہاں
پہنچے تھے لہذا انھیں ماحولیاتی مطابقت کے پیش نظر یہ جگہ پسند بھی آ گئی۔
آہستہ آہستہ یہ لوگ پھیلتے پھیلتے سوراب، ماراپ، سیاہ کنب اور قلات کے
گردونواح میں بھی آباد ہونے لگے اور اس علاقے کو اپنا مسکن بنالیا۔
جس وقت بلوچ برزکوہ یعنی کوہِ البرز سے ہجرت کرکے
یہاں آ بسے اُس وقت یہاں سیوانامی ہندو خاندان کی حکومت تھی۔ جو غالباً
دراوڑی زبان بولتے تھے۔ بلوچ یہاں کے اصلی باشندوں سے الگ تھلگ
نہیں رہ سکتے تھے اور نہ ان میں اتنی سکت تھی کہ وہ اپنے آبائی وطن لوٹ
سکتے۔ انہوں نے اس سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا۔ دراوڑوں سے دوستانہ
تعلقات اور میل جول کے نتیجے میں ان سے شادی بیاہ بھی کرنے لگے رفتہ
رفتہ یہاں بلوچوں نے اپنی حکومت بنالی۔
بلوچوں کا دوسرا طائفہ جو دجلہ وفرات کی وادیوں اور حلب
کے مرغزاروں میں آباد تھا، گردش زمانہ سے بچ نہ سکا۔ خلفائے راشدین
کے بعد جب بنوامیہ کے خلیفہ یزید بن معاویہؓ اور امام حسینؓ کے مابین کربلا کا

معرکہ پیش آیا تو بلوچوں نے اس معرکے میں امام حسینؓ کا بھرپور ساتھ دیا۔ حضرت امام حسینؓ نے جب جامِ شہادت نوش کیا تو یزید اور ابن زیاد کے خوفِ انتقام سے ڈر کر بلوچ میدانی علاقوں کو چھوڑ کر حلب کے پہاڑوں میں جاگزین ہوئے۔ یہاں ان کا ذریعہ معاش زیریں آبادیوں اور شہروں کو لوٹنا اور غارت کرنا تھا۔ بالاخر بنوامیہ کے سفاک گورنر حجاج بن یوسف نے تنگ آ کر بلوچوں کو بھی تہہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ مجبوراً انھیں ان پہاڑوں سے بھی ہجرت کرنی پڑی۔

مورخین روایت کرتے ہیں کہ بلوچوں کے چوالیس (۴۴) قبیلے سردار جلال خان کی سرکردگی میں حلب سے ہجرت کر کے ایران آئے اور جفین کے مقام پر سکونت پذیر ہوئے۔ اس زمانے میں بدرالدین نامی ایک شخص ایرانی حکومت کی طرف سے اس علاقے کا حاکم تھا۔ اُس نے بلوچوں کی سرکوبی کیلئے لشکر نکالا اور جفین کے مقام پر ہی بلوچوں کو شکست دے کر ایران کی حدود سے باہر نکال دیا۔ ایران کی حدود سے نکلنے کے بعد یہ لوگ مکران میں آ بسے۔ مند اور اس سے ملحقہ علاقوں پر بزورِ شمشیر قبضہ کر لیا۔

بلوچوں کا تیسرا طائفہ "ناروئی" کہلاتے ہیں جو مکران کی سرحد سے بندر عباس تک، چاغی کی سرحد سے سیستان تک اور افغانی اور ایرانی

سرحدوں کے ساتھ ساتھ قدیم سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ رستم اور کوہزاد کی لڑائی میں فردوسی انہی بلوچوں کے لشکر کا ذکر کرتا ہے۔ اس وقت یہ علاقے شاہ ایران کے ماتحت تھے لیکن جب نادر شاہ نے ایران کی حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد اس سرزمین کی طرف رخ کیا اور انھیں ان بہادر اور جنگجو بلوچوں سے واسطہ پڑا تب اس نے اس سرزمین کو "بلوچستان" کا نام دیا۔(۱)

پندرھویں صدی کے وسط میں جب ہندوستان پر منگولوں کا سیلاب اُمنڈ آیا تب سیوا خاندان بھی ان کی ہولناکیوں سے نہ بچ سکا۔ منگولوں کے ہاتھوں اس خاندان کو بری طرح شکست ہوئی اور منگول قلات پر حکومت کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس زمانے میں بلوچوں کے براہوئی طائفے کا سردار میرو تھا جسکا تعلق میر قمبر کی نسل سے تھا۔ میرو انتہائی بہادر اور موقع شناس تھا۔ اُس نے منگولوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ منگولوں کی خوشنودی اور اعانت حاصل کرنے کے بعد میرو نے دراوڑوں کو چھپر، زیارت اور دشت گوران سے جبکہ جدگالوں کو ماراپ، سیاہ کنب، گدر اور سوراب سے نکال باہر کیا۔ ان کی اراضیات پر قبضہ کرلیا۔ اسطرح اس علاقے میں میرو نے نہ صرف اپنے قدم جمائے بلکہ وہ اپنی قبائلی طاقت کو کئی گناہ بڑھانے

میں بھی کامیاب ہوئے۔

جب منگولوں کی طاقت میں کمی آئی اور ہندوستان پر اُنکی گرفت ڈھیلی ہونے لگی تب اسکا اثر قلات کی حکومت پر بھی پڑا۔ قندھار کے ارغون خاندان نے قلات پر فوج کشی کی جسکے نتیجے میں منگولوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ زنون بیگ ارغون قلات پر قابض ہو گیا۔

۱۵۱۱ء میں سردار میرو کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا میر عمر بلوچوں کے براہوئی طائفے کا سردار منتخب ہوا۔ میر عمر کو ہوشیاری، بہادری اور موقع شناسی ورثے میں ملی تھی۔ وہ اپنے کئی کارناموں اور معمات کی وجہ سے لوگوں میں کافی ہردلعزیز ہو چکے تھے۔ اب اُسے قلات کی حکومت پر قبضہ کرنے کیلئے مناسب موقع کی تلاش تھی۔

۱۵۳۰ء میں جب کامران مغل کے ہاتھوں ارغون خاندان کو قندھار میں شکست ہوئی تو نتیجے میں زنون بیگ کی حکومت قلات میں کمزور پڑ گئی۔ میر عمر جو کسی ایسے موقع کی تاک میں تھا، نے اپنے نڈر اور جفاکش قبیلے کے ساتھ قلات پر حملہ کر دیا۔ زنون بیگ نے مقابلہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر اُسے شکست کھانے کے بعد افغانستان کی طرف فرار ہونا پڑا۔ اسطرح فتح

یاب ہو کر میر عمر نے قلات میں بلوچوں کی حکومت کی بنیاد رکھ دی۔(2)

تاریخی لحاظ سے بلوچوں کو منظّم و متحرک کرنے نیز انھیں مرکزیت کی
جانب لے جانے میں جن شخصیات نے اہم کردار ادا کیا ان میں میر چاکر
خان رند اور بعدازاں میر نصیر خان نوری کے نام انتہائی اہمیت کے حامل
ہیں۔

چاکر خان رند کو قومی اتحاد کیلئے پہلا معمارِ قوم تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس
نے بہت قلیل عرصہ کیلئے قائم رہنے والے اتحاد کی صورت میں بلوچ ریاست
قائم کی۔ یہ ریاست مکران کے ساحل سے کوئٹہ کے جنوب میں واقع مری
قبائل تک کے علاقے پر محیط تھی۔ میر چاکر خان رند جس نے سبی کو اپنا
دارالحکومت بنایا تھا ۱۴۸۷ء سے لے کر اپنی وفات ۱۵۱۱ تک حکومت کی۔ میر
چاکر خان رند کو بحیثیت سپہ سالار بلوچوں کے سیاسی اتحاد کی
جانب پہلی سنجیدہ کوشش کرنے والے کی حیثیت سے بھی تاریخ میں یاد
رکھا جاتا ہے۔(3)

میر نصیر خان نوری کو مورخین بلوچوں کے ایک ایسے خان
کے طور پر یاد کرتے ہیں جس نے نہ صرف ایک مربوط و منظّم جمہوری نظام کی
داغ بیل ڈالی بلکہ اپنے زیرِ اثر تمام بلوچ قبائل کو کانفیڈریشن کی شکل بھی

دی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے قبائل کے سربراہان اور معتبرین پر مشتمل بلوچی مجلس (بلوچ پارلیمنٹ) کی بھی بنیاد رکھی کہ جس میں ہر قبیلے کا نمائندہ شامل ہوتا تھا۔ جو امورِ مملکت چلانے میں خان کی مشاورت کرتے تھے۔ رسم ورواج اور شرع انور کے حسین امتزاج سے ایک دستورِ حیات مرتب کیا۔ شرعی فیصلوں کیلئے ملک بھر میں محکمہ قضاء کا قیام عمل میں لایا۔ (4)

میر نصیر خان ۱۷۴۹ء میں جب خان بنے تو ان کے عہد میں مختلف حکومتیں سیاسی بنیادوں پر قائم تھیں لہذا میر نصیر خان نے بھی اپنے نظام حکومت کی تشکیل نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی طرزِ حکومت کو نمونہ بنا کر ترتیب دی۔ یہ سلسلہ ۱۷۹۴ء سے یعنی اُسکی وفات کے وقت تک برقرار رہا۔ بعد کے حکمرانوں نے بھی طرزِ حکمرانی کے انہی اصولوں کو اپنانے کی کوشش کی۔

میر نصیر خان نے بلوچستان کو نہ صرف ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے دیگر ممالک سے تسلیم کرایا بلکہ ''طوران'' کے بجائے بلوچوں کے وطن کا نام ''بلوچستان'' بھی انھوں نے ہی رکھا۔ (5)

اس خطے کی سیاسی تاریخ میں اُتھل پتھل کا لا متناہی سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب انگریزوں کی آمد اس خطے میں شروع ہو جاتی ہے۔

''افغانستان میں برطانیہ اور روس کے درمیان ایک ''بڑے کھیل'' کی شروعات ایک ہی وقت میں ہوئیں۔ علاوہ ازیں برطانوی راج کا دائرہ اختیار ہندوستان کی سرحدوں تک بڑھانے کا برطانیہ کا منصوبہ بھی اسی دوران تیار ہوا۔ یہ منصوبہ ''فارورڈ پالیسی'' کے نام سے مشہور ہوا۔ جب انگریزوں نے طے کیا کہ افغانستان ان کی نوآبادی ہندوستان اور روس کی درمیانی ریاست ہوگا تو بلوچستان جو افغانستان کے ایک طرف واقع تھا اچانک ہی فوجی اہمیت اختیار کر گیا۔ افغانستان کی سرحدوں تک رسائی کے راستوں پر مکمل قبضے کیلئے انگریزوں نے چالیس سال سے زائد عرصے تک بلوچوں سے خونریز لڑائیاں لڑیں۔ ۱۸۷۶ کے لگ بھگ وہ قلات کو جھکانے اور محصول خاص اور قبائلی خودمختاری کے باقاعدہ معاہدے کے تحت فوجی چھاونیاں قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور صدی کی آخری دہائیوں میں مدِ مقابل سرداروں کو آپس میں لڑا کر انھوں نے اس خطے کو باقاعدہ طور پر سات حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ۱۸۹۱ میں مغرب بعید میں ایک چوتھائی حصہ گولڈسمتھ لائن کے ذریعے ایران کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۸۹۴ میں شمال میں ایک چھوٹی پٹی ڈیورنڈ لائن کے ذریعے افغانستان کا حصہ بنا دی گئی اور برطانوی ہندوستان میں قطع و برید کے بعد بچے ہوئے بلوچ علاقے پر مرکزی حکومت کے زیر اثر علاقے جو نہایت اہم درے کی حفاظت کرتے تھے، ریاستِ قلات اور تین کٹھ پتلی ریاستوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔'' (6)

جب زاران روس ماسکو سے ترکستان ، کرغیزیہ، ترکمانستان، بخارا کو فتح کرنے نکلے تو جوابی کاروائی کے طور پر انگریز بھی اس وقت تک کلکتہ اور بمبئی پہنچ چکے تھے۔ مورخ اور سیاست دان اس عہد کو تاریخ کے بدترین عہد کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ اس وقت سندھ اور پنجاب کی آزاد حیثیت تھی۔ مہاراجے پنجاب پر حکمرانی کر رہے تھے اور سندھ کی حکمرانی میروں کے پاس تھی۔

زار روس کی اس پیش قدمی کو دیکھتے ہوئے انگریزوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ وہ کہیں ہندوستان نہ پہنچ جائیں اس لیے وہ پنجاب اور سندھ کو ملاتے ہوئے بلوچستان بھی آ پہنچے۔ سندھ میں انگریزوں کو میروں کی طرف سے کسی طرح کی بھی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انگریز سمندر کے راستے اس خطے میں وارد ہوئے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب بلوچستان اور افغانستان کے تعلقات اور رشتے بہت گہرے اور مضبوط تھے۔ اپنی کمیونیکیشن کی وجہ سے انگریز بلوچستان میں شکست سے دوچار رہے لیکن ایک دفعہ پھر منظم اور بھرپور طریقے سے اُنھوں نے بلوچستان پر حملہ کر دیا اور اسطرح وہ بلوچستان پر قابض ہوئے۔ (7)

''انگریزوں کی فتح سے ۱۹۲۰ تک بلوچستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوتیں ہوئیں اور ان کو نکالنے کیلئے زبردست جدوجہد ہوئی ۱۹۲۰ میں جدوجہد کا طریقہ بدلا۔ چند سال خاموشی کے گزرے.......... ۱۹۲۰ کے بعد بلوچ نوجوانوں نے دوسرے رنگ میں اپنی جمہوری جدوجہد کا آغاز کیا کیونکہ تجربے نے اُنھیں یہ بتایا کہ ہتھیار اٹھانا انگریزوں کیلئے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا۔'' (8)

اکتوبر ۱۹۱۷ کے سوشلسٹ انقلاب نے جہاں مختلف خطوں میں اپنے اثرات پھیلائے وہاں بلوچستان کے نوجوانوں نے بھی اس انقلاب کے اثرات کو اپنے قومی حقوق کی جدوجہد سے مربوط کر کے قبول کرلیا۔

دوسری طرف ہندوستان میں تحریک آزادی کی شعاعیں بلوچستان کی سرزمین پر بھی پڑنے لگیں۔ انگریزوں کی حکومت نے ان اثرات کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر اُنھیں اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اُنکے تمام ناجائز اور جائز حربے بیکار ثابت ہوئے جو اُنھوں نے آزمائے۔(9)

میر یوسف علی خان مگسی جو اپنے والد محترم نواب قیصر خان مگسی کے ساتھ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۹ء تک ملتان میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے۔ پنجاب میں رہ کر میر یوسف علی خان مگسی نے وہاں کی انقلابی تحریکوں کا

بغور جائزہ لیا اور ان سے متاثر ہوئے۔ رفتہ رفتہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے نظریات سے متاثر ہو کر اپنے وطن میں ان تحاریک کی بنیاد رکھنے کیلئے ذہنی طور پر تیار ہو گئے۔

۱۷ نومبر ۱۹۲۹ء کو "فریادِ بلوچستان" کے عنوان سے میر یوسف علی خان مگسی کا ایک مضمون لاہور کے ایک ہفتہ وار اخبار "ہمدرد" میں شائع ہوا۔ اس مضمون کے چھپتے ہی بلوچستان کے ایوان حکومت میں کھلبلی مچ گئی۔ اس وقت ریاست قلات کے وزیر اعظم سر شمس شاہ تھے۔ اُس نے فوراً نواب یوسف علی خان مگسی کو گرفتار کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ ان کو ملتان سے گرفتار کر کے مستونگ لایا گیا اور ایک خصوصی جرگے کے سامنے پیش کیا گیا۔ جرگے نے سزا سناتے ہوئے اسے ایک سال کیلئے گٹ زہری میں سردار رسول بخش زرک زئی کی نگرانی میں نظر بند رکھنے، بارہ ہزار نو سو روپے جرمانے (جو گرفتاری کے وقت اُس کے جیب میں تھے) اور بعد از رہائی دس ہزار روپے کی ضمانت نیک چلنی معیادی تین سال، داخل کرنے کی سزا دی گئی۔ (10)

گزشتہ نصف صدی کے تلخ تجربات کا جائزہ لینے کے بعد بلوچوں کے بیدار مغز، وطن دوست اور آزادی خواہ نوجوانوں نے یہ

فیصلہ کر لیا کہ موجودہ حالات میں انگریزوں کے اقتدار کے خلاف مسلح جدوجہد کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتی کیونکہ بلوچستان کا اقتدار اعلیٰ جو خان اور سرداروں کی باہمی طاقت کا نام تھا اب نہ صرف اپنا اثر کھو چکا تھا بلکہ انتشار کا شکار ہو کر اختلافات کی نذر ہو چکا تھا۔ قبائل غیر منظم اور غیر مسلح تھے جنگی جبر سے ان کی جنگجو یانہ صلاحتیں ختم ہو چکی تھیں، جبکہ دوسری طرف جدید ہتھیاروں سے لیس تربیت یافتہ اور منظم انگریزوں کے لشکر تھے۔ اس وقت کسی ایسی تحریک کی ضرورت تھی جو انھیں غلامی کا احساس دلا کر متحد کر سکتی اور جو پر امن اور وقتی حالات سے مطابقت بھی رکھتی، ان معروضی و موضوعی حالات کے پیش نظر عبدالعزیز کرد کی قیادت میں ۱۹۳۰ء میں ''انجمن اتحاد بلوچان'' کے نام سے مستونگ میں ایک خفیہ سیاسی تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی جس کا مقصد زیر زمین رہ کر قومی حقوق کے حصول کیلئے جدوجہد کو منظم کرنا تھا۔ بلوچستان کی تاریخ میں پہلی سیاسی تنظیم تھی جو آئندہ منزل کی طرف اور سیاسی جدوجہد کی سمت کا تعین کرنے کیلئے معرضِ وجود میں آئی تھی۔ (11)

جولائی ۱۹۳۱ء میں بمقام زہری اپنی نظر بندی کا عرصہ گزارنے کے بعد میر یوسف علی خان رہا ہو کر کوئٹہ آئے۔ انجمن اتحاد بلوچان کے اراکین اور بلوچستان کے دوسرے حریت پسندوں نے ان کا

پرجوش خیر مقدم کیا۔ میر یوسف علی خان انجمن کے رکن بن گئے اور تحریک میں ایک دفعہ پھر سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا شروع کر دیا۔ میر یوسف علی خان مگسی کی شمولیت کے بعد انجمن اتحاد بلوچاں نے اپنا سیاسی موقف اعلانیہ طور پر عوام کے سامنے پیش کر دیا۔ (12)

خان قلات میر محمود خان دوئم ۲ اور ۳ نومبر کی درمیانی رات کو اپنے ولی عہد اور جانشین کا تصفیہ کیئے بغیر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ریاستی بلوچستان کے وزیر اعظم سر شمس شاہ امیر محمود خان کے بڑے صاحب زادے میر محمد انور خان کو ولی عہد مقرر کرنے کیلئے قانونی و شرعی جواز مہیا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور ساتھ ساتھ ریاستی بلوچستان کے سرداران کو بھی اپنا ہمنوا بنانے کیلئے راستہ ہموار کر رہے تھے جبکہ انجمن اتحاد بلوچاں کے نوجوان اراکین اور بعض دوسرے قبائلی سردار جو سر شاہ شمس کے خلاف تھے، میر محمد اعظم جان کو قلات کا خان بنانا چاہتے تھے۔ انجمن اتحاد بلوچاں کے اراکین یوسف علی خان مگسی کی قیادت میں میر محمد اعظم جان کا مشروط بنیادوں پر حمایت کر رہے تھے۔ میر محمد اعظم جان نے انجمن کے اراکین کو یہ باور کرایا تھا کہ وہ ریاستی بلوچستان میں ذمہ دار حکومت قائم کرینگے۔ (13)

میر محمد اعظم جان کی راہ میں سرشمس شاہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی اسے راستے سے ہٹانے کیلئے انجمن اتحاد بلوچاں کے اراکین نے موثر تحریک چلانے کا فیصلہ کرلیا چونکہ علاقہ جھل مگسی میں میر یوسف علی خان کی وجہ سے انجمن کا اثر زیادہ تھا لہذا وہیں سے ہی ایجی ٹیشن کی ابتداء کا پروگرام بنایا گیا۔ یہ تحریک ''مگسی ایجی ٹیشن'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسکے بعد اپنے مطالبات منوانے کیلئے انجمن نے ''شمس گردی'' کے نام سے ایک کتابچہ بھی شائع کیا جسے ہم بلوچستان میں دور استبداد کے خلاف اور آزادی کے حق میں سیاسی طور پر بلند کی ہوئی پہلی آواز کا نام دے سکتے ہیں۔ (14)

میر یوسف علی خان مگسی اور عبدالعزیز کرد کی سرکردگی میں انجمن نے میر محمد اعظم جان کو خانِ قلات مقرر کرنے کیلئے جو تحریک چلائی اس میں اُسے کامیابی حاصل ہوئی۔ خانِ قلات کے منتخب ہوتے ہی میر اعظم جان اپنے وعدوں سے پھر گئے اور انجمن کو برداشت کرنا بھی اُس نے گوارہ نہیں کیا۔

میر یوسف علی خان مگسی کی کوششوں کے نتیجے میں دسمبر ۱۹۳۲ء میں جیکب آباد میں ''آل انڈیا بلوچ کانفرنس'' کا انعقاد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت والئی خیرپور میر علی نواز خان کو کرنا تھا لیکن بوجہ بیماری وہ تشریف نہ

لا سکے البتہ انکا خطبہ صدارت اُنکے پرائیوٹ سکریٹری نے کانفرنس میں پڑھ کر سنایا۔ مندوبین نے عبدالصمد خان اچکزئی کو متفقہ طور پر اجلاس کی صدارت کیلئے منتخب کیا۔ بلوچستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مندوبین کے علاوہ اس کانفرنس میں بعض سیاسی اور اصلاحی تنظیموں نے بھی شرکت کی اُن میں انجمنِ اتحاد بلوچاں ہند، انجمن اتحادِ بلوچاں بلوچستان، انجمنِ اتحاد بلوچاں سندھ و کراچی، انجمنِ انیسِ مکران، لوکل ایسوی ایشن بلوچستان، جمعیت العلماء سندھ، مجلس احرار اسلام، انجمنِ مجاہدین اسلام جیکب آباد، انجمنِ اسلامیہ شکارپور کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

آل انڈیا بلوچ کانفرنس ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ کو تین دن تک کامیابی کے ساتھ جیکب آباد میں جاری رہی۔ خان عبدالصمد خان اچکزئی اور بعض دوسرے غیر بلوچ عمائدین کی تجویز پر کانفرنس کے نام میں معمولی سی تبدیلی کر کے ''بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس'' رکھ دیا گیا۔(15)

بلوچستان میں سیاسی فضاء کو پروان چڑھانے میں صحافتی شعبے کا کردار بھی انتہائی اہم ہے۔ ابتداء میں بے شک بلوچستان میں نشر و اشاعت کی کوئی صورت نہیں تھی لیکن بلوچستان سے باہر ان مقاصد کے حصول کیلئے

کوششیں کی گئیں ہے ۱۹۲۷ میں میر عبدالعزیز کرد اور محمد نسیم تلوی نے دہلی سے "بلوچستان" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنے کی کوشش کی جسے بلوچستان کے حکومت کے کہنے پر دو ہی اشاعت کے بعد ممنوع قرار دے دیا گیا۔

لاہور سے روزنامہ "آزاد" میں بلوچستان سے متعلق سیاسی مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا، ان مضامین میں بلوچستان کے عوام کو انگریزی اقتدار اور سرداری نظام کے خلاف آئینی جدو جہد کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ مضامین جو عوام کی سیاسی تربیت میں اہم کردار ادا کر رہے تھے، برطانوی حکومت ہند کیلئے نا قابلِ برداشت تھے۔ بالآخر بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کے براہ راست حکم سے پولیٹیکل ایجنٹ قلات نے میر عبدالعزیز کرد کو گرفتار کر کے سبی کے شاہی جرگے سے تین سال قید بامشقت کی سزا دلوائی اور اُسے سنٹرل جیل مچھ بھیج دیا گیا۔

۲۹ جنوری ۱۹۳۴ کو عبدالصمد خان اچکزئی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر اخبارات میں سیاسی مضامین شائع کرنے اور کراچی کے ایک جلسہ عام میں حکومت بلوچستان کے خلاف تقریر کرنے کا الزام تھا۔ پانچ سال قید بامشقت کی سزا دلوا کر خان عبدالصمد خان اچکزئی کو بھی مچھ جیل

میں محبوس رکھا گیا۔

میر عبدالعزیز کرد اور خان عبدالصمد خان اچکزئی کی گرفتاری کے بعد بلوچستان میں گرفتاریوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔تحریک سے وابستہ بعض نوجوان ملازم اپنی ملازمتیں چھوڑ کر بلوچستان سے چلے گئے۔ان میں محمد حسین عنقا، محمد حسن نظامی، محمد نسیم تلوی اور محمد اسلم خان اچکزئی جیسے ادیب اور دانشور شامل تھے۔

محمد حسین عنقا اور نسیم تلوی کراچی میں رہے اور مولانا عبدالصمد سربازی کے زیر ادارت چھپنے والے ہفت روزہ ''البلوچ'' میں کام کرنے لگے۔انھوں نے بعد میں ''بلوچستان جدید'' کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا جس نے بلوچستان کی بڑی خدمت کی۔محمد اسلم خان اچکزئی جیکب آباد میں رہے اور وہاں سے ''الحنیف'' کی ادارت سنبھال لی۔ اس بات میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ بلوچستان کی سیاسی بیداری میں ان اخبارات کا ناقابلِ فراموش کردار رہا ہے۔(16)

نواب یوسف علی خان قلات کے مستاجر علاقوں کی واپسی سے متعلق گفت وشنید کرنے انگلستان چلے گئے۔ میر عبدالعزیز کرد اور عبدالصمد خان اچکزئی جیل میں تھے، ان حالات نے کارکنوں کو انتہائی

مایوس کردیا۔

میر یوسف علی مگسی ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ کو واپس وطن لوٹے، وہ اپنا سیاسی پروگرام پیش کیے بغیر ۱۹۳۵ کی تباہ کن زلزلے کی زد میں آگئے ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرنے کے بعد جولائی ۱۹۳۵ میں خان قلات نے میر عبدالعزیز کرد کی اپیل پر اُن کی بقایا سزا معاف کر کے انھیں رہا کردیا۔ جبکہ عبدالصمد خان اچکزئی بدستور جیل میں رہے۔ (17)

مقامی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملازمتیں دلوانے اور نادار طلباء کیلئے تعلیمی وظائف حاصل کرنے، بیرون بلوچستان اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مقامی طلباء کے داخلے کیلئے جدوجہد کرنے کے مقاصد کے ساتھ ۱۹۳۲ میں نواب محمد خان جوگیزئی کی صدارت میں اسلامیہ ہائی اسکول کوئٹہ کے ہال میں بعض سرکردہ افراد کا اجتماع بھی ہوا تھا۔ جس میں عبدالصمد خان اچکزئی، میر عبدالعزیز کرد اور محمد ہاشم خان غلزئی کے علاوہ دیوان جمعیت رائے جیسے مقامی ہندو زعماء نے بھی شرکت کی تھی۔ (18)

اسکے علاوہ علمی کلب مستونگ (۱۹۳۲)، انجمن اسلامیہ (۱۹۳۶)، انجمن وطن (۱۹۳۶) قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی (۱۹۳۷) نے بلوچستان میں سیاسی بیداری کیلئے اہم کردار ادا کیا۔

سیاسی سرگرمیوں کا آغاز:

میٹرک پاس کرنے کے بعد جب اعلیٰ تعلیم کیلئے میر گل خان نصیرؔ لاہور چلے گئے تو وہاں اُن کی حساس طبیعت نے مختلف تحریکات سے اثر لینا قبول کرلیا۔ ان اثرات کی روشنی میں انھوں نے بلوچستان کے حالات کو مدنظر رکھا تو بلوچستان کی معاشی، سیاسی، ثقافتی اور تعلیمی پسماندگی کا ایک عجیب پہلوان کے ذہن میں اجاگر ہوا، یہ سماجی شعور کا ابتدائی احساس تھا جس نے بعد میں سیاسی روپ دھارلیا۔ میر گل خان نصیرؔ اپنی تعلیم نامکمل چھوڑ کر ۳۲-۱۹۳۱ میں واپس بلوچستان آ گئے۔

''بلوچستان میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں، مقامی سرداروں کے مظالم، تہذیبی ترقی کے لحاظ سے عوام کی انتہائی پس ماندگی اور معاشی لحاظ سے بلوچوں کی حد درجے بدحالی نے نصیر کے شعور کو سماج، زندگی اور ادب کے سچے تعلق کا پہلا واضح اور ہمیشہ یاد رہنے والا درس دیا۔'' (19)

بلوچستان آتے ہی میر گل خان نصیرؔ نے یہاں کے سیاسی دھارے سے اپنے آپ کو منسلک رکھا۔ میر عبدالعزیز کرد اور یوسف علی خان مگسی کی عملی جدوجہد سے وہ حد درجہ متاثر تھے۔

ایک تقریب میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے

"۱۹۳۲ء میں جب اسلامیہ کالج لاہور سے بلوچستان لوٹ آیا تو میں نے کوئٹہ میں ایک انجمن بنائی جسکا نام "لوکل مسلم ایسوسی ایشن" رکھا۔ یہ تعلیمی پسماندگی دور کرنے کیلیئے بنائی گئی تھی۔ اس انجمن میں میر گل خان نصیرؔ بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے" (20)

میر گل خان نصیرؔ نے عملی سیاست کا آغاز ایک ایسے دور میں کیا جب ہر طرف پابندیاں اور بندشیں تھیں۔ سیاست کا نام لینا اپنے لیے طرح طرح کی مصیبتیں کھڑی کرنے کے مترادف تھا۔ ان تمام مصائب اور مشکلات کو خاطر میں نہ لاکر میر گل خان نصیرؔ بے خطر اس آتشِ نمرود میں کود پڑے۔

انجمنِ اسلامیہ ریاست قلات:

"انجمنِ اتحاد بلوچاں" جسے آل انڈیا بلوچ کانفرنس کے بعد "بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس" کا نام دیا گیا تھا۔ اب سیاسی طور پر غیر موثر ہو چکی تھی۔ اس خلا کو پر کرنے کیلیئے میر عبدالعزیز خان کرد کی جیل سے رہائی کے بعد جون ۱۹۳۶ء میں میر محمد فاضل خان محمد شہی سکریٹری تعلیم ریاستِ قلات کی زیرِ صدارت بمقام مستونگ بلوچ نوجوانوں کا

اجلاس منعقد ہوا۔ نوجوانوں کی سیاسی تعلیم و تربیت اور آئندہ جدوجہد کیلئے کارکنوں کی تنظیم سازی میں مشکلات کو سامنے رکھ کر بظاہر غیر سیاسی نام سے ایک ایسی اصلاحی جماعت بنانے کی ضرورت پر زور دیا گیا جس کے فرائض میں بظاہر نادار طلباء کیلئے تعلیمی وظائف کا انتظام، امداد باہمی کے طریقوں پر غریب کاشتکاروں کی مدد اور دیہات سدھار کا کام شامل تھا۔ لہذا ''انجمن اسلامیہ ریاست قلات'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ میر گل خان نصیرؔ اس انجمن کے صدر اور ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کو جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا۔ (21)

انجمن بہت جلد عوام میں مقبول ہوئی۔ بلاشبہ نوجوانوں کی اس پیش رفت میں ان کی پشت پر ایک مشفق ہاتھ میر احمد یار خان، خانِ قلات کا تھا کہ جنکے دل میں آزادی وطن اور بلوچ قوم کی سربلندی و سرفرازی کا پر خلوص جذبہ موجزن تھا۔ چنانچہ وطن کے نوجوانوں کی انتھک کاوشوں سے انجمنِ اسلامیہ کو ریاستِ قلات میں جلد ہی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی اور ہزاروں آدمی چند ماہ کی مختصر مدت میں اسکے ممبر بنے۔ (22)

پولیٹیکل ایجنٹ قلات کو انجمن کی مختصر مدت میں مقبولیت سے سخت تشویش لاحق ہوئی۔ اُس نے ساز باز کر کے سرداروں اور سرکاری ملازموں کی ملی بھگت سے ایک طے شدہ پروگرام کے تحت خفیہ اور پراسرار

رپورٹنگ کے ذریعے اس تنظیم کو دہشت گرد تنظیم ہونے کا الزام لگایا۔ اسطرح اس تنظیم کو خلافِ قانون قرار دے کر نہ صرف اس تنظیم کو ریاستِ قلات میں ممنوع قرار دیا گیا بلکہ اس کے وہ ممبران جو ملازمت میں تھے انھیں تبدیل کر کے دور دراز کے علاقوں میں بھیج دیا گیا تا کہ انکی قوت منتشر ہو سکے۔

قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی:

انجمن اسلامیہ کی سرگرمیوں کے معطل ہونے کے بعد بلوچستان کے روشن خیال نوجوان کسی ایسی تنظیم کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے جو قومی حقوق کی جدوجہد میں عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے۔ لہذا ۵ا فروری ۱۹۳۷ء کو دربار کے موقع پر سبی میں ریاست قلات کے نوجوان کارکنوں کا ایک اجتماع منعقد ہوا جسکی صدارت میر عبدالعزیز کرد نے کی۔ یہیں ''قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی'' کے نام سے ریاست قلات میں ایک سیاسی جماعت تشکیل دی گئی جس کے صدر میر عبدالعزیز کرد، نائب صدر میر گل خان نصیر اور جنرل سکریٹری ملک فیض محمد خان یوسف زئی منتخب ہوئے۔

قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی دراصل انجمنِ اتحاد بلوچان اور

انجمنِ اسلامیہ ریاستِ قلات کا تسلسل تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس پارٹی نے باقاعدہ سیاسی بنیادوں پر اپنے قیام کا اعلان کیا اور اعلانیہ طور پر سیاست میں سرگرم رہنے کا بھی عندیہ دیا۔

قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے بیشتر اراکین اگرچہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور خصوصاً انڈین نیشنل کانگریس کے پروگرام سے متفق تھے، مگر وہ بلوچستان کو ایران اور افغانستان کی طرح ہندوستان سے علیحدہ ایک وطن خیال کرتے تھے۔ قلات کی حکومت کو بلوچستان اور بلوچ قوم کی مرکزی حکومت سمجھتے تھے اور قومی بنیادوں پر اسکی ترقی و تنظیم کے خواہاں تھے۔

قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی دو تین سال کے مختصر عرصے میں ریاست قلات کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ پارٹی کی کامیاب جدوجہد سے ریاست قلات کی حکومت نے ملکی رواج میں کچھ اصلاحات بھی کیں۔

مساوی عوضانہ خون:

نیشنل پارٹی بنیادی طور پر عوضانہ خون لے کر قاتل کو قید کی سنگین سزا دیے بغیر رہا کرنے کے خلاف تھی لیکن وقتی حالات کے تناظر میں انھیں ایک متفقہ قرارداد

منظور کرنی پڑی کہ ریاست قلات کے تمام باشندوں کیلئے بلا تفریق قبائلی و سماجی مرتبہ ونسب مساویانہ عوضانہ وجرمانہ خون مقرر کیا جائے۔ خان قلات اور اراکینِ اسٹیٹ کونسل سے اس قرارداد کے مطالبے پر تمام بڑے شہروں جن بھاگ، لہڑی، ڈھاڈر، مستونگ، خضدار، پنجگور اور تربت شامل تھیں عوامی اجتماعات منعقد کیے گئے جلوس نکال کر مقامی جرگوں کے سامنے مظاہرہ کیا گیا۔ خان قلات نے اسٹیٹ کونسل کا اجلاس طلب کر کے اس مطالبے کو منظور کر لیا۔ (23)

زرسر اور زرشاہ کی معافی:

یہ ٹیکس ہر مرد، عورت، بچہ یا بوڑھا سب سے دو آنے فی کس زرسر اور دو آنے فی کس زرشاہ کے نام سے ہر سال وصول کیا جاتا تھا۔ وصول کی ہوئی کل رقم کا آدھا حصہ خانِ قلات کی حکومت کو ملتا تھا۔ جبکہ دوسرا نصف حصہ کچکی سردار خیلوں کو ملتا تھا۔ خانِ قلات جب مکران کے دورے پر روانہ ہوئے تو تربت پہنچنے پر نیشنل پارٹی مکران برانچ کے صدر حاجی عبدالسلام کی قیادت میں ہزاروں لوگوں نے انکی قیام گاہ کے سامنے پرامن مظاہرہ کیا۔ پارٹی کے تین نوجوان کارکنوں نے تین دن تک بھوک ہڑتال بھی کیا۔ مجبوراً خان

قلات کو اس ناجائز ٹیکس کی منسوخی کے احکامات جاری کرنے پڑے۔(24)

انکے علاوہ بیگار کی بندش اور مالی، بجار اور پرسی کے نام سے مختلف نوعیت کے ٹیکس قبائلی سردار اپنے متعلقہ قبیلوں سے وصول کرتے تھے۔ قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کی کامیاب تحریک کے نتیجے میں یہ ٹیکس بھی منسوخ ہو گئے۔

اس طرح کی اور کئی دوسری کامیاب تحاریک چلانے کے نتیجے میں کامیابی کے بعد اور اسکی بڑھتی ہوئی طاقت اور مقبولیت سے صرف ریاست قلات کے سردار ہی پریشان نہ تھے بلکہ اس سے بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ اور قلات کے پولیٹکل ایجنٹ بھی کافی خوفزدہ تھے۔ خان قلات اور نیشنل پارٹی کا اتحاد انگریزی حکومت کے نمائندوں کو ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا چنانچہ وہ خان قلات اور نیشنل پارٹی کے اراکین میں پھوٹ ڈالنے کیلئے شازشوں میں لگے رہے۔

میر عبدالعزیز کرد نے پارٹی کے مجلس عاملہ کی منظوری سے خان قلات کی خواہش پر نائب وزیر جھالاوان کا عہدہ قبول کیا تھا اور اسی مسلے کو اختلاف کے لیے بنیاد بنایا گیا۔ اصولی طور پر ملازمت میں ہوتے

ہوئے بھی میر عبدالعزیز کرد پارٹی کے صدر رہ سکتے تھے کیونکہ اس وقت جماعت کے آئین میں اسکی پابندی نہیں تھی بلکہ اسکی باقاعدہ آئینی اجازت تھی۔ پارٹی کے نائب صدر میر گل خان نصیرؔ اور جنرل سکریٹری ملک فیض محمد خان یوسفزئی پہلے سے ریاست کی ملازمتوں پر مامور تھے۔

مستونگ پارٹی کا صدر مقام ہونے کے علاوہ سراوان کے قبائلی سرداروں کا مرکز اور پولیٹیکل ایجنٹ قلات کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ میر عبدالعزیز کرد جب مستونگ سے جھالاوان چلے گئے تو اچانک سردار زادہ میر شہباز خان نوشیروانی مستونگ میں وارد ہوئے۔ پارٹی کے پرانے اور مخلص کارکنوں اور خصوصاً ان ذمہ دار ممبران کے خلاف جو خان قلات سے تعاون کے حق میں تھے، پروپیگنڈہ مہم شروع ہوئی۔ یہ مہم ایک مہینے تک بڑے زور و شور سے چلائی گئی۔ پارٹی میں شامل چند غیر ذمہ دار افراد نے تمام قواعد وضوابط اور آئینی اصولوں کو پس پشت ڈال کر میر شہباز خان نوشیروانی کو پارٹی کا صدر منتخب کرلیا۔ (25)

میر عبدالعزیز کرد ، میر گل خان نصیرؔ اور انکے حمایتی دوسرے ساتھی پارٹی کی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہے۔ میر شہباز خان نوشیروانی کے خلاف جب عدم اعتماد کی تحریک منظور ہوئی اور مجلس عاملہ کے

اجلاس میں اسکی رکنیت ختم کردی گئی اور ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کو پارٹی کا صدر چنا گیا تب پارٹی سے کنارہ کش لوگ واپس پارٹی کی صفوں میں لوٹ آئے البتہ میر عبدالعزیز کرد بدستور پارٹی کی سرگرمیوں سے کنارہ کش رہے(26)۔

حکومت قلات کے وزیر اعظم نے جو ہمیشہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا ایک افسر ہی ہوا کرتا تھا نیشنل پارٹی کے خلاف ردِ عمل کے طور پر نائب وزیر تعلیم کے عہدے کو جس پر پارٹی کا ایک سرگرم رکن میر فاضل خان محمد شہی (ایم اے۔ ایل ایل بی) مقرر تھا تخفیف میں لایا۔ وزیر اعظم کے اس حکم کے خلاف اسکولوں کے طلبا نے ہڑتال کر دی اور جا بجا مظاہرے بھی کیئے۔ وزیر اعظم جان بوجھ کر حالات کو ایسی ڈگر پر لانا چاہتے تھے جس کے نتیجے میں انگریزی افواج کو مداخلت کا جواز مل جائے۔ اس لیے اس نے ان ہڑتالوں اور مظاہروں کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ نا موافق حالات کو دیکھتے ہوئے نیشنل پارٹی کو میدان میں آنا پڑا۔ ۱۵، ۱۶ مارچ ۱۹۳۹ء کی درمیانی رات کو پارٹی کی مجلس عاملہ کا اجلاس ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مجلس عاملہ کے اجلاس میں حکومت قلات سے ذیل تین مطالبات کیے گئے۔

ا۔نائب وزیر تعلیم کی آسامی کو بحال کیا جائے۔

۲۔زری کلنگ اور جوبات کو منسوخ کردیا جائے اور مالیہ میں اصلاح وترمیم کی جائے۔

۳۔ریاست قلات کی تمام وزارتوں، نائب وزارتوں اور دوسرے ممتاز اور کلیدی عہدوں پر صرف مقامی تعلیم یافتہ لوگوں کو ملازم رکھا جائے (27)

پارٹی کی مجلس عاملہ نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اگر ۴۸ گھنٹوں میں انکے مطالبات تسلیم نہیں کیے گئے تو تمام ملکی ملازم اپنی ملازمتوں سے استعفٰی دے کر دفتری نظام میں تعطل پیدا کردیں گے۔کسان مالیہ اور ٹیکس دینے سے انکار کریں گے۔عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔بازاروں کو بند رکھا جائے گا۔طلباء عام ہڑتال کریں گے اور حکومت کے خلاف جلسے اور جلوس نکالے جائیں گے۔

۱۸ مارچ کو مستونگ کے مقام پر ایک عوامی جلسے کا انعقاد بھی کیا گیا۔جس میں ان تینوں مطالبات کو پیش کر کے ان پر عوام کی حمایت اور منظوری حاصل کر لی گئی اور دوسرے دن ساٹھ افراد پر مشتمل ایک وفد ان مطالبات کو خان قلات کے سامنے پیش کرنے کیلئے قلات روانہ ہوا۔

خانِ قلات نے وفد کو ملاقات کیلئے اپنے محل طلب کرلیا

لیکن وہاں پہنچتے ہی ان تمام ممبروں کو حراست میں لے کر اسٹیٹ فورس کی

تحویل میں دے دیا گیا۔ یہ عمل خان قلات اور قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے

مابین ٹکراؤ کے لامتناہی سلسلے کی ابتداء تھی۔

اس ریاستی عمل کے خلاف تمام اسکولوں اور سرکاری دفاتر

میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ لوگ جوق در جوق مستونگ آ گئے۔

وزیر اعظم قلات کی مسلسل خاموشی انگریزی حکومت کو

مداخلت کیلئے اُکسانا تھا۔ اس صورتحال سے سردار بھی بہت خوش ہو رہے

تھے۔ تب خانِ قلات کو وزیر اعظم کی دورخی کا اندازہ ہوا۔ خانِ قلات وفد

سے ملنے خود قید خانے گئے اور اُن سے بحث و تمحیص کے بعد ان کے

مطالبات مان کر ان کی رہائی کا حکم دے دیا۔ (28)

اس تحریک کی کامیابی کے بعد نیشنل پارٹی کے اراکین اور

انکی نوجوان قیادت ریاست قلات کے حکمرانوں کی متوقع ردِ عمل سے بالکل

انجان رہی۔ انھوں نے جوابی کاروائی کے طور پر محتاط رویہ اختیار نہیں کیا نتیجتاً

پارٹی میں پھوٹ پڑنی شروع ہو گئی۔ ۵ اور ۶ جولائی ۱۹۳۹ء کو مستونگ میں

پارٹی کا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کے فیصلے نے اس دہکتے انگارے پر

چونکہ ریاستِ قلات کے سردار، غیر ریاستی ملازمین اور پولیٹیکل ایجنٹ پارٹی کی سرگرمیوں کے سخت خلاف تھے اس لیے مقررہ تاریخ پر جب پارٹی کا سالانہ اجلاس شروع ہوا تو ساراوان کے بعض قبائلی سرداروں نے پولیٹیکل ایجنٹ قلات کے ایما پر اپنے اپنے قبیلوں کے مسلح دستوں کے ساتھ پارٹی کے کیمپ پر ہلہ بول دیا۔ اجلاس میں توڑ پھوڑ کر کے شامیانے اکھاڑ دیئے۔ اجلاس کو درہم برہم کرنے کے بعد یہ مسلح قبائلی دستے پولیٹیکل ایجنٹ قلات کی طرف سے فراہم کردہ ٹرکوں اور بسوں پر بیٹھ کر قلات روانہ ہوگئے۔ جہاں انھوں نے حکومتِ قلات سے کچھ مطالبے بھی کیے۔

۱۔ قلات نیشنل پارٹی کو ریاستِ قلات میں غیر قانونی جماعت قرار دیا جائے۔

۲۔ بلوچستان میں شائع ہونے والے اخبارات کے داخلے پر، ریاستِ قلات میں پابندی عائد کردی جائے۔

۳۔ دارالعلوم مستونگ کو بند کردیا جائے۔

۴۔ پارٹی رہنماؤں کو گرفتار اور ریاست بدر کردیا جائے۔

ان مطالبات کی روشنی میں ریاستِ قلات میں قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی پر پابندی عائد کردی گئی۔ ملک عبدالرحیم خواجہ خیل، ملک فیض محمد یوسفزئی، عبدالکریم شورش، مولانا عرض محمد صاحب دیوبندی، مولانا محمد عمر صاحب دیوبندی، مرزا فیض اللہ خان اور میر محمد فاضل خان کو ریاست بدر کر دیا گیا۔ پارٹی کا مرکزی دفتر جب کوئٹہ منتقل ہوا تو یہاں پارٹی نے انجمنِ وطن (تشکیل ۱۹۳۶ء سربراہ خان عبدالصمد خان اچکزئی) کے ساتھ مل کر اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔

دو چار مہینوں کے بعد میر گل خان نصیر جو اس وقت نائب وزیر جھالاوان تھے اور میر حمل خان جو تربت مکران میں مستوفی کے عہدے پر تعینات تھے۔ اپنے اپنے عہدوں سے احتجاجاً استعفیٰ دے کر پارٹی کی صفوں میں شامل ہوگئے (30)

قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی نے ایک جلاوطن پارٹی کی حیثیت سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں ۱۹۴۷ء کے وسط میں جب ریاستِ قلات میں پہلی بار انتخابات عمل میں آئے تو قلات نیشنل پارٹی جو اگرچہ اب تک ریاستِ قلات میں خلاف قانون جماعت تھی کے نامزد کردہ نمائندوں نے انفرادی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لے کر دیوانِ عام کے باون

(۵۲) ممبروں پر مشتمل ہاؤس میں انتالیس (۳۹) نشستیں حاصل کیں۔ بلوچستان کی تاریخ میں انتخاب کی یہ پہلی مثال تھی۔ قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کی اس کامیابی نے حکومت قلات اور قبائلی سرداروں کو حیرت میں ڈال دیا۔(31)

۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند کے منصوبہ کا اعلان ہوا تو ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں یہ طے ہوا۔ "............ریاستوں نے اختیار اعلیٰ (برطانیہ) کے حق میں جن حقوق سے دستبرداری اختیار کی تھی، وہ واپس ریاستوں کو حاصل ہونگے۔ اسطرح ایک جانب ریاستوں اور دوسری طرف تاج برطانیہ اور برطانوی ہند کے مابین سیاسی انتظامات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس خلا کو پر کرنے کیلئے ریاستوں کو یا تو برطانوی ہند میں جانشین حکومت یا حکومتوں کے ساتھ وفاق کے رشتہ میں استوار ہونا پڑے گا یا اگر ایسا نہ ہو سکے تو مخصوص سیاسی انتظامات کرنا ہوں گے(32)

ریاستِ قلات ہندوستانی ریاست نہیں تھی۔ اس ریاست کے تعلقات براہ راست حکومتِ برطانیہ کے ساتھ معاہدوں کے ذریعے تھے اس لئے اس ریاست کے مستقبل کا مسئلہ بھی مختلف فورمز میں زیرِ غور رہا۔ بانیِ پاکستان محمد علی جناح ریاستِ قلات کے قانونی مشیر بھی رہ چکے تھے۔

''حکومتِ برطانیہ کی معاہداتی خلاف ورزیوں اور ریاست کی پوزیشن کے بارے میں، میں نے اپنا کیس مسٹر محمد علی جناح کے حوالے کیا۔ وہ مسلمانوں میں درجہ اول کے وکیل تھے۔ آئینی گتھیوں کو سلجھانے میں انکی مہارت کا چرچا تھا......''(33)

۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو میر احمد یار خان نے، لارڈ ماونٹ بٹن وائسرائے ہند اور محمد علی جناح صدر کل ہند مسلم لیگ کے ساتھ بیان کردہ گفت وشنید اور مشترکہ اعلانیے کی روشنی میں قلات کی مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ اسی دن جامعہ مسجد قلات میں خانِ معظم کے نام کا اسلامی خطبہ پڑھا گیا اور مسجد کے صحن میں ہی بعد از نماز جمعہ آزاد قلات کا جھنڈا لہرایا گیا۔(34)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی آزادی کا اعلان ہوا اور ۲۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو آدھی رات کے وقت خان معظم نے بہ امر مجبوری پاکستان کے ساتھ قلات کی غیر مشروط الحاق کا اعلان کر دیا۔

''الحاق کے اعلان کے ساتھ خان معظم کو قلات نیشنل پارٹی کے رہنماؤں کی گرفتاری اور ناپسندیدہ ملکی افسروں کو ملازمت سے سبکدوش کرانے کی ہدایت ہوئی۔ میر غوث بخش بزنجو، مولانا محمد عمر، مولانا عرض محمد اور میر گل خان نصیر فوراً گرفتار کر لیے گئے۔ ملک فیض محمد خان یوسفزئی

سیکریٹری ٹرانسپورٹ، ملک عبدالرحیم خواجہ خیل ناظم قلات، سردار بہادر حاجی بہرام خان لہڑی وزیر مال، میر لال بخش مینگل تحصیلدار، سید احمد شاہ ہاشمی تحصیلدار اور ملک محمد پناہ تحصیلدار کے علاوہ قلات کے بیسویوں دوسرے چھوٹے بڑے ملازموں کو جن پر قلات کی وفاداری کا ذرہ بھر شبہ ہوا ملازمتوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔"(35)

اس اقدام کے ساتھ ساتھ قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کو پاکستان کی مرکزی حکومت کی طرف سے ایک خاص اعلان کے ذریعے پاکستان بھر میں خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔ اسطرح قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے قائدین وارا کین جن میں میر گل خان نصیر بھی شامل تھے کی سیاسی سرگرمیاں محدود ہو گئیں۔

اُستمان گل:

۱۶ جولائی ۱۹۵۶ کو جب شہزادہ عبدالکریم اور محمد حسین عنقا جیل سے رہا ہوئے تو اپنی رہائی کے تقریباً ایک مہینے بعد وہ کراچی تشریف لائے۔ کراچی پہنچتے ہی انھوں نے ریاستِ قلات کے سیاسی کارکنوں کی میٹنگ طلب کی۔

"جب شہزادہ عبدالکریم خان کراچی پہنچے تو اُن کے قیام کے تقریباً

چار دن بعد میر غوث بخش بزنجو اور میر گل خان نصیرؔ بلوچی زبان کے ملک الشعراء کراچی پہنچے۔ لکّی ہاؤس میں شہزادہ عبدالکریم خان کے ساتھ قیام کیا۔ شہزادہ موصوف کے زیر سرکردگی میں غوث بخش بزنجو، میر گل خان نصیرؔ، میر محمد حسین عنقا نے اس دور کے سیاسی حالات کے تقاضوں کے مطابق بہت غور و خوض کے بعد بلوچوں کی سیاست کے ہر پہلو کو زیرِ نظر رکھتے ہوئے ایک سیاسی جماعت ''اُستمان گل'' (عوامی جماعت) کے قیام کا اعلان کیا۔'' (36)

جن بنیادوں پر انجمن اتحاد بلوچان اور قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی تشکیل پا چکی تھیں ''اُستمان گل'' بھی بالکل اُن ہی بنیادوں پر تشکیل دی گئی البتہ پارٹی کے دستور العمل سے انگریزی استعمار سے آزادی کی دفعہ حزف کر دی گئی اور اس کے بجائے پاکستان میں نسلی، لسانی اور جغرافیائی بنیادوں پر بلوچوں کیلئے ایک صوبے کا مطالبہ کیا گیا اور ساتھ ساتھ بلوچی زبان کو اس نئی وحدت کی سرکاری اور تحریری زبان قرار دینے کا مطالبہ بھی کیا۔ (37).

سردار عطا اللہ خان مینگل، نواب اکبر خان بگٹی
میر گل خان نصیر، میر محمد خان رئیسانی

پاکستان نیشنل پارٹی:

اُستمان گل اور ورور پشتون (تشکیل ۱۹۵۴ سربراہ عبدالصمد خان اچکزئی) سابق قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی اور انجمن وطن کی طرح ایک دوسرے کے تعاون سے اپنے اپنے متعلقہ علاقوں میں اپنا پروگرام جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان دونوں تنظیموں کا بنیادی مقصد ایک ہی تھا یعنی لسانی اور جغرافیائی ارتباط کو پیش نظر رکھ کر پاکستان کے اندر قومیتی صوبوں کا قیام (38) پاکستان کی مختلف وحدتوں میں سرگرم پارٹیاں اپنی اپنی وحدتوں میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کر چکی تھیں لیکن اُن میں ایک جماعت بھی ایسی نہیں تھی جو انفرادی طور پر پاکستان کی مرکزی سیاست پر اثر انداز ہو سکتی۔ اسی صورت حال کو مدنظر رکھ کر ایک ایسی سیاسی جماعت کی تشکیل کیلئے کوششیں شروع ہوئیں جو مجموعی طور پر سیاست میں سرگرم ہو کر موثر کردار ادا کر سکتی ہو۔ خان عبدالغفار خان ان دنوں جیل میں تھے۔ انکے خدائی خدمتگار اپنے صوبے میں موثر تحریک چلا رہے تھے۔ پنجاب میں میاں افتخار الدین اور سندھ میں جی ایم سید اس اتحاد کیلئے جدوجہد میں مصروف تھے۔(39)۔

جبکہ بلوچستان سے اس طرح کی اتحاد و انضمام کیلئے اُستمان گل کی قیادت اور اراکین بھی سرگرم عمل تھے جن میں میر گل خان نصیر، میر غوث بخش بزنجو، شہزادہ عبدالکریم، محمد حسین عنقا، محمد حسن نظامی، نواب خیر بخش مری، سردار عطاءاللہ مینگل، نواب اکبر خان بگٹی، سردار دینار خان کرد، سردار محمد خان باروزئی وغیرہ شامل تھے۔(40)

چنانچہ ۳۰ نومبر ۱۹۵۶ کو میاں افتخار الدین نے لاہور میں پاکستان کی تمام قوم پرور صوبائی جماعتوں کے نمائندوں کا یک اجلاس طلب کیا، جو میاں افتخار الدین کی رہائش گاہ پر تین دن تک جاری رہا۔ طویل بحث ومباحثے کے بعد ''پاکستان نیشنل پارٹی'' کے نام سے ایک تنظیم وجود میں آئی کہ جس میں مندرجہ ذیل جماعتیں ضم ہو گئیں۔

۱۔ پنجاب سے ''آزاد پاکستان پارٹی''

۲۔ سندھ سے ''سندھ محاذ'' ''سندھ ہاری پارٹی''

۳۔ سرحد سے ''خدائی خدمت گار''

اور بلوچستان سے ''اُستمان گل'' اور درود پشتون''

انہی حالات سے متاثر ہو کر مولانا بھاشانی اور انکے ساتھی سہروردی کا ساتھ چھوڑ کر عوامی لیگ سے الگ ہو گئے اور بھاشانی گروپ کے نام سے سیاست میں سرگرم عمل رہے۔

پاکستان نیشنل عوامی پارٹی:

پاکستان نیشنل پارٹی کو مزید موثر بنانے کیلئے جولائی ۱۹۵۷ء
میں پاکستان نیشنل پارٹی کے ایک وفد نے میاں افتخار الدین کی سربراہی میں ڈھاکہ جا کر مولانا بھاشانی کو اپنی پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی۔ چنانچہ پاکستان نیشنل پارٹی اور عوامی لیگ (بھاشانی گروپ) کے انضمام کے نتیجے میں "پاکستان نیشنل عوامی پارٹی" معرض وجود میں آئی۔ (سپریم کورٹ آف پاکستان روالپنڈی ریفرنس نمبر ۱۹۷۵۔ زیر دفعہ ۲،۶ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ ۱۹۶۲ اسلامی جمہوریہ پاکستان بنام عبدالولی خان، بیان منجانب میر غوث بخش بزنجو) (41) خان عبدالغفار خان کے بعد مولانا عبدالحمید خان بھاشانی پارٹی کے مرکزی صدر منتخب ہوئے۔ مختصر مدت میں پارٹی نے عوام میں غیر متوقع اور غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ ۱۹۶۷ میں پارٹی امور میں قائدین کے مابین اختلافات پیدا ہوئے جس کا نتیجہ پارٹی کے دو دھڑوں میں بٹ جانے کی صورت میں نکلا۔ ایک دھڑے کی قیادت مولانا بھاشانی نے اور دوسرے دھڑے کی قیادت خان عبدالولی خان نے سنبھال لی۔ (42) بلوچستان کی سیاست میں سرگرم اراکین ولی خان کی حمایت

کرتے رہے۔ میر گل خان نصیر بھی ان سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتیجے میں سندھ اور پنجاب میں پیپلز پارٹی اور سرحد و بلوچستان میں نیپ اور جمعیت علماء اسلام نے اکثریت حاصل کی۔ بلوچستان اور سرحد میں نیپ اور جمعیت علماء اسلام نے اپنی مخلوط حکومتیں بنائیں۔ میر غوث بخش بزنجو بلوچستان کے گورنر، عطاءاللہ مینگل وزیر اعلیٰ ہوئے'' (43)

۷ اور ۱۷ دسمبر کے انتخابات کے نتیجے میں پاکستان نیشنل عوامی پارٹی نے بلوچستان میں مرکزی اسمبلی کے چار میں سے تین نشستیں حاصل کرلیں جبکہ صوبائی اسمبلی کی بیس نشستوں میں سے نو نشستیں حاصل کرنے میں پارٹی کامیاب رہی اور ساتھ ساتھ خواتین کی واحد مخصوص نشست بھی نیپ نے جیت لی۔ میر گل خان نصیر بھی چاغی سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔

یکم مئی ۱۹۷۲ء کو نیپ اور جمعیت علماء اسلام نے صوبائی اسمبلی کیلیے جو مخلوط کابینہ تشکیل دی میر گل خان نصیر بھی اس کابینہ میں سینئر وزیر کی حیثیت سے شامل تھے۔ ابتداء میں انھیں تعلیم، صحت، سماجی بہبود،

بلدیات، محنت، اطلاعات وسیاحت کے محکمے دیئے گئے اور بعد میں کچھ ردو بدل کے ساتھ تعلیم، صحت وسماجی بہبود کے محکمے انکے پاس رہے۔

۱۵ فروری کو صدر پاکستان نے ایک خاص حکم کے ذریعے بلوچستان کی منتخب صوبائی حکومت کو غیر جمہوری انداز میں توڑ کر صوبے میں گورنرراج نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ اس غیر آئینی اور غیر جمہوری اقدام کے خلاف صوبہ سرحد کی حکومت بھی احتجاجاً مستعفی ہوگئی۔ (44)

پاکستان نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی:

پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ میں جنرل یحییٰ خان نے نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی عائد کر دی اور جب ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ کو ذولفقار علی بھٹو نے جنرل یحییٰ خان سے اقتدار حاصل کیا تو اُس نے نیشنل عوامی پارٹی پر عائد پابندی ایک حکم کے ذریعے ختم کر دی (45)۔ دوسری مرتبہ ۱۰ فروری ۱۹۷۵ کو حکومت پاکستان نے نیشنل عوامی پارٹی کو خلافِ قانون قرار دیا اور اُسکی تمام املاک اور فنڈ ضبط کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کی ایک فل بنچ نے اس فیصلے کی توثیق بھی کی (۳۰ اکتوبر ۱۹۷۵)(46)

نیپ کی منتخب حکومت کو برخاست کرنے اور اسے سیاسی

عمل سے دور رکھ کر اس پر پابندی عائد کرنے کے بعد بیشتر قائدین وارا کین گرفتار کر لیے گئے اور ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ ان میں میر گل خان نصیر بھی شامل تھے۔ نو جنوری ۱۹۷۳ کو میر گل خان نصیر کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۲۶ جون تک انھیں کوئٹہ چھاؤنی کے حوالات میں رکھا گیا۔ اسکے بعد مچھ اور پھر حیدرآباد جیل منتقل کر دیا گیا۔(47)

۱۹۷۷ میں جب جنرل ضیاء نے پیپلز پارٹی کی حکومت کو برخاست کر کے خود عنانِ اقتدار سنبھال لی تو اس نے پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے تمام اکابرین وارا کین (جو تقریباً ساٹھ کے قریب تھے) کے خلاف قائم کردہ مقدمات واپس لے لیئے اور انھیں بری کر دیا۔(48)

جیل سے رہا ہونے کے بعد میر غوث بخش بزنجو، میر گل خان نصیر، سردار عطاءاللہ خان مینگل اور نیپ کے بہت سارے قائدین و ارا کین نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (NDP) میں شامل ہو گئے۔ پارٹی میں کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ عبدالولی خان اور ان اکابرین میں افغانستان کے انقلاب کے مسئلے پر اختلافات پیدا ہو گئے۔ این ڈی پی چھوڑ کر ان اکابرین نے کراچی میں اپنی ایک کنونشن طلب کر لی اور ''پاکستان نیشنل پارٹی'' کے نام سے اپنی ایک الگ پارٹی کا اعلان کر دیا۔(49)

محمد خان رئیسانی، محمد ہاشم خان غلزئی، آغا عبدالکریم خان، ظاہر شاہ
میر گل خان نصیر، شیر محمد مری، محمد یوسف پیر علی زئی اور مولانا شمس الدین
جشنِ افغانستان کے سلسلے میں

سیاسی نظریات:

جس وقت میر گل خان نصیر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے بلوچستان سے نکل کر لاہور چلے گئے۔ تاریخ کے ساتھ ان کا رابطہ اسی وقت شروع ہوا یہ وقت پورے ہندوستان میں سامراج دشمن، قوم پرست اور ترقی پسند انقلابی تحریکوں کا وقت تھا۔ سویت یونین میں انقلابی تشکیلات واستحکام کا دور تھا اور لاہور جو علم وادب، شعور وآگہی، تحقیق وتخلیق، سیاسی، سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کا محور ہوتا تھا۔ اس قسم کے حالات ومعروضات نے میر گل خان نصیر کے ذہن میں ہیجان پیدا کر دیئے۔ انہی ادوار میں میر گل خان نصیر کی سیاسی فلاسفی کے خدوخال نمودار ہونا شروع ہوئے۔ انکے تصورات و خیالات اور ذہنی سمت کا تعین مضبوطی اور استحکام کے ساتھ آگے بڑھنے لگا جس نے آہستہ آہستہ مضبوط وموثر سیاسی نظریہ اور نظریاتی جھکاؤ کا روپ دھار لیا۔(50)

جس وقت میر گل خان نصیر لاہور سے واپس بلوچستان آئے تو یہاں سیاسی تحریکات کے خدوخال نئے سرے سے تشکیل پا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ روایتی اندازِ سیاست ترک کی جا رہی تھی۔ سیاست کیلئے

نظریاتی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں۔ نواب یوسف علی خان مگسی اور میر عبدالعزیز کرد سیاسی شناخت کیلئے میدان میں سرگرم عمل تھے۔

اس وقت بلوچستان میں انگریز مکمل طور پر سیاہ وسفید کے مالک تھے اور وہ اپنی حکومت کو مزید تقویت دینے اور مستحکم کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ عوام کیلئے حقِ حکمرانی کا کوئی وسیلہ نہیں رہ گیا تھا۔

قبائلیت کے بوسیدہ ہتھکنڈے انگریزوں کیلئے حکمرانی کرنے کا راستہ مزید ہموار کر رہا تھا۔ سردار مقامی اور شاہی جرگوں میں بیٹھ کر ان کی بھرپور نمائندگی کا حق ادا کر رہے تھے۔ عوام کیلئے معاشی ومعاشرتی ترقی کے امکانات تقریباً معدوم کیے جا چکے تھے۔ ان صورتحال سے آنکھیں چرانا ایک بیدار مغز نوجوان کیلئے ناممکن تھا۔ ایک حساس، روشن فکر اور باشعور شخص کیلئے ان حالات سے متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ لہذا امیر گل خان نصیؔر نے بھی نوجوانوں کی اُس تحریک سے اثر قبول کیا جسکی قیادت نواب یوسف علی خان مگسی اور میر عبدالعزیز کرد کر رہے تھے۔

”آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ اس زمانے میں سیاست کا نام لینا کتنے دل گردے کا کام تھا۔ آپ لوگوں میں سے اکثر نے وہ زمانہ نہیں دیکھا جبکہ بلوچستان پر انگریز لاٹ صاحب کی حکومت تھی اور بلوچستان کے قبائلی

سرداران کی بگھی تک کو کھینچنے سے دریغ نہیں کیا کرتے تھے اور اسے سرکار کی ایک قابل فخر اور قابلِ احترام خدمت سمجھتے تھے۔ سیاسی کام کرنا، کوئی سیاسی جماعت بنانا، کسی سیاسی جماعت میں حصہ لینا تو دور کی بات تھی، ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں شائع ہونے والے اخباروں کا پڑھنا بھی بلوچستان میں تخریب کاری کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔...... بلوچستان کی اس پر آشوب اور پر خطر فضاء میں، میں نے ملازمت کو خیر باد کہہ کر ان مجاہد ساتھیوں کا ساتھ دیا۔ جو تن من دھن سے سیاست کے میدان میں کود پڑے تھے وہ آزادی وطن کا نعرہ لگاتے ہوئے سرکارِ برطانیہ اور اس کے حواری قبائلی سرداروں کے مقابلے میں سینہ سپر ہو کر ڈٹ گئے تھے۔" (51)

ان حالات میں سیاسی جدوجہد کا حصہ بننا نہ صرف صبر آزما اور جرأت طلب کام تھا بلکہ یہ ایک ایسا جان لیوا عمل بھی تھا جسکا آج کے دور میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

"گل خان نصیر ایک ایسے دانشور تھے جنکا راستہ جیل کی سلاخیں بھی نہ روک سکیں، جنھوں نے علم و ادب اور زندگی کے گہرے شعور کے ساتھ پہلے قوم کے درد کو سمجھا پھر سیاست کی وادی پر خار میں قدم رکھا۔ وہ ایک ایسے سیاسی رہنما تھے جنکے سامنے زندگی کا ایک واضح نصب العین تھا جو حقوق اور جاہ طلبی

کی بجائے اپنے فرائض کا ادارک رکھتے تھے۔'' (52)

میر گل خان نصیر تبدیلی کا خواب لیے ایک ایسے سماج کی تشکیل کیلئے سرگرم عمل تھے جس میں استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی کوئی شکل باقی نہ ہو، معاشرتی انصاف اور معاشی ترقی ہر کسی کیلئے ہو، غرض اُن کا خواب اپنے ملک کی ترقی اور قوم کی خوشحالی کا خواب تھا۔

''وہ چاہتے تھے کہ ملک میں ایک ایسا انقلاب آئے، ایک ایسی صورت جنم لے کہ بلوچوں کو معاشی وسماجی استحصال سے آزادی ملے۔ اس کیلئے وہ چاہتے تھے کہ مظلوم طبقہ یعنی بزگر یا شوانگ یا نادار طبقہ اپنی بے بسی کی زنجیروں کو توڑ دے اور ملک کے اقتدار اور خوشحالی میں اپنے آپ کو برابر کا حصہ دار بنائے۔'' (53)

انھوں نے سیاسی میدان میں سرگرم رہ کر اپنے آدرشوں کا بھرپور انداز میں پرچار کیا اور ساتھ ساتھ بلوچوں کو بحثیت قوم ان کے حقوق سے آشنائی و آگاہی دلانے اور جاگیردار دشمن اور قبائلیت کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے اور قوم پرست وطن دوست جذبات واحساسات کو ابھارنے میں انھوں نے شاعری کو بھی وسیلہ بنایا۔

''وہ بلوچستان کے عوام کی زندگی اور سماج کو بدلنا چاہتے تھے اور جو بلوچستان کی زندگی بدلنا چاہتا ہے وہ پورے پاکستان کے سماج کی زندگی کو بدلنا

چاہتا ہے کیونکہ بلوچستان کا کثیر طبقہ ورکنگ کلاس پر مشتمل ہے۔اس کے پاس سوائے محنت بیچنے کے اور کوئی قوت نہیں ہے۔پاکستان کے چاروں صوبوں میں، بلوچستان سب سے پسماندہ صوبہ ہے۔سماجی سیاسی اور معاشی اعتبار سے۔باوجود اسکے کہ اس میں معیشت کے وہ خزانے موجود ہیں جو پورے پاکستان کو خوشحال بنا دیں۔گل خان نصیر بلوچستان کے عوام کو معیشت، سیاست اور سماج کے تشدد سے نجات دلانا چاہتے تھے جو بلوچستان کے عوام کو اس تشدد سے نجات دلانا چاہتا ہے۔وہ پورے پاکستان کو اس تشدد سے نجات دلانا چاہتا ہے۔(54)

جس مشن اور مقصد کو بنیاد بنا کر میر گل خان نصیر نے اپنا سیاسی لائحہ عمل طے کیا انھیں اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ اس راستے پر پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹے ہی کانٹے بچھے ہونگے لیکن انھوں نے ان تمام مشکلات کو سر کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔انھیں عوامی سیاست کرنے کی پاداش میں کئی دفعہ جیل بھی جانا پڑا بلکہ انکے بہترین ایام جیل کی نذر ہوئے انھیں جلاوطنی کے دن بھی دیکھنے پڑے۔

"۱۹۴۱ سے ۱۹۷۳ تک مجھے کئی بار جیل جانا پڑا۔اس عرصے میں کوئی سال ایسا نہیں گیا جس میں مجھے جیل کی زیارت نہیں کرنی پڑی۔نوشکی، مستونگ،

قلات، مچ، کوئٹہ، کلی کیمپ، کراچی، ساہیوال اور حیدر آباد کے جیل خانوں میں مجھے جو مدتیں گزارنی پڑیں ان سے اگرچہ جسمانی بیماریاں کئی لگ گئیں۔ سیاسی مزاج میں یاس واُمید کے کئی دور آئے اور گزر گئے۔ لیکن میری شاعرانہ کیفیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔" (55)

انھیں جیل میں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں مگر انھوں نے اپنی سیاسی آدرشوں کو ایک لمحے کیلئے بھی فراموش نہیں کیا۔ یہ مشکلات و مصائب ان کے خاندان کو بھی جھیلنے پڑے مگر انھوں نے بھی صبر سے کام لیا۔ ان کے بھائی میر لونگ خان کو شہید کر دیا گیا۔ تب بھی انھوں نے اپنے مقاصد سے پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیا۔

جب حکمرانوں اور ان کے آل کاروں کو پختہ یقین ہوا کہ اسطرح میر گل خان نصیر کو جدوجہد سے نہیں ہٹایا جا سکتا تب انھوں نے میر گل خان نصیر کو انعام واکرام اور آرام وآسائشوں کی جانب متوجہ کیا۔

"ایک طرف عوام میں انکی مقبولیت اور ہر دلعزیزی بڑھتی جا رہی تھی اور دوسری جانب سرداری نظام کے پرستار اور فرسودہ نظام کے محافظ ان کی اس مقبولیت سے پریشان تھے۔ چنانچہ بہت بہت دور اولمپس کی بلندیوں سے ریٹس کے ایلچی ہرمیز کو، گل خان نصیر کو اس راہ سے بھٹکانے کیلئے جس کا مقصد پرامی تھیس کی

طرح انسانوں میں آگ کی روشنی پھیلاتا تھا، مقرر کیا گیا۔ گل خان نصیر کو انعام و اکرام اور آسائشوں و نعمتوں کا راستہ بتایا گیا۔ اگر وہ اپنا نصب العین ترک کر دیتے تو وہ تمام نعمتیں ان کے قدموں میں نچھاور کی جاتیں بہ صورت دیگر پرامی تھیس کی طرح زنجیریں اور قید و بند کی صعوبتیں ان کا مقدر ہو گئی تھیں۔" (56)

تبدیلی کیلئے جدوجہد کرنے والے لوگ اپنی آدرشوں کے سہارے جیتے ہیں۔ عام زندگی میں انھیں معاشی تنگدستی کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ میر گل خان نصیر کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا مگر انھوں نے ان حالات میں بھی سیاست سے دست بردار ہونے یا تھک کر بیٹھ جانے کا نام نہیں لیا۔

"گل خان جیسے شاعر اور بڑے سیاست کار جو اپنے پیش رو ادیبوں اور مجاہدوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ تو اکثر اس بلند قماش کے لوگ اپنی زندگی میں معاشی مشکلات کا شکار ہو کر بہت بے دردی سے زندگی گزارتے ہیں۔ چنانچہ ان ہی عظیم لوگوں کی روایت کے مطابق گل خان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ (57)

میر گل خان نصیر نے آخری وقت تک اپنے سیاسی اصولوں اور نظریات سے روگردانی نہیں کی۔ وہ چونکہ اپنے عوام اور اپنے وطن سے کمٹ منٹ رکھتے تھے۔ اس لیے وہ اس کمٹمنٹ کو توڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

انکا کہنا تھا۔

"بڑے خطرے کے پیش نظر انساں ہمیشہ دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے۔ یا پیچھے رہ کر بھاگ جاتا ہے۔ یا پھر

مقابلے کیلئے تیار رہتا ہے۔اور ہم مقابلے کیلئے تیار ہیں۔''

سیاسی جدوجہد میں کامیابیاں اور ناکامیاں:

میکس ویبر (۱۸۶۴-۱۹۲۰) ''سیاست ایک پیشہ'' میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک سیاستدان کے مقصد کی نوعیت اسکے اپنے ایمان پر منحصر ہوتی ہے۔اس کا مقصد قومی بھی ہوسکتا ہے اور انسانی بھی۔سماجی بھی ہوسکتا ہے اور اخلاقی بھی۔ثقافتی بھی ہوسکتا ہے اور روحانی اور مذہبی بھی۔وہ اپنے عقیدے میں ترقی پسند بھی ہوسکتا ہے وہ کسی نظریئے کا علمبردار بھی ہوسکتا ہے یا اسکی اصولی مخالفت کرکے روزمرہ زندگی کے خارجی مقاصد حاصل کرنے کی سعی کرسکتا ہے۔بہرکیف اسکا کسی نہ کسی بات پر ایمان و ایقان ہونا چاہیئے۔اگر ایسا نہ ہوا تو بڑی سے بڑی سیاسی کامیابی بھی انسان کی خطاپذیری اور بےاثری کا شکار ہوجاتی ہے(58)۔

میر گل خان نصیرؔ نے اپنی زندگی کے پچاس برس سیاست کی نذر کیئے۔اس طویل سیاسی زندگی میں میر گل خان نصیرؔ کو طرح طرح کے تجربات و مشاہدات کا سامنا رہا۔انھوں نے جسطرح کی سیاسی جدوجہد کی اور جسطرح کی سیاست کو رواج دیا اسکی حثیت اس لیے منفرد تھی کہ وہ ہر محاذ پر

موجود تھے اگر سیاسی بندشیں تھیں تو انھوں نے اپنے نظریات کی تشہیر اپنے اشعار کے ذریعے کیے۔ صحافت میں بھی انھوں نے یہی اصول اپنائے رکھا۔ وہ بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ جدوجہد کے ان طویل ادوار میں انھیں اختلافات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

پہلی دفعہ اس وقت جب قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی اور عبدالعزیز کرد کو بہ وجہ ملازمت اسکے پارٹی عہدے سے جذباتی انداز میں سبکدوش کیا گیا۔ تب اُن کی سرگرمیوں میں بھی ست روی آئی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ پھر فعال کردار ادا کرنے لگے جب ملک عبدالرحیم خواجہ خیل نے پارٹی قیادت سنبھال لی۔ وہ سیاست اور پارٹی سے اس حد تک کمٹمنٹ رکھتے تھے کہ پارٹی کے فیصلوں کی روشنی میں اُنکو اپنی ملازمت بھی ترک کرنی پڑی۔ یہ انکا سیاسی خلوص تھا کہ جب پارٹی نے بلوچستان کے مختلف علاقوں کے دوروں کا پرگرام بنایا تو میر گل خان نصیر کو جھالاوان جانا پڑا۔ خضدار میں کئی اجتماعات منعقد کیے۔ حکمرانوں کو یہ بات بری لگی۔ انھوں نے حکم صادر کر دیا کہ میر گل خان نصیر کو سواری کیلئے کوئی اپنی گاڑی نہیں دے گا۔

بھلا کس میں جرات ہوتی جو حکمرانوں کے غیض وغضب کو دعوت دیتا انھیں

سواری نہیں ملی اور انھوں نے خضدار سے قلات تک کا فاصلہ پیدل طے کر لیا۔(59)

ایک دفعہ صحافتی میدان میں بھی میر گل خان نصیرؔ اور لالہ غلام محمد شاہوانی کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ میر گل خان نصیرؔ کے بقول جب ''نوائے بلوچستان'' بند ہوا تو ہم کچھ مہینوں کیلئے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے لیکن پھر ہفت روزہ ''نوائے وطن'' جس کا ڈیکلریشن انھوں نے خود اپنے نام سے لیا تھا۔ مجھے مرحوم میر غلام محمد کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ہمارے سیاسی اصولوں میں تھوڑا فرق پیدا ہونے لگا۔ میری خاطر میر غلام محمد نے نوائے وطن چھوڑا اور روز نامہ اتحاد کے ساتھ وابستہ ہو گئے لیکن جو بنیادی اختلاف ہم دونوں میں پیدا ہو چکی تھی اس میں روز بہ روز شدت آتی رہی۔ اس وقت جب تک مجھے نوائے وطن میر غلام محمد اور رواجہ عبداللہ جان جمالدینی کیلئے چھوڑنا پڑا۔ مرحوم کے ساتھ یہ میرا پہلا اور آخری اختلاف تھا جو بلوچستان کے اس وقت کے حالات کے تناظر میں پیدا ہوا تھا۔

میر غلام محمد اور انکے ہم خیال دوست نواب گورمانی کی اس تجویز کے حق میں تھے جسکی رو سے ریاست قلات کو توڑ کر بلوچستان کے

صوبے میں ضم کرنا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب خان اور سردار نا قابل اصلاح ہو چکے ہیں۔ بلوچ اور بلوچستان کا مفاد اسی میں ہے کہ پہلے ان کو راستے سے ہٹانا چاہیئے۔

لیکن میں اس عمل کو بلوچوں اور بلوچستان کیلئے تباہ کن دیکھ رہا تھا۔ اس لیے میں اس فارمولے کے حق میں نہیں تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس صورتحال میں ایک تو بلوچستان میں رہنے والے اوگان ہمیشہ کیلئے یہیں رہ جائیں گے اور دوسری بات یہ کہ ہم قدیم بلوچستان کے تاریخی حد بندیوں سے جو ۱۸۷۶ء کے معاہدے اور دستاویزات کی روشنی میں جو برطانوی حکومت اور خان قلات کے مابین طے پائے تھے، محروم رہ جائیں گے ہم چاہتے تھے کہ بلوچستان کے بلوچ علاقوں کو قلات کے ساتھ ملا کر قلات کو بلوچستان کا نام دیا جائے۔ بحرحال ہمارے اختلافات کا بنیادی سبب یہی تھا مجھے اقرار کرنا پڑے گا کہ دوران اختلاف مرحوم میر غلام محمد نے شرافت اور دیانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ہمارے دلوں میں اپنے لیے دگنے عزت اور وقار حاصل کرلیا۔(60)

قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے پلیٹ فارم سے اور بعد میں لالہ غلام محمد شاہوانی کے ساتھ میر گل خان نصیر نے جو اختلافات رکھے وہ اصولوں کی بنیاد پر پیدا شدہ اختلافات تھے لیکن ان اختلافات کو

ذاتی بغض وعناد تک کوئی بھی فریق نہیں لے گیا۔ ہر ایک اپنے اصولی موقف پر کام کرتا رہا۔

نیپ کے اکابرین جب جیل میں پابند سلاسل تھے اس وقت ملکی سیاسی صورتحال اور نیپ کی حکمت عملی کے حوالے سے ان میں آپس میں اختلافات پیدا ہو گئے اور جب جنرل ضیاء الحق نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹ دیا اور خود حکمران بن گئے تو اس نے نیپ کی قیادت کو جیل سے رہائی دی۔ جیل سے رہا ہوتے ہی ان اکابرین کے اختلافات سامنے آ گئے۔

''جیل سے نکل کر میر غوث بخش بزنجو اور میر گل خان نصیر کوئٹہ میں نیپ کے دفتر گئے اور خیر بخش مری، شیر محمد مری، عبدالواحد کرد اور دوسرے نوجوان اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔'' (61)

نیپ کی قیادت میں تلخیاں موجود تھیں کہ انہی ایام میں جنرل ضیاء الحق نے پہاڑوں پر چلے جانے والوں کیلئے عام معافی، مقدمات واپس لینے اور انکے نقصانات کا ازالہ کرنے کا اعلان کیا۔ میر غوث بخش بزنجو، سردار عطاللہ خان مینگل اور میر گل خان نصیر جنرل ضیاء کے اس اعلان کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ کیونکہ اسی دوران مری مینگل اور دوسرے قبائل کے لوگ جو افغانستان چلے گئے تھے انکی طرف سے بھی اپنی قیادت کو مسلسل اس قسم کے خطوط آ

رہے تھے کہ ''ہم یہاں پر بہت تنگ ہیں یا ہمیں بلوالیں تا کہ لڑیں اور شہیدوں میں شامل ہو جائیں یا پھر چاہے گرفتار ہو جائیں ۔ بحرحال یہاں وسائل نہیں ہیں۔'' یہ لوگ اپنے عوام کو کچھ کمپن سیشن دینا چاہتے تھے۔ جب لوگ پہاڑوں سے اتر کر اپنے اپنے گھروں میں آ گئے تو اسی دوران میر گل خان نصیر اور بزنجو صاحب کے خلاف کچھ لوگوں کی طرف سے یہ الزمات سامنے آ گئے کہ ان دونوں نے ملکر لوگوں کا خون بہایا ہے۔ اور اب ان کی لاشوں پر سودا بازی کرنا چاہتے یہ منفی مہم جوئی تھی۔(62) جو میر گل خان نصیر کے خلاف شروع کی گئی تھی انکے جواب میں میر گل خان نصیر کا اپنا کہنا تھا۔

''جو لوگ ہم لوگوں کے خلاف باتیں کرتے ہیں ان میں کچھ لوگ وہ ہیں جنھوں نے ٹارچر کیمپوں میں معافی نامے لکھ کر دیئے۔ کمزوری دکھا کر دوستوں کو گرفتار کرایا۔ یا ان کے خلاف بیان دیئے۔ عدالتوں اور پولیس کے فائل اس بات کی گواہ ہیں۔ وہ آج ہمیں کہتے ہیں کہ، ہم قوم فروش ہو گئے ہیں اور وہ انسان دوست اور قوم دوست ہو گئے ہیں جبکہ ہم نے یہ فیصلہ حکومت کے اعلان نامے اور پہاڑوں پر گئے ہوئے دوستوں اور ساتھیوں کے خطوط اور مشوروں کی روشنی میں کیا ہے۔(63)

انہی اختلافات کے ساتھ وہ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہو گئے لیکن زیادہ عرصے تک میر گل خان نصیر، میر غوث بخش بزنجو اور

سردار عطاالله مینگل این ڈی پی میں نہیں رہ سکے۔ کچھ تنظیمی اور سیاسی امور پر اختلافات کی وجہ سے انہوں نے این ڈی پی کو خیر باد کہہ دیا۔ ان اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے میر غوث بخش بزنجو کہتے ہیں۔

”نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (NDP) میں افغان انقلاب پر میرے اور ولی خان صاحب کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ وہ اس انقلاب کی مخالفت کرتے تھے جبکہ میں اس انقلاب کے حق میں تھا۔“ (64)

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی سے نکلنے کے بعد ان قائدین نے کراچی میں اپنے کنونشن کے انعقاد کا اعلان کیا اور وہاں ایک کانفرنس طلب کرلی جسکے نتیجے میں ”پاکستان نیشنل پارٹی“ معرض وجود میں آئی۔ (65)۔

پھر اسی اثناء میں سردار عطاالله مینگل لندن چلے گئے اور نواب خیر بخش مری بھی بیرون ملک روانہ ہوئے۔

اب میر گل خان نصیر پاکستان نیشنل پارٹی کے پلیٹ فارم سے جدوجہد میں مصروف تھے۔ وہ پارٹی کے صوبائی (بلوچستان) صدر تھے۔ اس دوران کچھ اور قسم کے اختلافات ابھر کر سامنے آئے۔ ان اختلافات کا تذکرہ میر غوث بخش بزنجو یوں کرتے ہیں۔

میر گل خان نصیرؔ کا یہ خیال تھا کہ مارشل لاء طول کھینچے گی اور ہمارے لوگ جنگ کی وجہ سے معاشی طور پر انتہائی پست ہو چکے ہیں لہذا ہمیں اپنی تلخیوں کو کم کرنا چاہیے۔ ایک ایسا راستہ نکالنا چاہیے کہ لوگوں کو کچھ سہولیات اور مراعات مل سکیں۔ اسی سلسلے میں اس نے گورنر بلوچستان سے ملاقات کی اور کچھ ''بیانات'' بھی دیئے۔ اس سلسلے میں، میں نے سختی سے میر گل خان نصیرؔ کو منع کیا کہ ہماری سیاسی پارٹی کی اپنی ایک شناخت اور کریکٹر ہے، پارٹی کا یہ طرزِ عمل آپکے طرزِ فکر سے ہم آہنگ نہیں ہے اور پارٹی کا لوگوں کی نظروں سے گرنے کا بھی امکان ہے لہذا آپ اپنے رویئے میں تبدیلی لائیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ ایک بھائی ہونے کے ناطے میرا آپ کو مشورہ ہے کہ آپ پارٹی کے عہدے سے مستعفی ہو جائیں۔ (66)

میر گل خان نصیرؔ نے استعفیٰ دیا یا انھیں پارٹی سے نکال دیا گیا اس سلسلے میں میر گل خان نصیرؔ کی بیٹی رقمطراز ہیں۔

''پھر ایک دن ایسا آیا کہ کہ انھیں پارٹی کے صدر کی طرف سے ایک لیٹر موصول ہوا۔ (شاید میری جمع پونجی میں موجود ہے) کہ آپکی باتیں اور حرکات پارٹی منشور کے خلاف ہیں۔ لہذا میں آپکو پارٹی سے نکال دیتا ہوں۔ بابا کو اس بات کا بہت افسوس ہوا۔ نوبت اخباروں میں بیان بازی

تک پہنچ گئی۔ اسے باتیں سنائی گئیں اور بے نام خطوط بھیجے گئے کہ آپکو قتل کر دیا جائے گا۔"(67)۔

اس طرح غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر کے پارٹی قیادت نے میر گل خان نصیؔر کو پارٹی سے الگ کر دیا۔ انھیں کسی ایسے فورم میں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا جہاں وہ پارٹی قائدین کو قائل کر سکتے۔ میر گل خان نصیؔر پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلانے پر زور دے رہے تھے۔

"ایک دن بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش ہو رہی تھی کہ میر بزنجو اکیلے ہمارے گھر آ گئے۔ دونوں دوستوں کی لمبی چوڑی بحث و تکرار ہوئی۔ بابا نے کہا کہ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کرلو اور مجھے اپنی صفائی کا موقع فراہم کرنے دو۔ اگر مجھے قصوروار ٹھہرایا گیا تو بے شک مجھے پارٹی سے نکلنا منظور ہے۔ وگرنہ صرف حکیم لہڑی یا یوسف مستی خان کے کہنے پر آپ مجھے کیسے پارٹی سے نکال سکتے ہیں۔ لیکن میر صاحب ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلانے کے حق میں نہیں تھے۔ آخر میں آغا نصیر خان پہنچ گئے۔ بہت ساری باتیں انکے سامنے بھی ہوئیں۔ پھر آغا صاحب نے میر صاحب کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر پہنچا دیا۔"(68)۔

کیا میر گل خان نصیرؔ کو صرف گورنر سے ملنے یا اخباری بیانات جاری کرنے کی پاداش میں پارٹی سے نکال دیا گیا؟

لال بخش رند، میر گل خان نصیرؔ سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بزنجو کا نام لیے بغیر کہنے لگے کہ ''لالہ دیکھو کمال تو یہ ہے کہ مجھ پر وہ لوگ اعتراض کرتے ہیں جو خود امریکہ کے دوستوں محمود ہارون اور امیر علی فینسی جیسے سرمایہ داروں سے ملنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ اگر میں چیف سکریٹری یا گورنر سے ملتا ہوں تو وہ معترض ہوتے ہیں۔'' پھر وہ اس قدر ذاتی عناد پر اتر آئے کہ وہ میر غوث بخش بزنجو کے بالکل خلاف ہوگئے۔'' (69)

گورنر بلوچستان اور چیف سکریٹری بلوچستان سے ملنے کیلئے وہ کیوں جاتے تھے؟ اسی بات کو میر گل خان نصیرؔ کے رفیقِ کار لال بخش رند منظرِ عام پر لاتے ہیں۔

''جو لوگ پہاڑوں پر چلے گئے تھے، ان کے معاملات کے سلسلے میں، وہ جو حکومت کے لوگوں، چیف سکریٹری اور دوسرے افسران سے ملنے جاتے تھے۔ اسی عرصے میں بلوچستان کے چیف سکریٹری جو نئے مقرر ہوئے تھے، وہ میر گل خان نصیرؔ کے پرانے دوست تھے۔ اس سے میر

صاحب کے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ اس وقت بلوچستان کے گورنر، جنرل رحیم الدین تھے۔ چیف سکریٹری نصر من اللہ صاحب نے میر گل خان نصیر سے اپنے مراسم کو تازہ کیا اور ذاتی دلچسپی لے کر پہاڑوں سے واپس آنے والے لوگوں کے مقدمات اور دوسرے معاملات کو سلجھانے میں میر صاحب کی مدد کی۔" (70)

جن بیانات کو بنیاد بنا کر میر گل خان نصیر کی کردار کشی کی گئی

ان میں سے پہلا بیان مہر اللہ مینگل، گوھر خان زرکزئی اور میر گل خان نصیر کے نام سے مشترکہ طور پر ایک اخبار میں چھپا۔ بیان اسطرح تھا کہ "بلوچستان کی موجودہ حکومت، بلوچستان میں ترقیاتی کام کر رہی ہے۔" پھر اسی دوران ایک اور بیان چھپا کہ میر گل خان نصیر نے گورنر بلوچستان کے بارے میں کہا ہے کہ "وہ بہت اچھا اور شریف آدمی ہے اور اس کے دور میں بلوچستان ترقی کی راہ پر گامزن ہے"۔ ان دو بیانات کے چھپنے کے بعد میر گل خان نصیر کے نام سے منسوب ایک اور بیان اخبارات کی زینت بنا کہ "ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں ہم پر بہت ظلم ڈھائے گئے تھے لیکن جنرل ضیاء الحق کے دور میں ہم پر مظالم نہیں ہو رہے"۔ ان بیانات کے چھپنے کے بعد میر صاحب کے خلاف منفی پروپیگنڈے میں مزید شدت آئی۔ میر گل خان

نصیراپنے ان بیانات کے سلسلے میں کیا کہتے ہیں لال بخش رند کی زبانی۔

''ان ہی دنوں، کوئٹہ میں، میں نے میر صاحب سے اس بارے میں پوچھا تھا انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ ''گورنر کی تعریف میں روزنامہ ''جنگ'' کوئٹہ میں، میرے بیان کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ایک محفل میں ''جنگ'' کوئٹہ کے نمائندے نے میرے قریب آ کر مجھ سے پوچھا کہ ''میر صاحب آج کل بلوچستان میں جو تعمیراتی کام ہو رہے ہیں کیا آپ اس سے خوش ہیں؟'' تو میں نے بس اتنا ہی جواب دیا تھا کہ ''ہاں! ٹھیک ہی ہے۔'' اس پر جنگ کے نمائندے نے اپنی جانب سے نیوز بنا کر چھاپ دی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ اخبار کا نمائندہ اسطرح کی بددیانتی کرے گا۔ میر گل خان نصیر نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ''میں نے جنگ کوئٹہ کے نمائندے کی اس حرکت پر اپنی جانب سے ایک تردیدی بیان لکھ کر اخبار کو دیا۔ مگر اخبار والوں نے میرا یہ بیان نہیں چھاپا''۔ جس محفل میں میر صاحب سے جنگ کوئٹہ کے نمائندے کی یہ بات ہوئی، اس میں گورنر صاحب اور چیف سکریٹری بھی شریک تھے۔'' (71)

اس طرح کی صورتحال یا تو غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوئی یا پھر اس میں شعوری طور پر میر گل خان نصیر کو سیاست سے الگ کرنے کا منصوبہ کارفرما تھا؟

میر گل خان نصیر نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ شدید مصائب و آلام میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے اور طرح طرح کے صدمے جھیلتے ہوئے گزارا۔ مفاہمت کے دروازے اس وقت بھی کھلے ہوئے تھے اور اگر وہ چاہتے تو دوسرے بہت سارے لوگوں کی طرح مفاہمت اور سمجھوتے کا راستہ اختیار کر کے وہ تمام تر ذاتی فوائد حاصل کر سکتے تھے۔ جنکے پیچھے اہل غرض بھاگتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس وقت ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے بڑی سخت کوش اور بے داغ زندگی گزاری اور اپنے دامن کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اس معاملے کو غیر جذباتی انداز میں سمجھنے اور اسکا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ (72)

تو کیا میر گل خان نصیرؔ کی تمام جدوجہد، انکی پوری سیاسی زندگی، شاعری اور ادب کیلئے خدمات، حب الوطنی محض ان نام ونہاد بیانات کی بھینٹ چڑھ گئیں؟

''میر گل خان نصیرؔ نے اپنی پوری عمر قومی حقوق کے حصول کیلئے گزاری مگر ان کے آخری سالوں میں بیانات سے کچھ احباب خفا ہیں۔ یہ حق ان کو حاصل ہے مگر میر گل خان نصیرؔ کی پوری زندگی کے چند بیانات کو بنیاد بنا کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے کتنے اختلاف کیوں نہ ہوں۔ انکی ماضی

کی خدمات اور قربانیوں کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

...... یہ گل خان کے ساتھ سراسر زیادتی اور تاریخ میں ناانصافی ہوگی۔ آخر ہمارے پاس کیا جواز کہ ہم ایک عظیم قومی رہنما، شاعر اور سیاست دان کے آخری ایام کے بیانات پر اتنے سیخ پا ہوں۔ جبکہ آج بھی کئی شخصیات ہیں جو ہر قسم کے اخباری بیانات دیتی رہی ہیں اور آج بھی وہ ہر طرح کے بیانات دیتے رہتے ہیں۔ ان پر کیوں سیخ پا نہیں ہوتے۔'' (73)

اس بات کو آج تک کوئی ثابت نہیں کر سکا کہ میر گل خان نصیر نے اپنے سیاسی مقاصد سے انحراف کیا یا انھوں نے اپنی ترقی پسندانہ اور انقلابی روش کو تبدیل کیا۔ یا حکومت وقت کے ہمنوا بن کر اپنے لیے مفادات حاصل کیئے۔ انھوں نے آخر تک ثابت قدمی، راست بازی اور جرات کا مظاہرہ کر کے اپنے سیاسی اہداف کا دفاع کیا۔ وہ زندگی بھر سچائی کے راستے پر گامزن رہے۔ لیکن سیاست کے میدان میں سرگرم ایک مخصوص طبقے نے جان بوجھ کر انھیں راستے سے ہٹانا چاہا اور انکے دل کو بہت دکھ پہنچایا۔

''انکی زندگی کے آخری دنوں میں کوئٹہ میں ان کے داماد آغا ظاہر احمد زئی کے گھر پر، میں نے ان سے مزاقاً کہا کہ ''میر صاحب، اب آپ آفاقی شاعر بن گئے ہیں۔ آپ اپنی آفاقی شاعری سے مرنے سے پہلے بلوچی ادب کے دامن کو خوب مالا مال کیجیئے!'' میری یہ بات سن کر وہ سنجیدہ ہو

گئے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بہت دردمندانہ لہجے میں کہنے لگے۔ ''کیا بتاؤں، اب تو شاعری کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔'' ایک ساعت خاموش رہ کر پھر کہا'' حالات اور لوگوں نے میرے دل کو بہت دکھایا ہے۔''(74)

انکا حکومتِ وقت سے سمجھوتہ نہ کرنے، اپنی آدرشوں پہ ڈٹے رہنے، بااصول سیاست کرنے جیسی خوبیوں کے سبھی قائل ہیں اور میر غوث بخش بزنجو بھی ان الفاظ میں ان باتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

''مجھے اس بات پر کوئی شبہ نہیں کہ میر گل خان نصیرؔ جیسے لوگ نہ حالات اور حکومت وقت سے سمجھوتہ کرتے ہیں اور نہ اپنے اصولوں سے دستبردار ہوتے ہیں۔ وہ بہت ہی مخلص اور بہادر ساتھی تھا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ میر گل خان نصیرؔ بک گئے یا اس نے مارشل لاء سے سمجھوتہ کرلیا یا وہ اپنے اصولی سیاسی راستے سے ہٹ گئے۔ یہ تمام غلط، جھوٹ اور بے بنیاد باتیں ہیں۔ سچائی یہ ہے کہ گل خان وہی گل خان تھا(75)

میر گل خان نصیر، سردار عطا اللہ خان مینگل، پروفیسر کرار حسین
کراچی کی ایک تقریب میں

باب ششم

حواشی

1۔میر گل خان نصیر۔تاریخ بلوچستان(اول ودوئم)1986(طبع سوئم)ص4۔

2۔ایضاً۔

3۔سلیگ ھیریسن رمسعود بخاری (مترجم)بلوچ قومی تحریک۔1990۔ص29۔

4۔احمد یار خان۔بلوچ قوم کے نام خان بلوچ کا پیغام۔1972 (طبع دوئم)ص13۔

5۔ایضاً۔

6۔سلیگ ھیریسن رمسعود بخاری (مترجم) بلوچ قومی تحریک ۔1990۔ ص35۔

7۔میر غوث بخش بزنجو۔"گل خان جنگ آزادی کا ایک سپاھی"۔میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اورسیاست۔(مرتبین)1993 ص33۔

8۔ایضاً۔

9۔ملک فیض محمد یوسفزئی۔یادداشتیں۔1997۔ص27۔

10۔میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔

1982۔ص308۔

11۔ایضاً۔

12۔ایضاً۔

13۔میر نصیر خان احمد زئی ۔ تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد ہفتم)
2000۔ص251۔

14۔میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں
1982-ص310۔

15۔ایضاً۔313۔

16۔ایضاً۔ص317۔

17۔ایضاً۔

18۔ایضاً۔

19۔نور محمد شیخ ''نصیر کا ادبی اور سماجی شعور'' ۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست (مرتبین)1993۔ص .120

20۔محمد ہاشم خان غلزئی ۔ ''گل خان کچھ یادیں''۔گل خان نصیر فن اور شخصیت (مرتبین)1986۔ص74۔

21۔میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔

1982۔ص319۔

22۔میر گل خان نصیر۔تاریخ بلوچستان (جلد اول و دوئم) 1976 (طبع سوئم)۔ص440۔

23۔ایضاً۔ص453۔

24۔ایضاً۔ص354۔

25۔ایضاً۔ص458۔

26۔ایضاً۔ص459۔

27۔ایضاص460۔

28۔میر نصیر خان احمد زئی۔تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد ہفتم) 2000۔ص344۔

29۔میر گل خان نصیر۔تاریخ بلوچستان (اول و دوئم) 1976 (طبع سوئم) ص462۔

30۔ایضاً۔ص464۔

31۔ایضاً۔ص331۔

32۔احمد سلیم۔بلوچستان، صوبہ مرکز تعلقات۔1993۔ص11۔

33۔احمد یار خان بلوچ۔بلوچ قوم کے نام خان بلوچ کا پیغام۔1972

(طبع دوئم) ص 52۔

34۔میر گل خان نصیر۔تاریخ بلوچستان (اول و دوئم) 1976 (طبع سوئم) ص 464۔

35۔ایضاً۔ ص 552۔

36 میر نصیر خان احمد زئی۔تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد ہفتم) 2000۔ص 98۔

37۔میر گل خان نصیر۔تاریخ بلوچستان (اول و دوئم) 1976۔(طبع سوئم) ص 338۔

38۔ایضاً۔

39۔میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ 1982۔ص 33۔

40۔میر نصیر خان احمد زئی۔تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد ہشتم) ص 106۔

41۔احمد سلیم۔ بلوچستان،صوبہ مرکز تعلقات۔1993۔ص 220۔

42۔میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں۔ 1982۔ص 340۔

43۔شجاع احمد زیدی (نگران) بلوچستان، جمہوریت کا سفر۔ 1997 ص

57۔

44۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اورو جدید تاریخ کی روشنی میں۔
1982۔۔ص356۔

45۔ میر غوث بخش بزنجو۔ (سپریم کورٹ آف پاکستان میں بیان)
بلوچستان صوبہ مرکز تعلقات۔احمد سلیم۔ص224۔

46۔ میر نصیر خان احمد زئی۔تاریخ بلوچ و بلوچستان (جلد ہشتم) 2000
۔ص306+307۔

47۔ عبدالقادر شاہوانی۔''بے باک صحافی، قومی شاعر، محقق و مورخ میر گل
خان نصیر'' روزنامہ کوہستان۔7دسمبر1999۔

48۔ میر گل خان نصیر۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی
میں۔1982۔ص340۔

49۔ میر غوث بخش بزنجو (دیباچہ نگار) گلگال۔گل خان نصیر 1993۔ص
12+13۔

50۔ ڈاکٹر کہور خان ''گل خان نصیر بحیثیت سیاست دان''۔غیر مطبوعہ مقالہ

51۔ میر گل خان نصیر۔''میں اور میرا فن''۔ بلوچی دنیا۔ ملتان۔
دسمبر1984۔ص7+8۔

52۔ پروفیسر ڈاکٹر فردوس انور قاضی ۔ ''میر گل خان نصیر کی یاد میں''۔ غیر مطبوعہ مقالہ۔

53۔ میر غوث بخش بزنجو ''بلوچی زبان کا بہت عظیم شاعر''۔ میر گل خان نصیر فن اور شخصیت (مرتبین) 1986۔ص 30۔

54۔ عابد حسن منٹو۔ ''نصیر تاریخ کی کڑیوں کو جوڑنے والا شاعر''۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست ۔1993۔ ص 39۔

55۔ میر گل خان نصیر۔ ''میں اور میرا فن''۔ میر گل خان نصیر فن اور شخصیت۔ 1986۔ص 18۔

56۔ عبداللہ جان جمالدینی ''میر گل خان نصیر۔ صحافی''۔ میر گل خان نصیر فن اور شخصیت۔ 1986۔ص 53۔

57۔ میر غوث بخش بزنجو ''گل خان جنگ آزادی کا ایک سپاہی''۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست ۔1993۔ص 33۔

58۔ ولف گینگ لینجن بوشر/ڈاکٹر محمد اسلم فرخی (مترجم) جرمن ادب پارے۔ 1971۔ص 289۔

59۔ گوھر ملک۔ ''یا تانی پاھار''۔ تپتان۔ مئی جون 1990۔ص 67۔

60۔ میر گل خان نصیر۔ ''یک یاتے''۔ ماہنامہ اومان ۔ کراچی۔ مارچ

1959۔ص73۔

61۔لال بخش رند۔ ''نصیر کی زندگی کے آخری دور کی تلخ حقیقتیں''۔میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔1993۔ص88۔

62۔ایضاً۔ص89۔

63۔ایضاً۔

64۔میر غوث بخش بزنجو (دیباچہ نگار) گلگال۔گل خان نصیر۔1993۔ص12۔

65۔ایضاً۔ص13۔

66۔ایضاً۔

67۔گوھر ملک ''یاتانی پاھار''۔تپتان۔مئی جون 1990۔ص67۔

68۔ایضاً۔

69۔لال بخش رند ''نصیر کی زندگی کے آخری دور کی تلخ حقیقتیں''۔میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔1993۔ص92۔

70۔ایضاً۔ص90۔

71۔ایضاً۔ص91۔

72۔انور احسن صدیقی (تقریظ نگار) میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور

سیاست۔1993۔ص15۔

73۔پروفیسر بہادر خان رودینی ''میر گل خان نصیر کی سیاسی زندگی''۔میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست۔1993۔ص60۔

74۔لال بخش رند۔''میر گل خان نصیر۔شاعر انقلاب''۔''میر گل خان نصیر۔شخصیت شاعری اور سیاست۔1993۔ص71۔

75۔میر غوث بخش بزنجو۔''(دیباچہ نگار) گلگال۔گل خان نصیر۔1993۔ص14۔

1۔ مختصر تعارف

2۔ کتابیات

مختصر تعارف

قوموں کی تاریخ میں کبھی کبھار ایسی شخصیات جنم لیتی ہیں

جو اپنی انتھک محنت اور مسلسل جدوجہد کی بدولت ایک عظیم مرتبے اور بلند مقام تک پہنچ پاتی ہیں۔ بلوچستان کی سرزمین سے وابستہ بہت سی ایسی شخصیات ہیں جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی کامیابی وکامرانی کے جھنڈے گاڑ کر اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ ادب، معاشیات، سیاسیات، سماجیات اور دوسرے شعبوں میں اس سرزمین سے کئی ہستیاں پیدا ہوئیں، ان میں کچھ شخصیات ایسے بھی گزرے ہیں جن کو ہم ایک مخصوص شعبے سے وابستہ نہیں کر سکتے ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی، ان ہی میں ایک معتبر نام میر گل خان نصیر کا بھی ہے۔ میر گل خان نصیر کی بنیادی شناخت گوکہ ادب کے حوالے سے ہے مگر انھوں نے دوسرے شعبوں میں بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ان کی خدمات ادبی تاریخ کا حصہ ہیں ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک محقق بھی تھے۔ صحافتی شعبے میں بھی انھوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ ایک مورخ کی حیثیت سے بھی انھوں نے بلوچستان اور بلوچوں کی تاریخ کو نئے انکشافات سے آشنا کیا۔ انھوں نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا جس کے نتیجے میں ان کی زندگی کے کئی سال جیلوں اور اذیت خانوں میں گذری۔

مترجم اور منتظم کے طور پر بھی ان کی خدمات تاریخ کا حصہ ہیں۔

میر گل خان نصیر ۱۴ مئی ۱۹۱۴ کو نوشکی کے کلی مینگل میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر حبیب خان تھا۔ میر حبیب خان کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ میر گل خان نصیر آٹھ بچوں میں ساتویں نمبر پر جبکہ اپنے بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے۔ نوشکی کے علاقے میں میر گل خان نصیر کے آباؤ اجداد کا شمار وطن دوست اور قوم دوست لوگوں میں ہوتا تھا۔ اسی خاندانی پس منظر میں میر گل خان نصیر کی تربیت ہوئی جس کی چھاپ ان کی شخصیت پر آخر تک برقرار رہی۔

چوتھی جماعت تک میر گل خان نصیر نے اپنے آبائی گاؤں میں تعلیم حاصل کی مزید پڑھنے کیلئے انھیں کوئٹہ بھیجا گیا جہاں انھیں سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ میں داخل کیا گیا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے لاہور چلے گئے جہاں انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۳۲-۱۹۳۱ میں فرسٹ ائیر کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب وہ سکینڈ ائیر میں زیرِ تعلیم تھے تو بائیں آنکھ میں کوئلہ پڑ جانے کی وجہ سے وہ اپنا تعلیم آگے جاری نہ رکھ سکے اور انھیں اپنے تعلیم کا سلسلہ ادھورا چھوڑ کر کوئٹہ آنا پڑا۔

۱۹۳۶ء کے اواخر یا ۱۹۳۷ء کے اوائل میں میر گل خان نصیر رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے اولادوں میں دو بچیاں پیدا ہوئیں۔

۳۰ ستمبر ۱۹۳۳ء کو جب میر احمد یار خان، خانِ قلات کی حیثیت سے مسند نشین ہوئے تو انھوں نے اپنے حکومتی کاروبار میں ریاستِ قلات کے تعلیم یافتہ طبقے کے نوجوانوں کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ میر گل خان نصیر بھی ان باصلاحیت نوجوانوں میں سے تھے جنکو انتظامی معاملات سونپ دیئے گئے۔ انھوں نے مستوفی (کلکیٹر)، سکریٹری جوڈیشل اور نائب وزیر کی حیثیت سے مختلف مواقع پر مختلف علاقوں میں خدمات سرانجام دیئے اور ایک اچھے منتظم کے طور پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

شاعری اور ادب میر گل خان نصیر کا بنیادی حوالہ ہے۔ بلوچی ادب کے نقاد میر گل خان نصیر کو جدید بلوچی شاعری کا نقطۂ آغاز قرار دے چکے ہیں۔ یہ اعزاز بھی میر گل خان نصیر کو حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں اس معاشرے کی عکاسی ایک زیرک کیمرہ مین کی طرح کی ہے کہ جس میں زندگی اور جذبے کا تحرک موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ میر گل خان نصیر ادب اور زندگی کے باہمی تعلق کے بنیادی فلسفے کے قائل تھے۔ ان کے خیال میں جس ادب کی جڑیں قوم کی زندگی میں پیوست نہیں ہوتیں وہ

کھوکھلا اور کمزور ادب شمار ہوگا۔ اس لئے تخلیق کرتے وقت معاشرہ اور اس میں بسنے والے لوگ ہمیشہ ان کی نگاہوں میں رہے۔

میر گل خان نصیر نے شروع میں براہوئی، فارسی اور اردو میں بھی شاعری کی مگر بعد میں انھوں نے بلوچی زبان کو اپنی اظہار کا واحد ذریعہ بنایا۔ وہ اس بات سے شعوری طور پر آگاہ تھے کہ بلوچی زبان ان کی اظہار کے لئے بہتر اور وسیع ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے۔ انھیں اس بات کا بھی اچھی طرح علم تھا کہ بلوچی زبان میں شاعری کر کے وہ اپنے خیالات و نظریات عوام کے ایک وسیع حلقے تک پہنچا سکیں گے۔ میر گل خان نصیر کی اسی شعوری کوشش نے انھیں بلوچی زبان وادب کا ملک الشعراء بنادیا۔

وہ نصف صدی تک برابر لکھتے اور شعر کہتے رہے۔ جس عہد میں انھوں نے شاعری کی اس عہد کی نمائندگی کا پورا پورا حق بھی انھوں نے ادا کردیا۔ میر گل خان نصیر کے متعلق ان کے گھر والوں کا کہنا ہے کہ وہ جب بہت ہی چھوٹے تھے تو مختلف مواقعوں پر وہ اپنا اظہار شعر کے ذریعے بھی کرتے تھے۔ اپنی شاعری کی ابتداء کے متعلق ان کا اپنا کہنا تھا کہ جب وہ اسکول میں پڑھ رہے تھے تب انھیں شاعری سے شغف پیدا ہوا۔

بہ غرض تعلیم نوشکی سے کوئٹہ اور کوئٹہ سے لاہور کے سفر سے میر گل

خان نصیرؔ کی سوچوں میں وسعت آئی۔ پھر علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر تبدیل ہوتی ہوئی صورتحال نے ان کے شعری سمت کے تعین میں اہم کردار ادا کیا۔ بلوچستان میں ترقی پسند سیاسی سرگرمیوں کی ابتدا نے بھی ان کی شاعری میں نکھار پیدا کر دی۔

انھوں نے باقاعدہ بلوچی شاعری کا آغاز ۵ جنوری ۱۹۴۲ء سے کیا اور انھوں نے اپنا پہلا شعر ''بیا او بلوچ'' تخلیق کیا۔ بلوچی میں شاعری کرتے وقت انھیں اس بات کا اچھی طرح احساس ہوا کہ وہ ہر مضمون اور خیال کو اب نسبتاً آسانی سے شعر کے قالب میں ڈھال سکتے ہیں۔ ان کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے سے آگاہ تھے۔ انھیں اپنی کلاسیکل شعری روایتوں سے بھی اچھی خاصی شناسائی تھی۔

''بیا او بلوچ'' بلوچی شاعری میں فکری رویوں کا نقطۂ آغاز تھا ایک ایسا آغاز جس نے بعد میں لکھنے والوں کو اپنے خیال کے احساس کے سحر سے نکلنے نہیں دیا۔

میر گل خان نصیرؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''گلبانگ'' ۱۹۵۱ء میں منظرِ عام پر آیا اسطرح میر گل خان نصیرؔ کو بلوچی زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

ابتدائی شاعری میں میر گل خان نصیرؔ کچھ عرصہ علامہ اقبال سے متاثر رہے بعد میں انھوں نے سب سے زیادہ اثر ۱۹۳۶ کی ترقی پسند ادبی تحریک سے قبول کیا۔ ریکی زنگی شاھی اور بالاچ میر گل خان نصیرؔ کے پسندیدہ شاعر تھے۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ ان دونوں شعرا کے کلام سے ہی ان کی حب الوطنی کے جزبے کو جلا ملی۔ آخر تک یہ دونوں شعراء میر گل خان نصیرؔ کے آئیڈیل رہے۔

بلوچی ادب میں میر گل خان نصیرؔ کو جو مقام اور رتبہ ملا وہ ابھی تک کسی دوسرے ادیب اور شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ بقول عطا شاد وہ بلوچی شاعری کے ایک پلر کی مانند ہیں۔ اگر ہم ان کی شاعری کو بلوچی ادب سے الگ کردیں یا نکال دیں تو شاید ادب کا یہ محل گر تو نہیں جائے گا مگر کمزور اور بدنما ضرور نظر آئے گا۔

میر گل خان نصیرؔ کی فن اور شخصیت پر سب سے زیادہ مقالے لکھے گئے جو انگریزی، اردو اور بلوچی زبان میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ مختلف رسالوں نے خصوصی شمارے اور نمبرز بھی میر گل خان نصیرؔ کی فن اور شخصیت کے حوالے سے نکالے۔ شعراء نے سب سے زیادہ میر گل خان نصیرؔ کو اپنی شاعری میں خراج عقیدت پیش کیا۔ جدید شعراء کو میر گل خان نصیرؔ

نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

روس کی حکومت نے جب فیض احمد فیض کو "لینن پرائز" سے نوازا تو ان کے ساتھ ساتھ روس کی حکومت میر گل خان نصیر کو بھی "لینن پرائز" دینا چاہ رہی تھی مگر اس وقت کی حکومت نے انھیں ماسکو جانے کی اجازت نہیں دی۔ اپنی غیر مصالحانہ جدوجہد کی بناء پر میر گل خان نصیر ہمیشہ حکمرانوں کے زیرِ عتاب رہے۔ نظر بندی، جیل، جلاوطنی اور جرمانے کا انھیں اکثر و بیشتر سامنا رہا۔ ان کی کئی کتابیں بحق سرکار ضبط ہوگئیں۔ بالاخر ان حکمرانوں کو بھی ان کے ادبی کارناموں کا اعتراف کرنا پڑا اور انھیں بعد از مرگ ستارہ امتیاز (صدارتی ایوارڈ) سے نوازا گیا۔

شعبہ بلوچی (جامعہ بلوچستان) کے نصاب میں "خصوصی مطالعے" کے لئے میر گل خان نصیر کی فن و شخصیت کو نصاب میں شامل کیا گیا۔

روزنامہ انتخاب حب کی جانب سے "مین آف دی سنچری" کیلئے جو سروے کیا گیا، رائے دہندگان کی بھاری اکثریت نے میر گل خان نصیر کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

بلوچی اور براہوئی کے بہت سے ادیب اور شعراء نے میر

گل خان نصیر کے نام سے اپنی تخلیقات وتحقیقات کا انتساب رکھا۔ یہ سب میر گل خان نصیر کی خدمات کا اعتراف ہیں۔

جیل کے ایام جہاں تلخ ہوتے ہیں وہاں ایک تخلیق کار کو یکسوئی اور اطمینان سے کام کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ پوری دنیا کی ادب کا ایک اچھا خاصا حصہ جیل میں تخلیق کے مرحلے سے گزر کر سامنے آیا ہے۔ ناظم حکمت، محمود درویش، پابلو نرودا، فیض احمد فیض اور بہت سے دوسرے ایسے نام ہیں جنھوں نے ایام اسیری کے دن تحقیق و تخلیق میں گذارے۔ میر گل خان نصیر کا نام بھی اسی فہرست میں آئے گا۔ ان کے بہت سے تحقیقی مواد اور تخلیقی کارنامے ایام اسیری کے ادوار کی یادگار ہیں جنھیں مختلف جیلوں میں رہ کر انھوں نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ میر گل خان نصیر ایک اچھے مترجم بھی تھے۔ انھوں نے ادب کے اس صنف میں بھی بیش بہا اضافہ کیا۔

میر گل خان نصیر نے اپنے دوستوں، احباب، عزیز اور مختلف اداروں کو جو خطوط لکھے ان خطوط میں بھی تاریخ کا حصہ بننے کی تمام تر صلاحتیں موجود ہیں۔ اگر آنے والے وقتوں میں یہ خطوط چھپ جائیں تو یہ نہ صرف ادب میں ایک اچھا خاصا اضافہ تصور ہوں گے بلکہ ان خطوط سے اس

وقت کی سیاسی حالات اور سماجی واقعات کا بھی اچھی طرح پتہ چل سکتا ہے۔
سانیات کے شعبے میں بھی وہ معلومات رکھتے تھے نیپ
کے دور حکومت میں بلوچی زبان پر کانفرنس میں ان کی تقریر ہو یا مختلف
رسالوں اور کتابوں میں ان کی چھپی ہوئی تحریریں ہوں، ان سب سے یہی
نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ لسانیات کے متعلق بھی بنیادی معلومات رکھتے
تھے۔

کہتے ہیں کہ ادیب کے فکر اور عملی رویے میں جب تضاد
ہو تو ان کا ذہن واضح نہیں ہو پاتا۔ ذہنی اور عملی طور پر میر گل خان نصیر کی
شخصیت میں توازن پائی جاتی تھی۔ انھوں نے اپنے مقاصد کے حصول کیلئے
جن جن شعبوں کا انتخاب کیا وہاں زندگی کی جانب ان کی پیش قدمی مثبت
جہت کی صورت میں صاف نظر آتی ہے۔

ایک محقق کی حیثیت سے میر گل خان نصیر نے بنیادی تحقیقی
کاموں کی طرف توجہ دی۔ جن جن موضوعات پر محققین پہلے تحقیق کر چکے
تھے ان موضوعات کو نئے سرے سے ترتیب دے کر اپنی تحقیق میں اُنھیں میر
گل خان نصیر نے نہ صرف اُنھیں وسعت دی بلکہ انھیں جدید تحقیق کے
زمرے میں شامل کر دیا اسطرح وہ تحقیقی موضوعات زیادہ مستند ہو گئے۔

انہوں نے ایسے تحقیقی موضوعات پر کام کیا جن سے انھیں نہ صرف گہری دلچسپی تھی بلکہ یہ موضوعات ان کے رجحان اور مزاج کے بھی عین مطابق تھے۔

میر گل خان نصیر نے قومی تہذیب و تاریخ اور ادبی تاریخی تحقیق پر خصوصی طور پر توجہ دی یعنی انھوں نے تہذیب کو تحقیق کے لئے وسیلہ بنایا اور بلوچوں کی قومی تاریخ مرتب کی۔ بلوچستان کی تاریخ کا ایک اچھا خاصا حصہ اور مختلف ادوار کے حالات و واقعات چونکہ قدیم شاعری میں موجود ہیں اس لئے انھوں نے یہاں تحقیق میں ادب کو مقصد کا درجہ دیا۔ میر گل خان نصیر نے تحقیق کے شعبے میں جتنے کام کئے اس سے پہلے اور نہ ابھی تک کسی شخص نے اتنے کام کئے ہیں۔ محققین اگر ان موضوعات پر کام کرنا چاہیں یقیناً میر گل خان نصیر کے ان تحقیقی مواد سے اچھا خاصا استفادہ کر سکیں گے۔

۱۹۳۵ء میں جب کوئٹہ شہر زلزلے کی تباہ کاریوں سے ملیا میٹ ہوا تو اس وقت رائج صحافت بھی اسکی زد میں آ گئی۔ پچاس ہزار کے لگ بھگ آبادی کے اس شہر میں زلزلے سے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پینتیس سے چالیس ہزار افراد لقمہ اجل بن گئے۔ بچنے والے لوگوں میں زیادہ تر ہندوستان چلے گئے جہاں سے وہ روشن خیالی اور سیاسی بیداری کی لہر

ذہنوں میں لے کر واپس لوٹے تب کوئٹہ تعمیر نو کے عمل سے گزر رہا تھا۔اسی دوران سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اور ساتھ ساتھ صحافت میں بیداری اور مقصد سے وابستگی کے رویے بھی در آئے۔اسطرح بلوچستان میں اصولی صحافت کا بے باک لب ولہجہ ۱۹۳۵ء کے زلزلے کے بعد نمودار ہوا۔جو لوگ صحافتی محاذ پر مصروفِ عمل تھے ان کو بے پناہ مصائب ومشکلات کا سامنا بھی تھا۔ان میں سے اکثر کو جیل، جرمانے اور جلاوطنی کے دن بھی دیکھنے پڑے۔اخبار نکالنا اور اسے روشن فکر طبقے کا ترجمان بنانے کا مقصد اپنے آپ کو بے پناہ مصائب ومشکلات میں ڈالنا تھا لہذا کبھی کبھی اپنے مقصد کے حصول کیلئے ان کو بلوچستان سے باہر جا کر بھی صحافتی محاذ پر لڑنا پڑا۔ان اخبارات اور ان سے وابستہ لوگوں نے بلوچستان میں صحافتی تاریخ کو ایک مضبوط اور مستحکم بنیاد فراہم کر دی ان لوگوں میں میر گل خان نصیرؔ کا نام بھی شامل ہے۔

''نوائے بلوچستان'' سے میر گل خان نصیرؔ نے اپنی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا جسکے وہ مدیر تھے۔اس اخبار کے مالک بلوچستان کے نامور صنعتکار میر نبی بخش خان زہری تھے۔یہ ہفتہ وار اخبار فروری ۱۹۴۹ء کو جاری ہوا جسکے ایڈیٹر کمال الدین احمد بھی رہ چکے تھے۔اس اخبار میں غلام

محمد شاہوانی نے بھی میر گل خان نصیر کے ساتھ مل کر معاون مدیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ میر گل خان نصیر اخبار کیلئے پالیسی بنانے میں اپنے مخصوص دوستوں کی رائے کو اہمیت دیتا تھا اور وہ صحیح معنوں میں اس ہفتہ وار اخبار کو عوام کی حقیقی ترجمان بنانا چاہتا تھا۔ اسی اخبار کے توسط سے ان کے چیدہ چیدہ مسائل کو اجاگر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دوسری طرف اخبار کا مالک ایک مخصوص طبقے کی نمائندگی میں ان تمام رویوں کو آگے بڑھانے کے حق میں نہیں تھا۔ میر نبی بخش خان زہری اخبار سے جو مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے میر گل خان نصیر ان کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا لہذا انھیں ''نوائے بلوچستان'' بند کرنا پڑا۔

''نوائے بلوچستان'' کے بند ہونے کے بعد میر گل خان نصیر کا دوسرا صحافتی تعلق ''نوائے وطن'' کے ساتھ جڑا۔ غلام محمد شاہوانی روزنامہ ''اتحاد'' کے نیوز ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے نوائے وطن کی اجازت مانگی تھی اور انھیں اس کے اجراء کی اجازت مل گئی تھی، غلام محمد شاہوانی نے وہ اجازت نامہ گل خان نصیر کے حوالے کر دیا۔ صحافت کے افق پر ''نوائے وطن'' نہایت ہی آب و تاب سے نمودار ہوا۔ اب میر گل خان نصیر کو اپنے نظریات پیش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آ رہی تھی ۱۹۵۳ میں ''نوائے

وطن'' کا اجراء ہوا۔ عبداللہ جان جمالدینی ۱۹۵۴ء میں معاون مدیر کی حیثیت سے ''نوائے وطن'' کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے۔ صحافتی حلقوں میں اسکی اچھی خاصی پذیرائی ہوئی۔ اخبار کی پالیسی کے حوالے سے جب غلام محمد شاہوانی اور گل خان نصیرؔ کے مابین اختلافات پیدا ہوئے تو گل خان نصیرؔ کو ''نوائے وطن'' سے الگ ہونا پڑا۔

میر گل خان نصیرؔ خود ایک اخبار نکالنا چاہتے تھے۔ مگر انکی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی۔ صحافت سے مختصر عرصے کی وابستگی کے باوجود بلوچستان کی صحافتی تاریخ میر گل خان نصیرؔ کے تذکرے کے بغیر نامکمل اور تشنہ رہے گی۔

بلوچستان اور بلوچوں کی تاریخ پر تحقیق کی ابتداء بیرونی محققین و مورخین نے کیا جو اصل میں تحقیق اور تاریخ کے شعبے سے وابستہ اور مستند لوگ نہیں تھے۔ ان کے اپنے سیاسی، سماجی اور معاشی مقاصد تھے۔ انھیں یہ دلچسپی نہیں تھی کہ بلوچوں اور بلوچستان کو دنیا کے دیگر اقوام کے سامنے متعارف کرائیں یا بلوچوں کو ان کے اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرائیں بلکہ وہ بلوچوں کی باہمی نااتفاقی، انکی قبائلی رقابتوں اور ان کے اخلاقی اقدار سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ بلوچوں کو دنیا کے سامنے

پسماندہ اور جاہل قوم کی حیثیت سے پیش کرتے رہے۔ بلوچستان چونکہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے پہلے بھی نہایت اہمیت کا حامل خطہ رہا ہے اس لئے یہ خط ہمیشہ سے بیرونی حملہ آوروں کی نگاہوں میں بھی رہا ہے خصوصاً انگریز حکمران اپنے ان دانشوروں کی تحقیق کے نتیجے میں اپنی حکمرانی کے لئے حکمت عملی وضع کرتے رہے۔ میر گل خان نصیر بلوچوں کے اقدار اوران کے طور طریقوں سے اچھی طرح آگاہ تھے، انھیں اس بات کا بھی اچھی طرح احساس تھا کہ بلوچ من حیث القوم اپنی قومی تشکیل کے مراحل سے گزر رہی ہے لہٰذا انھوں نے بلوچستان کی تاریخ لکھتے وقت صرف انگریز مورخین کی بلوچوں اور بلوچستان کے متعلق لکھی گئی تواریخ اور روایتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے ازخود تحقیق کرکے انگریزوں کی مرتب کی ہوئی مسخ شدہ تاریخ کے مقابلے میں ایک جامع اور مبنی بر حقائق تاریخ لکھنا چاہا جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہے۔ بلوچوں اور بلوچستان کی تاریخ کو میر گل خان نصیر نے جس سانچے میں دیکھا اور پرکھا اس سے پہلے کے محققین و مورخین نے تاریخ کو اس انداز میں نہ کبھی دیکھا اور نہ ابھی تک کسی مورخ نے تاریخ کے اتنے پہلوؤں پر طبع آزمائی کرنے کی کوشش کی۔ تاریخ کے حوالے سے میر گل خان نصیر کی دونوں کتابیں ''تاریخ بلوچستان'' اور ''بلوچستان قدیم

اور جدید تاریخ کی روشنی میں،' انتہائی اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں واقعات اور حالات کے ایسے زاویوں پر تفصیلی مواد ملتی ہیں جنھیں بیشتر مورخین سامنے لانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

میٹرک کے بعد جب میر گل خان نصیرؔ اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور چلے گئے تھے تو وہاں ان کی حساس طبیعت نے مختلف تحریکات سے بھی اثر قبول کیا تھا ان اثرات کی روشنی میں انھوں نے بلوچستان کے حالات کو مدنظر رکھا تو بلوچستان کی معاشی، سیاسی اور تعلیمی پسماندگی کا ایک عجیب پہلو ان کے ذہن میں اجاگر ہوا۔ یہ دراصل سماجی شعور کا احساس تھا جس نے سیاسی روپ دھار لیا تھا۔ جس وقت میر گل خان نصیرؔ اپنی تعلیم نامکمل چھوڑ کر بلوچستان آئے اس وقت یہاں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ تہذیبی ترقی کے لحاظ سے بلوچوں کی حد درجے بدحالی نے میر گل خان نصیرؔ کے شعور کو سماج، زندگی اور ادب کے سچے تعلق کا پہلا واضح اور ہمیشہ یاد رہنے والا درس دیا۔

یوسف عزیز مگسی اور عبدالعزیز کرد جس سیاسی تحریک کی بنیاد رکھ چکے تھے میر گل خان نصیرؔ نے اپنے آپ کو اسی سیاسی دھارے سے منسلک رکھا۔ انہوں نے عملی سیاست کا آغاز ایک ایسے دور میں کیا جب ہر

طرف پابندیاں اور بندشیں تھیں ۱۹۳۴ء میں جب انجمنِ اسلامیہ ریاست قلات" وجود میں آئی تو میر گل خان نصیر اس انجمن کے صدر منتخب ہو گئے۔ سازشوں کے نتیجے میں اس انجمن کو دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اور اس انجمن کی سرگرمیوں کو ریاستِ قلات میں خلاف قانون قرار دیا گیا۔

انجمن اسلامیہ کی سرگرمیوں کے معطل ہونے کے بعد بلوچستان کے روشن خیال نوجوان ایک ایسی تنظیم کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے جو قومی حقوق کی جدوجہد میں عوام کی حقیقی نمائندگی اور رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے لہذا ۱۹۳۷ء میں قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل دی گئی جسکے صدر میر عبدالعزیز کرد اور نائب صدر میر گل خان نصیر منتخب ہوئے۔ اس سیاسی جماعت نے مختصر مدت میں عوام میں اچھی خاصی پذیرائی حاصل کر لی اور کامیاب تحریک چلا کر ریاستی معاملات میں کچھ مثبت اصلاحات نافذ کروائیں۔ ریاست قلات کے انتظامی معاملات میں دلچسپی رکھنے والوں کیلئے "قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی" ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ لہذا انھوں نے ساز باز کر کے خانِ قلات اور نیشنل پارٹی کی قیادت کے مابین اختلافات کی صورت حال کو جنم دیا۔ اس جماعت کی سرگرمیاں ریاست قلات میں ممنوع قرار دی گئیں۔

نیشنل پارٹی نے ایک جلاوطن جماعت کی حیثیت سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ جب ۱۹۴۷ کے وسط میں ریاستِ قلات میں پہلی بار انتخابات ہوئے تو نیشنل پارٹی کے نامزد کردہ نمائندوں نے انفرادی حیثیت سے دیوانِ عام کے باون اراکین پر مشتمل ہاوس میں انتالیس نشستیں حاصل کر لیں۔

۲۷ مارچ ۱۹۴۸ کو پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کو مرکزی حکومت کی طرف سے پاکستان بھر میں خلاف قانون جماعت قرار دیا گیا۔

۱۶ جولائی ۱۹۵۶ کو جب شہزادہ عبدالکریم اور محمد حسین عنقا جیل سے رہا ہوئے تو انھوں نے کراچی میں ریاست قلات کے سیاسی کارکنوں کی اجلاس طلب کرلی۔ مگسی ہاؤس کراچی میں منعقدہ اس اجلاس میں ایک سیاسی جماعت ''استمان گل'' کی داغ بیل ڈالی گئی۔ میر گل خان نصیر بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ اس جماعت نے پہلی دفعہ سیاسی مطالبے کے طور پر بلوچی زبان کو اس نئی وحدت کی سرکاری اور تحریری زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا۔

۳۰ نومبر ۱۹۵۶ کو پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کی

نمائندہ سیاسی جماعتوں نے ادغام کا فیصلہ کیا جسکے نتیجے میں ''پاکستان نیشنل پارٹی'' وجود میں آئی۔ مولانا بھاشانی جب عوامی لیگ سے الگ ہوئے تو پاکستان نیشنل پارٹی کے ایک وفد نے انھیں نیشنل پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی۔ چنانچہ پاکستان نیشنل پارٹی اور عوامی لیگ (بھاشانی گروپ) کے انضمام کے نتیجے میں ''پاکستان نیشنل عوامی پارٹی'' معرضِ وجود میں آئی۔

پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ء اور پھر ۱۹۷۵ء میں ''نیپ'' کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کردی گئی۔ اراکین وقائدین گرفتار کر لئے گئے ان میں میر گل خان نصیر بھی شامل تھے۔ ۱۹۷۷ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالا تو انھوں نے نیپ کے قائدین واراکین کے خلاف قائم مقدمات واپس لے لیے اور انھیں جیل سے بری کردیا۔ جیل سے رہائی کے بعد گل خان نصیر اپنے ساتھیوں سمیت نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہو گئے۔

افغانستان کے انقلاب کے مسئلے پر جب خان عبدالولی خان اور ان بلوچ اکابرین کے مابین اختلافات بڑھ گئے تو انھوں نے این ڈی پی کو خیرباد کہہ دیا اور کراچی میں ایک کنونشن طلب کر کے ''پاکستان نیشنل پارٹی'' کے نام سے اپنی ایک الگ جماعت کا اعلان کردیا۔

میر گل خان نصیر اپنی پچاس سالہ سیاسی زندگی میں نہ کبھی

اپنے اصولوں سے دستبردار ہوئے اور نہ کبھی انھوں نے حکومت سے سمجھوتہ کر لیا۔ وہ اپنے کاز سے آخر تک مخلص رہے۔

اپنے مقاصد کے حصول کے لیے میر گل خان نصیر لڑتے لڑتے بالآخر موت کے سامنے زندگی ہار گئے۔ 6 دسمبر 1983 رات سوا گیارہ بجے بروز منگل ان کا کراچی میں انتقال ہوا۔

کتابیات

1۔ اُردو کُتب

2۔ بلوچی کتب

3۔ رسائل وجرائد اور روزنامے (بلوچی/ اُردو)

4۔ غیر مطبوعہ مقالے (بلوچی/ اُردو)

اُردو کُتب

نمبر شمار۔ نام مصنف — نام کتب — پبلشر — سن اشاعت

1۔ احمد سلیم — بلوچستان صوبہ مرکز تعلقات۔ فرنٹیر پوسٹ پبلیکیشنز لاہور۔ 1993۔

2۔ احمد فراز (مترجم) — سب آوازیں میری ہیں۔ ماورا پبلشرز۔ لاہور۔ 1987

3۔ احمد، کمال الدین۔ صحافت وادیِ بولان میں۔ نساء ٹریڈرز۔ کوئٹہ 1980۔

4۔ اخوند محمد صدیق/میر گل خان نصیر۔ تاریخ خوانین قلات۔ نساء ٹریڈرز۔ کوئٹہ 1984

5۔ ارسطو/عزیز احمد۔ بوطیقا (فنِ شاعری)۔ انجمن ترقی اُردو۔ کراچی۔ 1974 (سوئم)

6۔ اشرف، اے۔ بی۔ ادب اور سماجی عمل۔ کاروانِ ادب۔ لاہور۔ 1980

7۔ امرتا پریتم/احمد سلیم۔ ایک اُداس کتاب۔ استعارہ پبلیکیشنز۔ کراچی۔ 1987

8۔ انتظار حسین، پروفیسر۔ علامتوں کا زوال۔ سنگ میل پبلیکیشنز۔ لاہور۔ 1983

9۔ انصاری، ظ۔ پوشکن (شعر و شاعری)۔ دار الاشاعت ترقی۔ ماسکو۔ 1960

10۔ انصاری، فہیم۔ موضوعاتی شاعری۔ ہم لوگ پبلیکیشنز۔ 1994 — ندارد

11۔ اوج کمال۔ فن تحقیق۔ دنیائے ادب۔ کراچی۔

12۔ بخاری، سجاد۔ یورپ کا بہترین ادب۔ فکشن ہاؤس۔ لاہور۔ 1991

13۔ بخاری، سید محمود علی شاہ۔ بلوچستان زمانہ قدیم سے قیام پاکستان تک۔ بخاری ٹریڈرز۔ کوئٹہ 1987

14۔ بریلوی، مجاھد۔ بلوچستان مسئلہ کیا ہے۔ 1984

15۔ بزنجو، طاہر۔ بابائے اُستمان۔ پاکستانی ادب پبلشرز۔ کراچی۔ 1990

16۔ بگٹی، عزیز محمد، پروفیسر۔ بلوچستان شخصیات کے آئینے میں۔ فرنٹیر پوسٹ پبلیکیشنز۔ لاہور 1994

17۔ بگٹی، عزیز محمد، پروفیسر۔ بلوچستان ادب ثقافت اور سماج۔ سینئیر پرنٹرز۔ کوئٹہ۔ 1995

18۔ بگٹی، عزیز محمد، پروفیسر۔ تاریخ بلوچستان۔ فرنٹیر پوسٹ پبلیکیشنز۔ لاہور۔ 1995

19۔ بلوچ، اختر علی خان۔ بلوچستان کی نامور شخصیات (جلد اول) 1994

20۔ بلوچ، حکیم۔ سنگِ لرزاں۔ 2000

21۔ بلوچ، میر خدا بخش بجارانی مری جسٹس۔ قدیم بلوچی شاعری۔ ندارد 1976 (دوئم)

22 پیکولین، م ک / شاہ محمد مری۔ بلوچ۔ مکتبہ ودانش۔ لاہوز 1988

23۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر۔ نئی تنقید۔ رائل بک کمپنی۔ کراچی 1985

24۔ جعفری، سردار۔ لہو پکارتا ہے۔ مکتبہ دانیال۔ کراچی۔ 1984

25۔ جمالدینی، عاصم فرید۔ جاگئے۔ راسکوہ ادبی دیوان۔ نوشکی 1998

26۔ جنرل ڈائر / میر گل خان نصیر۔ بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار۔ مسٹر پرنٹس۔ کوئٹہ 1990 (دوئم)

27۔ حسین، محمد ہادی۔ شاعری اور تخیل۔ مجلس ترقی ادب۔ 1966

28۔ خان، احمد یار۔ بلوچ قوم کے نام خان بلوچ کا پیغام۔ ندارد۔ 1972 (دوئم)

29۔ دہوار، محمد سعید۔ تاریخ بلوچستان۔ مطبوعات النساء۔ کوئٹہ۔ 1990۔

30۔ ڈیمز، لانگ ورتھ / گل خان نصیر۔ کوچ و بلوچ۔ بلوچی پبلیکیشنز۔ کراچی 1949

31۔ رزمی، ثاقب۔ آزادی نسواں کا نیا سویرا مکتبہ دانیال۔ کراچی۔ 1982

32۔ رزمی، ثاقب۔ شیلے، کیٹس، بائرن کی نمائندہ نظمیں۔ آئینہ ادب۔ لاہور 1984

33۔ رضوی، سجاد باقر۔ مغرب کے تنقیدی اصول۔ اظہار سنز۔ لاہور 1971 (دوئم)

34۔ رضی عابدی۔ تیسری دنیا کا ادب۔ مکتبہ فکر و دانش۔ لاہور 1988

35۔ رند، لال بخش (مرتب) گل خان نصیر فن اور شخصیت۔ عوامی ادبی انجمن۔ کراچی۔ 1986

36۔ ساغر۔ بادۂ مشرق۔ مکتبہ اُردو۔ لاہور۔ 1944

37۔ سلیگ حیریسن/مسعود بخاری۔ بلوچ قومی تحریک۔ سیلز اینڈ سروسز۔ کوئٹہ۔ 1990

38۔ شاہوانی، عبدالقادر۔ بلوچی ثقافت گیتوں میں۔ بلوچی اکیڈمی۔ کوئٹہ۔ 1996

39۔ شاہوانی، نادر۔ لالہ بلوچستان۔ براہوئی ادبی سوسائٹی۔ کوئٹہ۔ 1990

40۔ شمیم احمد۔ ۲+۲=۵۔ قلات پبلشر۔ کوئٹہ۔ 1977

41۔ شہزاد احمد۔ ذہن انسانی حدود و امکانات۔ سنگ میل پبلیشرز۔ لاہور۔ 1990

42۔ شیخ، نور محمد۔ میر گل خان نصیر شخصیت شاعری اور سیاست (مرتب) عوامی ادبی انجمن۔ کراچی 1993۔

43۔ شبہا مجید۔ ادبی مزاکرے۔ سنگ میل پبلیکیشنز۔ لاہور۔ 1989

44۔ سابر غوث بخش۔ بلوچی زبان و ادب کی مختصر تاریخ۔ مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد 1997

45۔ صاحبزادہ حمید اللہ۔ فن اور تکنیک۔ نیو کوئٹہ بک اسٹال۔ کوئٹہ۔ 1991

46۔ صدیقی، ریاض۔ جدید مضامین۔ آزاد اسٹیشنرز۔ کراچی۔ 1982

47۔ صدیقی، محمد اسماعیل۔ آئینہ بلوچستان۔ گوشہ ادب۔ کوئٹہ 1988

48۔ طاہر محمد خان۔ سیاسیات بلوچستان۔ جنگ پبلشرز۔ لاہور۔ 1992

49۔ عابد علی عابد، سید۔ اصول انتقاد ادبیات۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔ 1966 (دوئم)

50۔ عابد علی عابد، سید۔ اسلوب۔ ندارد۔ 1971

51۔ عادل، نادر شاہ۔ بلوچستان کا مقدمہ۔ گوہر پبلشرز۔ کراچی۔ 1988

52۔ عدم، عبدالحمید، سید۔ نشان راہ۔ میری لائبریری، لاہور۔ 1970

53۔ عطا شاد۔ بلوچی نامہ۔ مرکزی اُردو بورڈ، لاہور۔ 1968

54۔ عطا شاد۔ عطا محمد ملک۔ آپ کی شخصیت اور اس کا ارتقاء۔ اسلامک پبلشرز۔ لاہور۔ 1970

55۔ عنقا، محمد حسین۔ بلوچ قوم کے دور قدیم کی تاریخ۔ ندارد 1974

56۔ غنو، عبدالغنی، پروفیسر۔ بابائے پشتون کے خطوط (جلد اول)۔ ندارد۔ 1991

57۔غور، عبدالرحمان۔نغمہ کوہسار۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ 1968

58۔فاروقی، محمد احسن، ڈاکٹر۔تاریخ ادب انگریزی۔شعبہ تصنیف وتالیف۔کراچی یونیورسٹی۔کراچی۔1986

59۔فرخی، آصف/شاہ محمد پیرزادہ۔دانش ایاز۔ندارد۔ 1998

60۔فردوسی، حکیم ابوالقاسم۔شاہنامہ (اردو) انجمن فارسی۔راولپنڈی۔ 1971

61۔فیاض محمود، سید۔تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند۔پنجاب یونیورسٹی۔لاہور 1971

62۔فیض، فیض احمد۔ میزان۔ لاہور اکیڈمی۔لاہور۔ 1965

63۔فیض۔فیض احمد۔پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش۔فیروز سنز۔لاہور۔ 1988

64۔قمر رئیس، ڈاکٹر۔(مترجم) شعرائے ازبکستان۔غفور غلام اشاعت گھر۔تاشقند۔1973

65۔ کاشمیری، ظہیر۔ادب کے مادی نظریئے۔کلاسیک۔لاہور۔ 1975

66۔کامل القادری۔گائے جا بلوچستان۔بولان بک کارپوریشن۔کوئٹہ۔ 1971

67۔کامل القادری۔بلوچی ادب کا مطالعہ۔بولان بک کارپوریشن۔کوئٹہ۔ 1976

68۔کامل القادری۔ مہمات بلوچستان (دوئم)۔نساء ٹریڈرز۔کوئٹہ۔ 1980

69۔کشکوری، سردار خان۔چاکرِ اعظم۔بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ۔ 1988

70۔گی، سلیم خان۔بلوچی ادب، بلوچ ثقافت۔مطبوعات النساء۔کوئٹہ۔ 1990 (دوئم).

71۔گیان چند، ڈاکٹر۔تحقیق کا فن۔مقتدرہ قومی زبان۔اسلام آباد۔ 1994

72۔لدھیانوی، ساحر۔آؤ کہ کوئی خواب بُنیں۔چودھری اکیڈمی۔لاہور۔ 1984

73۔مبارک علی، ڈاکٹر۔تاریخ کے نظریات نگارشات۔لاہور۔ ندارد

74۔محمد ناصر، آغا۔ بلوچستان میں اُردو شاعری۔ 2000

75۔مراد، افضل (مرتب) بیسویں صدی میں بلوچستان کا ادب۔قلم قبیلہ۔کوئٹہ 2000

76۔مری، شیر محمد/آغا نصیر خان احمد زئی۔بلوچی زبان اور ادب کی تاریخ۔بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ۔ندارد

77۔ملیح آبادی، جوش۔یادوں کی بارات۔مکتبہ شعروادب۔لاہور۔ 1975

78۔ممتاز حسین، پروفیسر۔نقدِ حرف۔مکتبہ اسلوب۔کراچی۔ 1985

79۔مُنیر احمد ایڈوکیٹ۔بلوچستان سیاسی کشمکش (مضمرات ور جحانات) گوشہ ادب۔کوئٹہ 1989

80۔مینگل، صلاح الدین، ایڈوکیٹ۔یادِرفتگان۔براہوئی اکیڈمی۔کوئٹہ۔ 1989

81۔ناگی، انیس۔تنقیدِ۔شعر۔سنگ میل پبلیکشنز۔لاہور۔ 1987

82۔ناہید، کشور۔باقی ماندہ خواب۔ 1982

83۔نصیر، گل خان، میر بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی۔بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ۔ 1976

84۔ نصیر گل خان، میر۔بلوچی رزمیہ شاعری۔بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ۔ 1979

85۔نصیر گل خان، میر۔بلوچی عشقیہ شاعری۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔

86۔نصیر، گل خان، میر۔بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں نساء ٹریڈرز۔کوئٹہ 1982

87۔نصیر، گل خان، میر۔تاریخ بلوچستان (اول ودوئم) روبی پبلشرز۔کوئٹہ۔ 1986 (چہارم)

88۔نصیر گل خان، میر/غوث بخش صابر۔دوتین وشیرین۔ادارہ ثقافت۔کوئٹہ 1988

89۔نقوی، جمال۔خوشبو گلابوں کی۔ادارہ تزئین دانش۔کراچی 1998

90۔ہاشمی، رفیع الدین۔اصناف ادب۔سنگ میل پبلیکیشنز۔لاہور 1991

91۔ہاشمی، ظہور شاہ، سید۔بلوچی زبان وادب کی تاریخ۔سید ہاشمی اکیڈمی۔کراچی۔ 1986
(ایک مختصر جائزہ)

92۔یوسفزئی، فیض محمد، ملک۔یادداشتیں۔پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن کوئٹہ۔ 1997

93۔یوسفزئی، فیض محمد، ملک۔ثقافت اور ادب وادی بولان میں۔ 1966

بلوچی کتب

94۔بزدار، اللہ بخش۔ ھشکیں رکھ سوز بنت۔ ندارد۔ 1988

95۔بزدار۔واحد۔ شاھیم۔ بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ۔ 1997

96۔بلوچ، بشیر احمد۔شپ چراگ۔ملا فاضل۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ 1968

97۔بلوچ، عاقل خان مینگل، میر۔لوزانی ایرادگیری بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 1990

98۔بلوچ علی دوست، ڈاکٹر۔ ابیکیں راہ سر۔پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کوئٹہ 1999

99۔۔بلوچی رسم الخطءِ کنونش۔وزارت تعلیم حکومت بلوچستان 1972

100۔بولان نامہ۔ورناوانندہ گل۔شالکوٹ 1967

101۔بطنائی، عبداللطیف شاہ/میر گل خان نصیر شاہ لطیف گوشیت۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 1983

102۔بیدار، بشیر۔گوربام۔پاک نیوز ایجنسی۔تربت۔ 1982

103۔بیدار، بشیر۔ھزام۔بلوچ دودءُ ربیدگیءُ پٹءُ لوٹی انجمن۔کراچی۔ 1990

104۔بیدار، بشیر۔کریاب۔بلوچی ادبی مجلس۔مسقط۔ 1999

105۔پیرل، پیر بخش۔سرسند۔ ندارد 1995

106۔جمالدینی، آزات۔رژن ندارد 1985

107۔دشتی، کریم۔مے لبز انک۔ ندارد 1962

108۔دشتی، کریم۔شرگداری۔ ندارد 1963

109۔شاھوانی، غلام محمد/بشیر احمد بلوچ۔اولس واجہی۔بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ 1992

110۔صابر، غوث بخش۔لعل ءِ لقاء۔اقبال اکیڈمی۔لاہور۔ 1996

111۔صابر، غوث بخش۔تگدکاری (ردءُ بند) بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ 1996

112۔عطاشاد۔ گشین (شاعری) بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ 1972

113۔عطاشاد۔درین بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ

114۔عطاشاد۔ شپ سحار اندیم۔بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ 1996

115۔عطاشاد۔ روچ گر۔ بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ 1996

116۔فضل خالق،ڈاکٹر۔گچین گنج۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 1999(دوئی)

117۔فضل خالق۔ڈاکٹر۔دل گدان۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 2000

118۔فیض،فیض احمد/میر گل خان نصیر۔بینائی ءِ کچگ ءَ۔قلات پبلشرز۔کوئٹہ 1980

119۔قاضی،مبارک۔زرنوشت۔بلوچ دودءُ ربیدگی ءُ پٹ ءُ لوٹی انجمن۔کراچی 1990

120۔گچین۔بلوچ اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل آرگنائزیشن۔ 1965

121۔ساحر،مراد۔چھال۔سید ہاشمی اکیڈمی۔کراچی۔ 1989

122۔ساحر،مراد۔زرءِ مروارد۔پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کوئٹہ۔ 1995

123۔مری۔صورت خان،گشین (ردانک)۔بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ 1969

124۔مری،مٹھا خان۔نوکیں بلوچی شاعری۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ 1982

125۔مستاگ۔ بلوچی اکیڈمی۔ 1959

126۔مُلا،جی آر۔بڈن پازل اکیڈمی کوئٹہ 1981

127۔نادر،رزاق۔واب سبزنت پدا۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 1999

128۔ندیم،عبدالغفار،حاجی کنزی۔بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ 1999

129۔نصیر،گل خان،میر۔داستان دوستین و شیرین۔بلوچی پبلیکیشنز کوئٹہ 1964

130۔نصیر،گل خان،میر۔شپ گروک۔بلوچی اکیڈمی۔کراچی۔ 1964

131۔نصیر،گل خان،میر جمل جیہند۔بلوچی پبلیکیشنز۔کراچی 1969

132۔نصیر،گل خان،میر۔گرنند۔ قلات پبلشرز۔مستونگ۔ 1971

133۔نصیر،گل خان،میر۔مشہد نا جنگ نامہ (براہوئی) براہوئی اکیڈمی کوئٹہ 1981

134۔نصیر،گل خان،میر۔پرنگ۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ 1988

135۔ نصیر گل خان نصیر،میرھون ءِ گوانک (لہو کی پکار)۔عوامی ادبی انجمن۔کراچی 1988

136۔نصیر،گل خان،میر ۔گلبانگ۔بلوچ دودءُ ربیدگی ءِ پٹ ءُلوٹی انجمن۔کراچی

1989 (دوئی)

137۔نصیر،گل خان،میر۔ھپت ھیکل۔بلوچ دودءُ ربیدگی ءِ پٹ ءُلوٹی انجمن۔کراچی 1990

138۔نصیر،گل خان،میر۔گلگال۔سید ہاشمی اکیڈمی۔کراچی۔ 1993

139۔نصیر،گل خان،میر۔شنبلاک۔بلوچی اکیڈمی۔کوئٹہ۔ 1996

140۔ہاشمی،سید۔ںچکانیں تسا۔سید ہاشمی اکیڈمی۔کراچی 1985

141۔ہاشمی،سید۔ شکلیں شھبو۔سید ہاشمی اکیڈمی۔کراچی۔ 1988

رسائل وجرائداور روزنامے

بلوچی رسائل وجرائد

1۔ماہنامہ۔اومان۔بلوچی۔کراچی۔	مارچ۔	1959
2۔نوکیں دور۔کوئٹہ	13فروری	1969
3۔اولس(گچین)۔کوئٹہ۔		1978
4۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	اپریل۔	1978
5۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	نومبردسمبر۔	1982
6۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	دسمبر۔	1986
7۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	جنوری۔	1987
8۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	فروری۔	1987
9۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	جون۔	1987
10۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	دسمبر۔	1987
11۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	اپریل۔	1988
12۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	جون۔	1988
13۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	اپریل۔	1989
14۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	دسمبر۔	1989
15۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	دسمبر۔	1991
16۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	اپریل۔	1992
17۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	جولائی۔	1992

18۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	اگست۔	1992
19۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	اکتوبر۔	1994
20۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	دسمبر۔	1994
21۔ماہنامہ۔بلوچی۔کوئٹہ۔	مئی۔	1995
22۔ ماہنامہ۔زمانہ۔کوئٹہ۔	جنوری۔	1981
23۔ماہنامہ۔زمانہ۔کوئٹہ۔	مارچ۔	1981
24۔ماہنامہ۔ زمانہ۔کوئٹہ۔	جون۔	1981
25۔ماہنامہ۔زمانہ۔کوئٹہ۔	ستمبر۔	1981
26۔ماہنامہ۔زمانہ ۔کوئٹہ۔	دسمبر۔	1981
27۔ماہنامہ۔ زمانہ۔کوئٹہ۔	ستمبر۔	1982
28۔ماہنامہ۔ زمانہ۔کوئٹہ۔	اکتوبر۔	1982
29۔ماہنامہ۔ زمانہ۔کوئٹہ۔	نومبر۔دسمبر۔	1982
30۔ماہنامہ۔چاگرد۔کوئٹہ۔	ستمبر۔اکتوبر۔	1989
31۔ماہنامہ۔ چاگرد۔کوئٹہ۔	جنوری۔فروری۔	1990
32۔ماہنامہ۔ تپتان۔کوئٹہ۔	مئی۔جون	1990
33۔ماہنامہ۔ تپتان۔کوئٹہ۔	جولائی،اگست۔	1990
34۔ماہنامہ۔ بہارگاہ۔کوئٹہ۔	مارچ۔	1989
35۔منزل۔کراچی۔	پبلیکیشنز نمبر5۔	
36۔ماہنامہ۔آساپ۔تربت۔	ستمبر،اکتوبر۔	1994
37۔ماہنامہ۔بلوچی زند۔نوشکے۔	دسمبر۔	2000

38۔ماہنامہ۔بلوچی زند۔نوشکے۔	فروری۔	2001
39۔سہ ماہی۔ادبیات۔اسلام آباد۔	(خاص شمارہ)	
مزاحمتی ادب۔بلوچی/براہوئی		
40۔سہ ماہی۔چاگرد۔ناصر آباد۔اکتوبر تا دسمبر۔		2001

اُردو رسائل و جرائد

41۔ ماہنامہ۔ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ اگست۔ 1970
42۔ ماہنامہ۔ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ جولائی۔ 1972
43۔ ماہنامہ۔ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ دسمبر۔ 1984
44۔ ماہنامہ۔ اسلوب۔ کراچی۔ 1980
45۔ ماہنامہ۔ امنگ۔ کراچی۔ فروری۔ 1985
46۔ سر آب (سالانہ مجلّہ شعبہ اُردو۔ جامعہ بلوچستان) کوئٹہ۔ 1987
47۔ سہ ماہی۔ ادبیات۔ اسلام آباد۔ بہار۔ 1992
48۔ سہ ماہی۔ ادبیات۔ اسلام آباد۔ 1996
49۔ سہ ماہی۔ ادبیات۔ اسلام آباد۔ 1997
50۔ ماہنامہ۔ نوکیں دور۔ کوئٹہ۔ فروری۔ 1994
51۔ ماہنامہ۔ نوکیں دور۔ کوئٹہ۔ مارچ۔ 1994
52۔ ماہنامہ۔ نوکیں دور۔ کوئٹہ۔ جولائی۔ 1994
53۔ ماہنامہ۔ سنگت۔ کوئٹہ۔ اکتوبر۔ 1998
54۔ ماہنامہ۔ سنگت۔ کوئٹہ۔ دسمبر۔ 1998
55۔ ماہنامہ۔ سنگت۔ کوئٹہ۔ جنوری۔ 1999
56۔ ماہنامہ۔ سنگت۔ کوئٹہ۔ مارچ۔ 2000

روزنامے

1۔	روزنامہ۔ جنگ۔ کوئٹہ۔	7دسمبر۔ 1983
2۔	روزنامہ۔ جنگ۔ کوئٹہ۔	15اپریل۔ 1984
3۔	بلوچستان ٹائمز (انگلش)۔ کوئٹہ۔	8دسمبر۔ 1983
4۔	روزنامہ۔ زمانہ۔ کوئٹہ۔	8دسمبر۔ 1983
5۔	روزنامہ۔ مشرق۔ کوئٹہ۔	8دسمبر۔ 1983
6۔	روزنامہ۔ مشرق۔ کوئٹہ۔	9دسمبر۔ 1983
7۔	روزنامہ۔ مشرق۔ کوئٹہ۔	14دسمبر۔ 1983
8۔	روزنامہ۔ کوہستان۔ کوئٹہ۔	7دسمبر۔ 1999
9۔	روزنامہ۔ انتخاب۔ حب۔	26اپریل 2000
10۔	روزنامہ۔ انتخاب۔ حب۔	27اپریل 2000
11۔	روزنامہ۔ انتخاب۔ حب۔	24مارچ 2001

غیر مطبوعہ مقالے (بلوچی/اُردو)

1۔ آغا نصیر خان احمد زئی۔ میر گل خان نصیرءِ دوازدھمی سالروچ

2۔ پروفیسر ڈاکٹر فردوس انور قاضی۔ میر گل خان نصیر کی یاد میں

3۔ ڈاکٹر کہور خان بلوچ۔ میر گل خان نصیر بحیثیت سیاستدان

4۔ سیمی نغمانہ طاہر۔ بلوچستان میں ابلاغ عامہ کی تاریخ، ترقی اور نشونما (مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔ 1998)

5۔ عبدالرزاق صابر۔ میر گل خان نصیر بحیثیت مورخ

6۔ عبدالرزاق صابر۔ میر گل خان نصیر بحیثیت نثر نویس۔

7۔ لال بخش رند۔ میر گل خان نصیر کی شاعری۔

احباب کیا کہتے ہیں

گل خان نصیر ایک بہت ہی عظیم اور بلند پایہ کے شاعر تھے۔ میں یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا کہ بلوچی میں کم از کم اس صدی میں اتنے بڑے شاعر نے جنم نہیں لیا اور میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ گل خان کی روح دوبارہ کب اور کن حالات میں بلوچ عوام سے مخاطب ہوگی۔ (میر غوث بخش بزنجو)

•

میں پوری زندگی ان کے ساتھ رہا ہوں اس لئے اور لوگوں کے مقابلہ میں، میں پوری صداقت کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ گل خان نصیر آخری دم تک اپنے مقصد سے نہیں ہٹے۔ (مولوی محمد عمر)

•

یہ بات طے شدہ ہے کہ میر صاحب اپنے عوام، سماج اور دھرتی کے شاعر تھے۔ وہ سماج کو بدلنا چاہتے تھے۔ وہ میر و نواب کیلئے شاعری نہیں کرتے تھے وہ دھرتی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے شاعر تھے۔ (عابد حسن منٹو)

•

گل خان کا نام اور ان کی شاعری لافانی ہے۔ وہ ہمیشہ بلوچ عوام کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ بلاشبہ ان کا نام اور شاعری بلوچستان کا ایک عظیم سرمایہ ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔ (میر عبدالرحمٰن کرد)

•

آپ مجموعہ صفات تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے کن کن اوصاف کی تعریف کروں۔ آپ کے متعلق داد و دہش کے سلسلے میں قدرت نے انتہائی فیاضی سے کام لیا تھا۔ (ملک فیض محمد یوسف زئی)

•

میر گل خان نصیر کی خدمات بے مثال ہیں۔ ان [illegible] ان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے لیکن وہ پرعزم رہے۔ عوام کو جگانے والی شاعری بھی [illegible] تاریخ نویسی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ (محمد [illegible])

•

گل خان نصیر اپنے عہد کے شاعر تھے۔ انھوں نے [illegible] کہنہ روایات کو تخلیقی انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے انھیں ایک [illegible] عطا کی۔ (انور احسن صدیقی)

•

گل خان نصیر ایک انقلابی آدرشی شاعر تھے، وہ اصل معنوں میں عوامی شاعر تھے۔ ان کے فن اور عملی زندگی میں گہرا ربط تھا۔ (نور زمان)

•

میر گل خان نصیر فکری طور پر ابوالقاسم لاہوتی، ناظم حکمت، فیض احمد فیض، پابلو نرودا اور رسول حمزہ کے شانہ بشانہ چل رہے تھے۔ (عبداللہ جان جمالدینی)

بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، بلوچستان